تاریخِ تعلیم

HISTORICAL DEVELOPMENT OF EDUCATION

پروفیسر ظفر حسین خان

طاہر سنز۔ کراچی

تاریخِ تعلیم

Historical Development of Education.

ایم۔ اے۔ ایجوکیشن

(سال اول)

پرچہ سوم (لازمی)

کراچی یونیورسٹی کے جدید نصاب کے مطابق

پروفیسر ظفر حسین خان

پروفیسر آف ایجوکیشن

گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن۔ کراچی

طاہر سنز۔ اردو بازار کراچی

طبع اوّل : ... ... اگست ۱۹۸۹ء
طبع دوئم : ... ... مئی ۱۹۹۲ء
تعداد : ... ... پانچ سو
مطبع : ... ... ثریا پرنٹرز۔ کراچی

باہتمام : ... ... عثمان غنی طاہر
کتابت : ... ... ایس صلاح الدین قریشی الہاشمی

ناشر

طاہر سنز
ناشران و تاجرانِ کتب
۴۵۔اے، اُردو بازار، کراچی
فون: ۲۱۴۴۶۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حرفِ اول

جب ہم اپنے اسلاف کے علمی و ادبی کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ تاریخ اقوامِ عالم میں مشاہیر کے تذکروں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ برصغیر میں تاریخ اور خاص طور سے تاریخ تعلیم پر قومی زبان میں کتابیں برائے نام ہیں جن سے درس و تدریس سے دلچسپی رکھنے والوں کی تشفی اور تسلی ہونا تو درکنار طلبہ کی بنیادی ضروریات تک بھی پوری نہیں ہو سکتی۔ راقم کی ابتدا ہی سے یہ کوشش رہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے طلبہ کی مشکلات اور دشواریوں کو دور کرنے میں ان کی مدد کی جائے۔ اسی مقصد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے طلبہ کے لئے مختلف کتب وہ بھی قومی زبان میں تصنیف کی ہیں۔

تاریخ ہمیں نہ صرف ماضی کے انسانی جد و جہد، فتح و شکست اور کامرانیوں کی کہانیوں سے روشناس کرتی ہے بلکہ حقیقی معنوں میں اقدارِ زندگی کے ترک کرنے اور عین زندگی کے آداب اختیار کرنے کا موقع بھی فراہم کرتی ہے۔ تجربے اور مشاہدے سے یہ ثابت ہے کہ قومی زبان میں تاریخ تعلیم پر کتابوں کی قلت کی وجہ سے ہمارے ملک کے معلمین اور متعلمین میں تعلیم و تعلم کا نہ تو وہ شعور اجاگر ہوتا ہے اور نہ ہی ان کو اپنے منصب اور ملک و قوم سے محبت پیدا ہوتی ہے جیسی کہ غیر ممالک میں پائی جاتی ہے۔ جس کی خاص اور بنیادی وجہ انگریزی کتب کا مجبوراً مطالعہ ہے۔ اگر ہم اپنے نونہالان چمن میں ملک و قوم سے محبت اور اسلامی روح پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ان کو زیادہ سے زیادہ کتب ان کی مادری زبان میں مہیا کریں۔

کراچی یونیورسٹی نے قریباً چھ سال پیشتر کلیہ تعلیم قائم کر کے قابل تحسین کارنامہ انجام دیا تھا۔ لیکن مقامِ افسوس ہے کہ اتنا عرصہ گذرنے کے بعد بھی ابھی تک اردو زبان میں کوئی قابلِ ذکر تصنیف نہیں کی گئی۔

گذشتہ تیس سال سے میرا درس و تدریس سے واسطہ ہے۔ اس عرصہ میں قریباً ایک درجن کتب قومی زبان میں قوم کے سامنے پیش کر چکا ہوں۔ معلمین اور متعلمین کی پریشانیوں کے مدِ نظر

تعلیم کا ارتقائی جائزہ سال اول ایم ۔ اے ایجوکیشن پرچہ سوم پر یہ مختصر تصنیف حاضر ہے جیسا کہ ناظرین بخوبی جانتے ہیں کہ ماسٹر لیول پر کوئی ایک کتاب کسی بھی پرچے پر سیر حاصل بحث سے پر نہیں ہوسکتی۔ آپ خود اندازہ لگایئے کہ ہزاروں سال کی تاریخ اگر رقم کی جائے تو وہ کتنی ضخیم ہوگی، میں نے ابتدا کردی ہے اور پر امید ہوں کہ اہلِ دانش و فکر اس کو پروان چڑھانے کی بھرپور کوشش کریں گے ۔

اس کتاب کی تدوین و تکمیل میں ویسے تو بہت سے لوگوں نے میری مدد کی ہے لیکن ان تمام اصحاب میں انیلہ ظفر اور جناب رفیع اللہ خان شیرازی صاحب کے نام نامی قابلِ ذکر ہیں ۔

آخر میں میں طاہر محمد صاحب اور عثمان طاہر صاحب کا شکریہ ادا کرنا بھی اپنا فرض منصبی سمجھتا ہوں۔ یہ ان لوگوں کی عرق ریزی ہی کا نتیجہ ہے جو یہ تصنیف اتنی جلد منظرِ عام پر آسکی ۔

صاحبانِ علم اور اساتذہ کرام سے گذارش ہے کہ کتاب کی خامیوں اور اغلاط سے مطلع فرمائیں۔ نیز اسے بہتر بنانے کے لئے اپنی تجاویز سے بھی نوازیں تاکہ آئندہ اس کو بہتر سے بہتر بنایا جاسکے ۔ شکریہ

احقر
ظفر حسین خاں
پروفیسر آف ایجوکیشن
گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن
فیڈرل بی ایریا کراچی ۳۸

۱۷ فروری ۱۹۸۹ء
اے ۔ ۱۱۲ ۔ بلاک کیو
تیموریہ ۔ کراچی ۳۳

انتساب

میں اپنی اس کوشش کو

محترم جناب ڈاکٹر منظور احمد صاحب
رئیس کلیہ فنون. جامعہ کراچی کے نام نامی سے معنون
کرتا ہوں جن کی علمی و ادبی خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

ظفر حسین خاں
جمعتہ المبارک
۱۷ فروری ۱۹۸۹ء

باب ۴

باب ۶

اساتذہ
مخصوص تعلیم
اعلیٰ تعلیم
یونیورسٹی آرڈیننس
پیشہ ورانہ کونسلیں
مراکزِ فضیلت
فنی تعلیم
نیشنل پروفیسر شپ
نیشنل ریسرچ فیلوشپ
نجی تعلیمی ادارے
ذہین طلبہ کے لئے ادارے
تعلیم بالغان
کھلی عوامی یونیورسٹی
اساتذہ اور ان کی تربیت
اساتذہ کی تنخواہیں
طلبہ کی فلاح کے کام
نصاب تعلیم کا قومی ادارہ
کتابوں کی تیاری کا قومی ادارہ
جسمانی تعلیم اور کھیل کود
نیشنل سروس کور فوجی تربیت
امتحانات
تعلیمی پالیسی اور نظم و نسق
مالیات

باب ۲۰ ۳۹۲

قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۷۸ء

تعارف
مقاصدِ تعلیم
ابتدائی تعلیم
مساجد کے مدارس
محلہ اسکول
دیہاتی ورک شاپ اسکول
تعلیم نسواں
تعلیم بالغان اور غیر رسمی تعلیم
معذوروں کی تعلیم
شہریوں کی تعلیم
ثانوی تعلیم
سائنس کی تعلیم
فنیاتی اور پیشہ ورانہ تعلیم
تعلیم مدرسہ
اسلامیات اور عربی
اسکول یونی فارم
تعلیم جسمانی کھیل اور سماجی مشاغل
نصاب اور درسی کتب
ذریعہ تعلیم
تعلیم اساتذہ
تشخیص قدر اور امتحان
رہنمائی مشاورت اور تقرر
تعلیمی انتظام اور نگرانی

باب ۱

قدیم یونان

Ancient Greece

تہذیب وثقافت جو مشرقی ممالک میں رونما ہوئی اس کی شعاعیں سب سے پیشتر مغرب میں یونان میں جلوہ گر ہوئیں۔ یونان ایک پہاڑی علاقہ ہے چنانچہ دور عتیق میں وہاں چھوٹی چھوٹی مملکتیں قائم ہوئیں جو city states کے نام سے پکاری جاتی تھیں۔ قبائلی سرداری ترقی کرکے حکمرانی میں تبدیل ہوگئی۔ کچھ عرصہ کے بعد تازہ شاہی حکومت اشرافیہ میں تبدیل ہوگئی جو مقبول عام نہ ہوسکا اس طرح جمہوریت کا دور دورہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ یونان دنیا میں جمہوریت کا بانی مبانی کہلاتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ دورِ قدیم میں یونان کسی ایک قوم یا ملک کا نام نہیں تھا۔ بلکہ یہ چھوٹی چھوٹی مملکتوں کا مجموعہ تھا۔ یہ ریاستیں ہمیشہ ایک دوسرے سے دست وگریبان رہا کرتی تھیں۔ اس کی جغرافیائی اور طبعی حالتوں نے یونانیوں میں ہم آہنگی خیال اور باہمی تعلقات پیدا ہونے نہیں دیئے۔ ہاں اگر کبھی ان کو متحد ہونے کا موقع ملا بھی تو وہ وقتی ہی ثابت ہوا۔ یونان کی شہرت و عظمت دو ریاستوں کی وجہ سے ہے۔ ایتھنز اور اسپارٹا۔ ہم ذیل میں ان دونوں کے نظام تعلیم، مقاصد تعلیم۔ نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم پر علیحدہ علیحدہ روشنی ڈال رہے ہیں تاکہ ناظرین کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

اسپارٹا

SPARTA

گیارہویں صدی قبل مسیح میں ڈورین Dorian قبیلہ نے اسپارٹا کے قدیم باشندوں کو شکست دیکر وہاں پر اپنا اقتدار قائم کیا چونکہ قدیم باشندے اکثریت میں تھے اس لئے ڈورین قبیلے کے لوگوں کو ہمیشہ ان سے خطرہ لاحق رہتا تھا حکمران طبقہ کی تعداد صرف نو ہزار تھی جب کہ محکوم طبقہ تعداد دو لاکھ پچاس ہزار تھی۔ ایسی صورت میں حکمران

طبقہ کے لئے ضروری اور لازمی تھا کہ وہ نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے زندگی گذاریں ورنہ ان کی ذراسی لغزش بھی ان کے لئے تباہی کا باعث ہو سکتی تھی. اس جذبہ نے ان کو مجبور کیا کہ وہ اپنی نسلوں کو اس قسم کی تعلیم و تربیت دیں جس سے وہ اپنی بقا اور حکومت قائم رکھنے میں کامیاب ہو سکیں۔

مقاصدِ تعلیم Aims of Education عام طور سے مقاصد تعلیم مقاصد زندگی پر منحصر ہوا کرتے ہیں. یونان میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں جو ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتی رہتی تھیں. ساتھ ہی ساتھ بیرونی حملوں کا بھی خطرہ رہتا تھا. ان خطرات سے مجبور ہو کر اسپارٹا والوں نے اپنی بقا اور اپنی آئندہ نسلوں کی سلامتی کیلئے تعلیم کا سب سے اہم مقصد جسمانی نشوونما کو قرار دیا کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی نسلیں جو دشمن کے ملک پر قابض ہیں اس کی محکوم بن جائیں. اس مقصد کو مدِ نظر رکھ کر انہوں نے اس زمانے کے سب سے ذہین مدبر لیکرگس Lycurgus کو اس قسم کی تعلیمی اسکیم بنانے کی ذمہ داری سونپی. اس زمانہ میں اسپارٹا کی سماجی اور معاشرتی زندگی بہت ہی سیدھی سادی تھی. عوام قلعہ بند شہروں میں رہتے تھے. حکمراں کا باقاعدہ چناؤ ہوتا تھا جو ہر معاملہ میں عوام کے سامنے جوابدہ ہوتا تھا. اس کی کامیابی کا دارومدار زیادہ تر اس کی طاقت پر ہوتا تھا. یہ اپنے فرائض کے ساتھ ساتھ کوئی دوسرا کام بھی کیا کرتا تھا. وہ عوام سے رابطہ قائم رکھتا تھا. کونسل میں ہر شہری کو اظہارِ خیال اور ووٹ کی آزادی ہوتی تھی. اس لئے تعلیم کا مقصد یہ بھی تھا کہ بچوں میں اس قسم کی استعداد پیدا کرسکے وہ جرأت اور بیباکی سے کام لے سکیں. اس نظریہ کو پروان چڑھانے میں ہومر Homer اور فیونکس Phoenix نے بھی قابلِ تحسین کام انجام دیئے. المختصر اسپارٹا میں تعلیم کے دو ہی مقاصد تھے. بچہ میں تقریر کی صلاحیت پیدا کرنا تاکہ وہ کونسل میں اپنی قابلیت کا سکہ گاڑ کر ایک مقام حاصل کرسکے. دوسرے بچہ کی جسمانی نشوونما کرنا تاکہ وہ جرأت. بہادری. حب الوطنی. ہوشیاری، چالاکی اور فنونِ جنگ کے بارے میں پوری پوری معلومات حاصل کرسکے. ان کا نظریہ تھا کہ فرد مملکت کے لئے ہے مملکت فرد کے لئے نہیں.

اسپارٹا میں تعلیم کی ذمہ داری حکومت پر تھی، وہی ہر قسم کے ادارے کھولتی تھی. اور وہی

نظام تعلیم کا پورے طور سے بندوبست کیا کرتی تھی۔ اسپارٹا میں تعلیم نسواں کے الگ مقاصد نہیں تھے کیونکہ ان کو مردوں کے برابر خیال کیا جاتا تھا۔ مقاصد تعلیم کے سلسلہ میں منرو رقم طراز ہے:۔

The ideal soldier. Underpassed. in Bravery in Whom the individual Was Sunk in the State."

(A Text Book in the History of Eduction.)

Content of Education نصاب تعلیم اور ادوارِ تعلیم & Stages of Education:-

اسپارٹا کا نظم ونسق ایک سینٹ اور اسمبلی مل کر چلایا کرتی تھیں۔ ان کے ممبر تمام آزاد شہری ہوتے تھے۔ چنانچہ حکومت نے تعلیمی معاملات کی ذمہ داری Paedonomos کے کندھوں پر ڈال رکھی تھی جس کو ہم Boytrainer کہہ سکتے ہیں۔ اس کی مدد کے لئے بہت سے ماتحت ہوتے تھے۔ دورِ جدید کی طرح اسپارٹا میں بھی بچہ کی تعلیمی زندگی کو مختلف ادوار میں منقسم کر دیا گیا تھا جن پر ہم مختصراً روشنی ڈال رہے ہیں۔

۱۔ شیر خوارگی: Infancy (1.7) پہلا دور پیدائش سے لیکر سات سال کا ہوتا تھا۔ اہل اسپارٹا میں پیدائش کے فوراً بعد بچہ کا معائنہ ایک طبی بورڈ کیا کرتا تھا۔ یہ بورڈ اس بات کا فیصلہ کرتا تھا کہ بچہ اس قابل ہے کہ اس کو زندہ رہنے دیا جائے یا تلف کر دیا جائے اگر بچہ کمزور رہا اس میں کوئی دوسرا جسمانی نقص ہوتا تھا تو اس کو پیدائش کے فوراً بعد ہی ختم کر دیا جاتا تھا۔ بعض اوقات ان کو ٹیجی ٹس پہاڑ Teygetus سے پھینک دیا جاتا تھا۔ اگر اس کی قسمت اچھی ہوتی تھی اور اس کو کوئی غلام اپنا متبنیٰ کر لیتا تھا۔ تو اس کو وقتی طور پر بخش دیا جاتا تھا۔ اس بچہ کا وقتاً فوقتاً معائنہ کیا جاتا تھا۔ اگر اس میں ترقی کے آثار نمودار ہوتے تھے تو اس کو حکومت اس غلام سے لیکر مادرِ آغوش میں بھیج دیتی تھی کیونکہ پیدائش سے لیکر سات سال تک وہ گھر پر ہی والدین سے تعلیم و تربیت حاصل کرتا تھا۔ اس دور میں اسکو بہادرول کے قصے اور کہانیاں سنائی جاتی تھیں جن کا مقصد بچہ میں بہادری، جرأت، ہمت و استقلال اور حب الوطنی پیدا کرنا ہوتا تھا۔ اس کو تنگ کپڑے نہیں پہنائے جاتے تھے کیونکہ عام خیال یہ تھا کہ ایسا کرنے سے بچہ کی جسمانی نشوونما پر اثر پڑ سکتا ہے۔ بعض اوقات اس کو اندھیرے

میں چھوڑ دیا جاتا تھا تاکہ اس میں خوف وہراس پیدا نہ ہو سکے۔ اس کو ایسے کھیل کھلائے جاتے جن سے اس میں خوبیاں اجاگر ہو سکیں۔ خاندان کی عظمت و شوکت کا دار و مدار بچہ کے کارناموں پر ہوتا تھا۔ اس لئے والدین اس کو مضبوط اور ہیرو بنانے کی کوشش کرتے تھے تاکہ خاندان کو نام و نمود حاصل ہو سکے۔

۲۔ لڑکپن اور دورِ شباب Boyhood & Adolescence (7-16)

اس دور میں بچہ کی نگرانی اور اس کی تعلیم و تربیت مملکت کے ایک آفیسر Paedonomus کے ذمہ ہوتی تھی جس کو ہم Boy Trainer بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس آفیسر کے تحت بہت سے اور آفیسر ہوتے تھے۔ ان کا فرض بچوں کے ہر اعمال کی نگرانی کرنا اور ان کو مناسب ہدایات کرنا ہوتا تھا۔ اس دور میں بچہ کو پبلک بیرکس میں دوسرے بچوں کے ساتھ رہنا پڑتا تھا۔ یہاں پر تمام بچے ساتھ سوتے، کھاتے اور ساتھ ہی رہتے تھے ان تمام بچوں کو ان کی عمر، استعداد، قابلیت اور قوت کے مطابق تین گروہوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔

اس ضمن میں پلوٹارک رقم طراز ہے۔

" of the Boys he who Showed the Best conduct And Most courage was Made captain of the company. The others Kept their Eyes Always Upon, OBeyed His orders And under went Patently whatever Punsshment He inflected, So that their whole Education was An Exercise of Obedience"

Lycurgas XVI.

اس دوران ٹریننگ بچہ کو بہت ہی سخت اور مشکل دور سے دوچار ہونا پڑتا تھا اس کے راستہ میں وہ تمام مشکلات اور رکاوٹیں پیدا کی جاتی تھیں جن سے وہ بہادری، دانشمندی شجاعت، جرأت اور قوانین کا احترام سیکھ سکے۔ تکالیف برداشت کرنے کے لئے اس کو پتھروں پر سلایا جاتا۔ گرمی اور سردی میں بغیر بستر کے کھلے میدان میں سونا پڑتا۔ ننگے پیر پہاڑوں پر چڑھنا۔ دوڑنا۔ بعض اوقات اس کو پہاڑ پر سے نیچے گرا دیا جاتا۔ اس کو جسمانی ورزشیں کرائی

جاتیں. کشتی، مکہ بازی، دوڑنا، کودنا، پھاندنا، نیزہ بازی وغیرہ پر خاص توجہ دی جاتی. اکثر وہ ایک دوسرے کو نوچتے کھسوٹتے، کاٹتے، مارتے، یہ تمام کرتب کھلی فضا میں کئے جاتے تھے. جن میں ہر کس و ناکس حصہ لے سکتا تھا. بعض اوقات کشتیاں بھی ہوتی تھیں جن میں اکثر اموات واقع ہو جاتی تھیں. ان کے علاوہ اس کو پیٹ بھر کر کھانا بھی نہیں دیا جاتا تھا. ناچ گانا بھی ضروری تھا. اس میں بچہ کو مہارت حاصل کرنا ضروری تھا. ان نظموں اور گیتوں کے ذریعہ بچہ میں جذبہ حب الوطنی کو اجاگر کیا جاتا تھا بعض اوقات اس کو زرہ بکتر پہن کر بھی ڈانس کرنا پڑتا تھا. لڑکے اور لڑکیاں قومی یا کسی خاص دن مل جل کر لوک ڈانس کیا کرتے تھے. اس دور کے خاص نصاب تعلیم ہومر (Homer) اور لیکرگس (Lycurgus) کی نظموں اور گیتوں کو ازبر کر لینا تھا. دورک Doric کے قوانین بھی سکھائے جاتے تھے. بچوں کی ذہنی اور اخلاقی تعلیم پر بھی خاص توجہ دی جاتی تھی.

۳. جوانی: Youth (18 - 20) تیسرا دور اٹھارہ سال سے شروع ہو کر بیس سال کی عمر میں ختم ہو جاتا تھا. اس دور میں بچہ کو خالص فوجی تربیت دی جاتی تھی اس دور کو Milleiren کہا جاتا تھا جس کے معنی Budding youth کے ہیں اس دور میں اس کو ہتھیاروں کا استعمال، فنون حرب سے واقفیت، کس طرح سے حملہ کرنا چاہیئے. اور کس طرح روکنا چاہیئے. یہ دور بچہ کی زندگی کا سب سے خطرناک دور مانا جاتا تھا کیونکہ اس کے ہر دس دن کے بعد ایک سخت امتحان دینا پڑتا تھا. اس میں ناکامی بچہ کے لئے باعث شرم ہوتی تھی. اگر وہ اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر پاتا تھا تو اس پر کوڑوں کی بارش بھی ہوا کرتی تھی اس ضمن میں پلوٹارک کہتا ہے کہ بعض اوقات یہ امتحان اتنے سخت ہوتے تھے کہ بچہ کی موت واقع ہو جاتی تھی.

۴. بلوغیت Manhood (20 - 30) بیس سال کی عمر میں بچہ کو خاص فوج میں داخل کر دیا جاتا تھا جو دس سال تک جاری رہتا تھا. اس دور میں اس کو فوجی مورچوں پر رہنا پڑتا تھا. جہاں پر اس کو شکار، تیرنا، قلعہ بنانا. ان کی مرمت کرنا اور دیگر قسم کی فوجی مشقیں کرائی جاتی تھیں. اس دور میں ان تمام اصولوں کو مد نظر رکھا جاتا تھا جو اس کی کامیاب زندگی کے لئے مددگار اور معاون ثابت ہوتے تھے اس دور میں بچہ کو بھی کافی محنت کرنی پڑتی تھی. کیونکہ اس کے بعد اس کو عملی زندگی میں داخل ہونا تھا.

۵۔ **شہریت: Citizenship (30 onwards)** اب وہ مکمل انسان ہو چکا ہے۔ اس لئے اب اس کو فوجی کیمپ سے شہر میں واپس بھیج دیا جاتا تھا اور اس پر فرائض شہریت مسلط کر دیئے جاتے تھے۔ اب وہ اسمبلی کا رکن ہو جاتا تھا۔ اس کو فوراً شادی کے لئے مجبور کیا جاتا تھا لیکن وہ گھریلو زندگی گذارنے سے قاصر تھا۔ البتہ کبھی کبھی چوری چھپے اپنی بیوی سے مل لیا کرتا تھا۔ اب بھی اس کو فوجی کیمپ میں ہی سونا پڑتا تھا۔ جہاں پر اس کو عام لڑکوں کے ساتھ کھانا کھانا پڑتا تھا۔ چھوٹے بچوں کو تعلیم دینا اور ان کی نگرانی کرنا اس کے فرائض میں داخل تھا ہر شخص کو اپنے سے چھوٹوں کی سیرت و اخلاق پر نظر رکھنے کا حق تھا۔ کیونکہ سیرت و کردار کو کافی اہمیت دی جاتی تھی۔ ابھی اس کو فوجی خدمات بھی بدستور انجام دینی پڑتی تھیں۔ ملک کے نظم و نسق میں وہ پوری طرح سے حصہ لیتا تھا۔ اس دور میں زیادہ توجہ عملی تعلیم پر ہی دی جاتی تھی۔

تعلیم نسواں: Eduction of women اسپارٹا میں تعلیم نسواں پر بھی کافی توجہ دی جاتی تھی۔ لڑکے اور لڑکیوں کے نصاب تعلیم میں کوئی خاص فرق نہیں تھا زیادہ تر ان کو تعلیم گھر پر ہی دی جاتی تھی۔ دوڑنے، بھاگنے، کودنے گولہ پھینکنے کے ساتھ ہی ساتھ نیزہ چلانا بھی لڑکیوں کو سکھایا جاتا تھا۔ ناچ اور گانا ان کی زندگی کا خاص حصہ تھا اس لئے ان پر کافی توجہ دی جاتی تھی۔ ان کو خاص طور سے گھریلو معاملات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان کے نصاب تعلیم میں اس مقصد کو اولیت حاصل تھی کہ وہ ان جذبات سے پر ہوں۔ جن کی ان کے بچوں کو ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ ان میں بہادری، شجاعت، جرأت اور حب الوطنی کے جذبات ابھارے جاتے تھے تاکہ وہ ان جذبات کو اپنی اولاد میں منتقل کر سکیں۔

طریقہ تعلیم: Methods of Teaching اسپارٹا میں طریقہ تدریس کا سب سے مقبول طریقہ تقلید تھا یعنی بچہ کے سامنے جو کچھ اس کو درس دینا چاہتے تھے کر کے دکھاتے تھے اور پھر اس کو ویسا ہی کرنے کو کہتے تھے۔ چونکہ ابتدائی دور میں بچہ والدین کے ساتھ رہتا تھا۔ اس لئے وہ اس کو کہانیاں اور قصے سنایا کرتے تھے۔ ان قصے اور کہانیوں کا مقصد اس میں اعلیٰ خوبیاں پیدا کرنا ہوتی تھیں اس دور میں اس کو فوجی بیرک میں رہنا پڑتا تھا۔ اس لئے "Learning By Doing" کو اپنایا جاتا تھا کیونکہ فوجی تربیت میں ہر چیز میں اس کو عملی حصہ لینا پڑتا تھا۔ جیسا کہ اس دور کے نصاب تعلیم سے ظاہر ہے جہاں تک اخلاقی تعلیم کا سوال تھا۔ تو بچہ کسی نہ کسی شہری کے زیر تربیت رہتا تھا۔

بلوٹارک کہتا ہے کہ بعض اوقات ایک بچہ تین تین شہریوں کی نگرانی میں اخلاقی تعلیم حاصل کیا کرتا تھا. کھانے کے بعد یا جب بچہ کہیں بہ جا رہا ہوتا تھا تو اس سے سوالات کئے جاتے تھے. جن کا مقصد اس کو معلومات بہم پہونچانا ہوتا تھا. مثلاً "شہر کا سب سے اچھا آدمی کون ہے"؟ اس میں کون کون سی خوبیاں ہیں؟" اس سے بچہ میں عام معلومات کے علاوہ جذبہ تجسس بھی بیدار ہو جاتا تھا. اس کی قابلیت کی جانچ ان سوالات کے ذریعہ بھی کر لی جاتی تھی بعض اوقات تسلی بخش جواب نہ ملنے پر اس کی گوشمالی بھی کی جاتی تھی.

تعلیمی ادارے زندگی کے ہر شعبے سے متعلق ہوتے تھے ان کی نگرانی اور انتظام کے لئے سرکاری افسر مقرر ہوتے تھے. عام طور سے یہ ادارے دو قسم کے ہوتے تھے. Paeaestra جس کو wrestling ground بھی کہا جاتا تھا اور دوسرے Didascaleum یا جن کو Teaching place بھی کہہ سکتے ہیں. یا الفاظ دیگر Gymasium اور Music Sch ool کے نام سے بھی پکارا جا سکتا ہے ان اداروں کا پورا خرچ مملکت برداشت کرتی تھی، ان میں درس و تدریس کا کام صبح سے شروع ہوتا تھا جو شام تک جاری رہا کرتا تھا.

یہ تھا اسپارٹا کا نظام تعلیم. مقاصد تعلیم، نصاب تعلیم اور طریقہ تدریس. اب ہم اس پر اجمالاً ناقدانہ نظر ڈال رہے ہیں.

تبصرہ : Comments :

اسپارٹا کی تعلیم کے مقاصد بہت محدود تھے وہ تعلیم و تربیت کے ذریعہ بچہ کی یک طرفہ one sided نشوونما پر توجہ دیتے تھے. اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو وہ ایسا کرنے کے لئے مجبور تھے لیکن یہ ضرور ہے کہ اگر وہ چاہتے تو جسمانی نشوونما Physical Development کے ساتھ ساتھ دیگر صلاحیتوں اور استعداد کو بھی پروان چڑھا سکتے تھے. اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے مقصد میں کافی حد تک کامیاب رہے اور اس طرح انہوں نے ایک طاقتور حکومت قائم کر لی لیکن اس قسم کی حکومتیں دیر پا نہیں ہوا کرتیں. اسی وجہ سے اسپارٹا کی حکومت بھی بہت جلد نیست و نابود ہو گئی.

اسپارٹا کے شہریوں کی نظر میں بچہ شطرنج کی مہرے کی طرح تھا. انہوں نے اس بات کی کبھی بھی کوشش نہیں کی کہ انسان ہر حال میں انسان ہی ہوتا ہے. وہ احساسات، جذبات اور خواہشات بھی رکھتا ہے انہوں نے جو اصول و قواعد تشکیل کئے تھے. ان میں کسی قسم کی بھی

تبدیلی ناگزیر تھی۔ تعلیم و تربیت کا دار و مدار خوف سے زیادہ شوق پر ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ یہ نظام تعلیم کچھ وقت تک تو عوام میں مقبول رہا لیکن جلد ہی اس کی بنیادیں گرنی شروع ہو گئیں۔

بقائے زندگی کے لئے صرف جسمانی طاقت ہی کافی نہیں ہوتی بلکہ جسمانی نشو و نما کے ساتھ ساتھ ذہنی، جمالیاتی اور معاشی نشو و نما کا ہونا بھی شرط ہے لیکن اسپارٹا والوں نے اس طرف مطلق توجہ نہیں دی۔ انہوں نے یہ کبھی بھی نہیں سوچا کہ ذہنی قوت ہر حال میں جسمانی طاقت سے برتر ہوتی ہے نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے بچوں میں ذہنی، جمالیاتی اور فنی صلاحیتیں پیدا نہ ہو سکیں اور جب وقت نے ان کو اپنی ان خامیوں سے آگاہ ہونے کا موقع دیا تو انہوں نے حکومت سے باغیانہ روش اختیار کر لی۔

ظلم و تشدد سے کبھی بھی کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ یہ وقتی طور پر تو فائدہ مند ہوتی ہے لیکن دیرپا نہیں ہو سکتی۔ اہل اسپارٹا سختی اور تشدد کو جائز ہی نہیں بلکہ کامیابی کی کنجی تصور کرتے تھے جو ان کی غلطی اور لاعلمی کی دلیل تھی۔ بچہ ہر حال میں بچہ ہوتا ہے ماں باپ کو بھی اولاد سے قدرتی محبت ہوتی ہے اسپارٹا والے ان باتوں کی مطلق پرواہ نہیں کرتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ حکومت سے بددل ہو گئے جس کی وجہ سے اس کا زوال شروع ہو گیا۔

اسپارٹا والوں نے اکثریت کو کبھی بھی حقوق شہریت سے نہیں نوازا۔ ان کے بچوں کو بھی تعلیمی آسانیاں میسر نہیں تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیرونی طور سے وہ لوگ قہراً و جبراً اسپارٹا والوں کے ساتھ رہے لیکن اندرونی طور سے انہوں اس کی مخالفت شروع کر دی اور جیسے ہی ان کو موقع ملا انہوں نے ان کو تحت الثریٰ میں پہونچا کر ہی دم لیا۔

اسپارٹا کے لوگوں کا کوئی فلسفہ حیات نہیں تھا وہ خدا کے قائل بھی نہیں تھے۔ وہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس پر اعتماد رکھتے تھے انہوں نے کبھی بھی لوازمات زندگی کو اپنانے کی کوشش نہیں کی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ فلسفہ، ادب، آرٹ فن، تعمیر، فنِ سنگ تراشی اور دیگر علوم کی طرف مطلق توجہ نہیں دے سکے۔ یک طرفہ زندگی بھلا کب تک چلتی۔ امن و سکون کے زمانہ میں لوگوں کو اس طرف سوچنے کا موقع ملا اور وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ ان کو عملاً آزادی نصیب نہیں ہے۔ صرف چند لوگ

ایسے ہیں جو حکومت کے سیاہ وسفید کے مالک ہیں۔ اس سے وہ حکومت سے بددل ہوگئے اور اپنے واپنی اولاد کے لئے کسی خاص مقام کے متمنی ہونے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مملکت اور شہریوں کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہوگئی اور اس طرح دونوں برباد ہوگئے۔

مندرجہ بالا خامیوں کے ہوتے ہوئے بھی کوئی شخص ان کے کارناموں سے انکار نہیں کرسکتا۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے تعلیم وتربیت کی اہمیت کو محسوس کیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ تعلیم والدین کی ذمہ داری نہیں بلکہ حکومت کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے شہریوں کے لئے اس کا مناسب انتظام کرے۔ انہوں نے مفت تعلیم ہر شہری کے لئے لازمی قرار دی۔ انہوں نے حب الوطنی، بہادری، شجاعت، فوجی معاملات سے واقفیت اور اخلاقی تعلیم پر بھی زور دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کارنامے رہتی دنیا تک بنظر احسن دیکھے جائینگے

ایتھنز : Athens.

اہل ایتھنز کے نظریات تعلیم بھی ابتدا میں اسپارٹا والوں کی طرح ہی تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کے نظریات وافکار میں تبدیلی ہونی شروع ہوئی۔ ان تبدیلیوں کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ ایتھنز کا دور عروج ایرانیوں کی پسپاہی سے شروع ہوتا ہے۔ ان لڑائیوں کے ایتھنز نے Confederacy of Delos کو قائم کرکے پورے یونان پر اپنی برتری کا جھنڈا گاڑ دیا۔ اس کامیابی میں سب سے اہم کردار Pericles نے ادا کیا۔ چنانچہ ایتھنز کی ہی نہیں بلکہ یونان کی تاریخ میں ایک دور Age of Pericles کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس دور میں تعلیم کے ساتھ ساتھ فن تعمیرات، سنگ تراشی، پنٹنگ ادب اور فنون لطیفہ میں بھی کافی ترقی ہوئی۔ ایتھنز کی تعلیم وتربیت کے بارے میں مختصراً تحریر کرتے ہیں۔

مقاصد تعلیم Aims of Education ایتھنز میں خوشحالی کا دور دورہ تھا وہ اسپارٹا کے نظام تعلیم کا حشر دیکھ چکے تھے اس لئے انہوں نے اسپارٹا کے نظام کو تبدیل کرکے ایک خاص نظام کو جنم دیا۔ اس تعلیم کا اولین مقصد بچہ کی شخصیت کی متوازن

"Har Moniaus All Round Deve- یا Development نشو و نما قرار دیا گیا ہے۔
lopment of Personality of child اس تعلیم کے مطابق بچہ کی تمام صلاحیتوں کو بذریعہ
تعلیم اس طرح سے اجاگر کیا جاتا تھا کہ اس کی تمام صلاحیتوں میں توازن برقرار رہے حقیقت
یہ ہے کہ ایتھنز میں بھی مملکت کی خدمت ہر شخص پر فرض تھی لیکن ان کا نظریہ یہ تھا کہ وہ
شخص ملک کی خدمت زیادہ بہتر کر سکتا ہے جو ذہنی، جسمانی اخلاقی اور جمالیاتی خوبیوں
کا مالک ہو۔ اسپارٹا والوں کا مقصد حیات مملکت کی فلاح و بہبود یعنی ملک کے
لئے جینا اور ملک کے لئے مرنا تھا۔ یا بقول ان کے "فرد مملکت کے لئے ہے مملکت فرد
کے لئے نہیں، لیکن ایتھنز والے کہتے تھے کہ مملکت فرد کے لئے ہے چنانچہ اس خیال کو
مدنظر رکھتے ہوئے ایتھنز والوں نے ایک ایسے نظام تعلیم کی تشکیل کی جو جنگ و امن
دونوں کے لئے فرد کو تیار کر سکے تاکہ وہ ہر دور میں اپنی زندگی کو آرام و سکون سے گذار سکے۔

نصاب تعلیم اور ادوار تعلیم Content of Education. & Stages of Education.

ایتھنز میں اسپارٹا کے برعکس تعلیم و تربیت کی مکمل ذمہ داری والدین پر تھی۔ ان
کے اصول و ضوابط اور طریقہ اتنے مشکل اور سخت نہیں تھے جتنے کہ اسپارٹا والوں کے
تھے۔ بچہ کی پیدائش کے بعد ایتھنز میں بھی ایک میڈیکل بورڈ اس کا معائنہ کرتا تھا
اگر بچہ کمزور یا اور کسی جسمانی عارضہ میں مبتلا ہوتا تو باپ کو حق تھا کہ وہ اگر چاہے تو
اس کو تلف کرا دے کیونکہ اس کی اور اس کے خاندان کی عظمت و شوکت کا دار و مدار
بچہ پر ہوتا تھا۔ ایتھنز میں بھی بچہ کی تعلیمی زندگی کو مختلف ادوار میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔

دور اول:۔ شیر خوارگی کا دور :۔ Infancy (1-7) یہ بچہ کی تعلیم کا پہلا
دور ہوتا تھا اس میں وہ گھر پر رہ کر ہی والدین کی نگرانی میں تعلیم و تربیت حاصل کیا کرتا
تھا بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ بچہ کو نرس یا غلام کے سپرد کر دیا جاتا تھا جس کا فرض بچہ
میں اعلیٰ صفات پیدا کرنا ہوتا تھا۔ اس دور میں بچہ کو اخلاقی اور بہادری کے قصہ اور
کہانیاں سنائی جاتی تھیں۔ اس کو ہومر Homer اور ہسائیڈ Hesiod کی نظمیں پڑھائی
جاتی تھیں۔ ان کی تدریس کا مقصد بچہ میں ذہنی نشو و نما کو پروان چڑھانا ہوتا تھا۔ اس
دور میں اس کی جسمانی تربیت بھی دی جاتی تھی کیونکہ Healthy Mind in a

"Healthy Body" اولاد کو زیادہ سے زیادہ ذریعہ تعلیم سے سنوارنا اپنا فرض منصبی خیال کرتے تھے۔ بچہ کو مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے بارے میں بھی معلومات بہم پہونچائی جاتی تھیں۔ اس دور میں لڑکا یا لڑکی کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی تھی دونوں کو ایک ہی قسم کی تعلیم دی جاتی تھی۔

دورِ دوم: لڑکپن Boy Hood (7-16) سات سال کی عمر سے بچہ کی زندگی کا دور دوم شروع ہوتا تھا۔ اب بچہ کو Pedagogue کو ہم Boy Trainer کہہ سکتے ہیں اس کی ماتحتی میں اسکول بھیجا جاتا تھا۔ یہ شخص بچہ کے ساتھ اس کے لوازمات تعلیم کو بھی لیکر جایا کرتا تھا۔ یہ وہ لوگ ہوتے تھے جو ضعیف یا کسی دوسرے کام کے قابل نہیں ہوتے تھے اس شخص کی ذمہ داری تھی کہ وہ بچہ کے اخلاق اور اس کے کردار کی تعمیر و تشکیل میں مددگار ثابت ہو، بچہ اس شخص کے احکام ماننے پر مجبور ہوتا تھا۔ کہ وہ بچہ کے اخلاق اور اس کے کردار کی تعمیر و تشکیل میں مددگار ثابت ہو۔ بچہ اس شخص کے احکام ماننے پر مجبور ہوتا تھا اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس پر کوڑے کی بارش کی جاتی تھی۔ اس دور میں زیادہ تر بچہ کی اخلاقی تعلیم پر توجہ دی جاتی تھی۔

اسپارٹا کے برعکس ایتھنز میں اسکول پرائیویٹ ہوتے تھے البتہ یہ سرکاری نگرانی میں کام کرتے تھے۔ یہ اسکول عموماً مکان کے کمرے میں یا بعض اوقات سرکار ان کو کرائے پر لیکر معلمین کو دیدیتی تھی۔ Sollon اس سلسلہ میں رقم طراز ہے:۔

"Any Falher Whd Failed To Provide His Boy With An Education could Not in His Age claim Support From His son."

یہ بھی والدین کی ہی ذمہ داری تھی کہ وہ اس بات کا فیصلہ کریں کہ ان کا بچہ کتنے وقت تک اسکول میں رہے گا۔ اور وہ کون کون سے مضامین کا درس لے گا اس دور میں ڈرامہ، شاعری، پڑھنا، لکھنا، جمناسٹک، جسمانی ورزشیں وغیرہ خاص مضامین تھے۔ اس دور کی خصوصیت یہ تھی کہ بچہ کے افعال اور خیالات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ علم موسیقی، روحانی اور جمالیاتی ذوق کے لئے ضروری خیال کی جاتی تھی۔

دورِ سوم: دورِ شباب: Adolescence (16 _ 18 Years)

اس دور کو ہم موجودہ زمانہ کی ثانوی تعلیم کہہ سکتے ہیں. عموماً یہ ادارے سرکاری ہوا کرتے تھے جن کو جمنازیہ کے نام سے پکارا جاتا تھا. مدرسوں میں اس دور میں خاص طور سے جسمانی نشوو نما پر توجہ دی جاتی تھی چنانچہ کشتی، تیراکی، شکار، مکہ بازی، پہلوانی وغیرہ خاص مضامین تھے. طلبہ کو اکثر و بیشتر عدالتی کاروائیوں کو دیکھنے کے لئے عدالتوں میں بھی بھیجا جاتا تھا اس دور میں بچہ کی نگرانی Pedagogue ہی کرتا تھا. اب بچہ کونسل میں بھی داخل ہو سکتا تھا. جمنازیم کی ذمہ داری ایک خاص افسر جو Phronists یا Regulator کے نام سے بھی موسوم کیا جا سکتا ہے جس کو ہم محتسب کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس کے ذمہ زیادہ تر بچہ کی اخلاقی تعلیم ہوتی تھی یہ دور بہت ہی مشکل ہوتا تھا. بعض اوقات بچہ کو آزادی ہوتی تھی کہ وہ جہاں چاہے جا سکتا ہے کیونکہ اس طرح وہ ہر قسم کے تجربات سے دو چار ہوگا جس سے اس کی معلومات میں اضافہ ہوگا بعض اوقات اس کے بغیر ہدایات کے باہر بھیجدیا جاتا تھا. تاکہ وہ اپنی عقل سے یا دوسرے لوگوں سے مل کر ان مسائل کا حل تلاش کر سکے جن سے دو چار ہوا ہے. بہر حال اس دور میں اخلاقیات، سماجی، معاشرتی معاملات میں اس کو زیادہ سے زیادہ تعلیم دی جاتی تھی تاکہ وہ ایک مثالی شہری بن سکے.

دورِ چہارم: دورِ جوانی یا بلوغیت Youth (18 - 20 Year)

اٹھارہ سال کی عمر میں بچہ کو ثانوی تعلیم سے چھٹکارا ملتا تھا. اب اس کو تعلیم شہریت کے لئے پیش کیا جاتا تھا اگر وہ کسی شہری کا لڑکا ہوتا تھا، جو جسمانی، ذہنی، اخلاقی اور جمالیاتی اقدار پر پورا اترتا تھا تو اس کا نام بحیثیت شہری درج کر لیا جاتا تھا. اس کے بعد بادشاہ یا حکمراں کے سامنے ایک خاص رسم ادا کی جاتی تھی اور اگر وہ یتیم ہوتا تھا. یعنی اس کے والد کسی لڑائی میں کام آگیا تو اس کو Aglauru کے مندر میں عہد کرنے کے لئے بھیجدیا جاتا تھا. اس طرح وہ حکومت کی ماتحتی میں آجاتا تھا لیکن ابھی اس کو متبدی ہی خیال کیا جاتا تھا اس دور میں اس کو Epaebus یا کیڈٹ کہا جاتا تھا اس دو سال کے دور میں اس کو ایک سال ایتھنز کے قرب و جوار میں بحیثیت سپاہی گذارنا پڑتا تھا. میدان میں سونا. مشکل قسم

کی ورزشیں اور ڈول قلعہ کی رکھ والی اور جنگ کے گر سکھائے جاتے تھے سال کے اختتام پر اس کو ایک امتحان دینا پڑتا تھا اور پھر اس کو کسی فوجی قلعہ پر مامور کر دیا جاتا تھا۔ اس دور میں اس کو فن حرب کی تعلیم عملی دی جاتی تھی۔ سال کے آخر میں پھر ایک امتحان ہوتا تھا جس کو Dokimasia کہتے تھے۔ اور جب اس میں اس کو کامیابی حاصل ہو جاتی تھی تو اس کو مکمل حقوق شہریت عطا کر دیئے جاتے تھے۔

دور پنجم: شہریت: (۲۰ سال سے آگے) Citizenship
(From 20 Year onwards)

حقوق شہریت ملنے کے بعد بھی تعلیم و تربیت جاری رہتی تھی۔ بیس سال کے بعد اس کو لیبرل تعلیم کی طرف توجہ دینی پڑتی تھی۔ ڈرامہ، فن تعمیر، فلسفہ، سنگ تراشی اور فنون لطیفہ پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ اس تعلیم کا مقصد اولیٰ بچہ میں جمالیاتی، ذہنی، اخلاقی تعلیم میں ماہرانہ صلاحیت حاصل کرنی تھی۔ کوشش یہ بھی کی جاتی تھی کہ بچہ کو زیادہ سے زیادہ عملی تعلیم دی جائے تاکہ وہ اس سے آگے زندگی میں فوائد حاصل کر سکے۔

تعلیم نسواں Education of Women ایتھنز میں عورتوں کی تعلیم پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی تھی البتہ ابتدائی تعلیم عورتوں کے لیے لازمی تھی۔ ان کو زیادہ تر گھریلو معاملات کی تعلیم دی جاتی تھی جو زیادہ تر عملی ہوتی تھی۔ ایتھنز والوں کا خیال تھا کہ صرف مرد ہی پبلک لائف میں حصہ لیتے ہیں۔ عورتوں کو صرف گھریلو معاملات تک ہی محدود رہنا چاہیئے کیونکہ ان کو تعلیم کے ذریعہ شوہر پرستی اور بچوں کی دیکھ بھال کی تربیت دی جاتی تھی جو عورت گھریلو معاملات میں دلچسپی نہیں لیتی تھی اس کو بری نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

طریقہ تعلیم: Methods of Education جیسا کہ مندرجہ بالا سطور سے ظاہر ہو گیا ہو گا کہ ایتھنز میں بھی طریقہ ہائے تدریس اسپارٹا والوں کی ہی طرح تھے سب سے اہم اور خاص طریقہ تقلید تھا اس میں اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا تھا کہ زندہ ہستی کو بحیثیت ماڈل مان کر بچہ میں اخلاقی خوبیاں پیدا کی جائیں۔ زیادہ تر تعلیم میں Learning By Doing کے اصول کو ہی اپنایا جاتا تھا۔ ابتدا سے بچہ کو آہستہ آہستہ ترقی کی طرف گامزن کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ کیونکہ ان کو اسپارٹا والوں

کی غلطیوں کا احساس تھا. بچہ کی جسمانی نشوونما کے لئے اس کو ہر قسم کی آسانیاں بہم پہونچائی جاتی تھیں تاکہ وہ ورزش کو عملی طریقہ سے سیکھ سکے. بچہ میں مذاکرہ اور بحث و مباحثہ کے ذریعہ قوت استدلال کو بھی بڑھایا جاتا تھا. تاکہ اس میں خوداعتمادی کے ساتھ ساتھ موقع محل کو سمجھنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو سکے. زیادہ تر کوشش اس بات پر کی جاتی تھی کہ بچہ میں جذبات حب الوطنی پیدا ہوں تاکہ وہ ملک کی خدمت اچھی طرح سے کر سکے. بعض اوقات اس کو قلعوں پر بھیجا جاتا تھا. جہاں پر وہ فن حرب کا مکمل طور سے ورزش لیتا تھا. فلسفہ وغیرہ پر زبانی ہی تعلیم دی جاتی تھی. المختصر یہ ہے کہ ہر وہ طریقہ تعلیم اپنایا جاتا تھا جس سے اس میں جسمانی ذہنی، جمالیاتی، معاشرتی مذہبی جنگی اخلاقی خوبیاں پیدا ہوکر اس کو ایک متوازن شخصیت کا حامل بنا سکیں۔

تبصرہ Comments

خامیاں Weaknesses اگر ہم بنظر غائر ایتھنز کے نظام تعلیم کا مطالعہ کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ ان کا نظام بھی مثالی نہیں تھا. سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ ان لوگوں نے فنی تعلیم پر بہت ہی کم توجہ دی ہر معاشرے کی ترقی کیلئے فنی یا پیشہ وارانہ تعلیم کا ہونا بڑا ضروری ہے اور جس نظام تعلیم میں اس پر مناسب توجہ نہیں دی جاتی اس کو ہم کبھی بھی ترقی یافتہ نظام تعلیم نہیں کہہ سکتے. سوسائٹی کی ترقی اور خوشحالی کا دارومدار تعلیم سے زیادہ اس کے قدرتی وسائل پر ہوتا ہے. ایتھنز کے باشندوں نے کبھی بھی اس طرف توجہ نہیں دی نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ بعد ان کو بھی اسپارٹا کی طرح نیست و نابود ہونا پڑا۔

دوسری خامی یہ تھی کہ وہ مساوات کے قائل نہیں تھے جو طریقہ اسپارٹا میں تھا کہ چند لوگوں کو ہی حقوق شہریت سے نوازا گیا تھا. یہی بات ایتھنز میں بھی تھی شہریوں کی تعداد بہت ہی کم تھی ان کو ہی تعلیم حاصل کرنے کے حقوق حاصل تھے نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرے کا تین چوتھائی حصہ جاہل رہا. اس لئے مملکت کے استحکام اور خوشحالی میں کسی چیز کا بھی اضافہ نہیں ہوا. ساتھ ہی ساتھ ان فرقوں کے ساتھ تعصبانہ برتاؤ کئے جاتے تھے. اس لئے وہ ہمیشہ ہی مملکت کے دشمن رہے جس ملک میں اکثریت دشمنوں کی ہو نتیجہ ظاہر ہے. ایتھنز کے باشندوں نے مردوں کی تعلیم پر زیادہ توجہ دی۔ انہوں نے اس بات

کو نظر انداز کر دیا کہ وہی معاشرہ ترقی کر سکتا ہے جس میں مرد اور عورت دونوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں۔ عورتوں کے لئے انہوں نے صرف ابتدائی تعلیم کو ہی ضروری سمجھا وہ بھی اس طرح کہ وہ گھریلو تعلیم ہی حاصل کر سکیں ساتھ ساتھ اس سے اس بات کے بھی متمنی رہے کہ وہ اپنی اولاد میں زیادہ سے زیادہ خوبیاں اُجاگر کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ زمانہ کے بعد عورتوں میں وہ جذبات ختم ہو گئے جو ابتدا میں موجود تھے جن کے اثرات معاشرہ اور آئندہ نسلوں پر ہوئے۔

اہل ایتھنز نے فرائض سے بھی راہ فرار اختیار کرنے کی کوشش کی نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی بنیاد کمزور ہونا شروع ہو گئی۔ ساتھ ہی ساتھ عقل مند اور تعلیم یافتہ لوگوں نے ہر طرف سے اس پر تنقید کرنا شروع کر دیا۔ ان کو اپنی تعلیمی حالت پر ہی نہیں بلکہ اپنی قوم پر بڑا ناز تھا چنانچہ "Pride Goes Before a Fall" کی مثل صادق آئی۔

خوبیاں: مندرجہ بالا برائیوں کے ہوتے ہوئے بھی اہل ایتھنز نے تعلیمی میدان میں گراں بہا خدمات انجام دیں جن کو کسی طرح بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ان میں سے چند پر مختصراً روشنی ڈالی جاتی ہے۔

اہل ایتھنز نے دنیا کے سامنے پہلی بار تعلیم کا مقصد بچہ کی "ہمہ گیر نشوونما" پیش کیا۔ اس نظریہ کی افادیت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ آج جب کہ دنیا اس قدر ترقی کر چکی ہے لیکن پھر بھی تعلیم کے اس مقصد کو حاصل کرنے سے لوگ قاصر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تعلیم کا اس سے بہتر مقصد ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ بات ضرور ہے کہ اس پر عمل کرنے میں دشواریاں حائل ضرور ہیں۔

اہل ایتھنز کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے سب سے پیشتر دنیا کو ایسے نصاب تعلیم سے آگاہ کیا جس میں تمام مضامین کی تدریس کو مساوی قرار دیا گیا۔ اسپارٹا والوں نے صرف جسمانی نشوونما اور فنون حرب کو ہی مقصد تعلیم سمجھ لیا تھا۔ جو حقیقتاً یک طرفہ اور بہت ہی محدود نظریہ تھا۔ اس کے برعکس ایتھنز والوں نے ایک ایسا نصاب تعلیم پیش کیا جس پر آج بھی دنیا عمل کرنے سے قاصر ہے۔ جہاں تک طریقۂ تدریس کا سوال ہے تو ایتھنز والوں نے Learning By Doing کو تعلیم کی کامیابی کی دلیل کہا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ اس سے بہتر کوئی دوسرا طریقۂ تدریس ہو ہی نہیں سکتا۔ آج بھی تمام ترقی پذیر

ممالک اسی طریقہ تدریس کو اپنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن ان کو بھی وہ کامیابیاں حاصل نہیں ہیں۔ جو اہل ایتھنز کو نصیب تھیں۔

ایتھنز کے باشندوں نے اس پر خاص توجہ دی کہ تعلیم کا مقصد بچوں میں قوت استدلال پیدا کرنا ہے۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ تمام مغربی ممالک میں تعلیم کا یہی نظام موجود ہے جس کو وہ Tutorial System کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس میں ایک طرف تو بچہ کو بحث ومباحثہ کا موقع ملتا ہے دوسری طرف اس کی قوت استدلال میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ فن خطابت سے روشناس ہو جاتا ہے جو جمہوری دور میں بہت اہم اور ضروری ہے۔

ان کے علاوہ ایتھنز والوں نے دنیا کے سامنے نظریہ لبرل تعلیم کو بھی پیش کیا۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ تعلیم کی کامیابی کے لئے اس کو نفسیاتی بنیادوں پر استوار ہونا چاہیئے اور جو کچھ بھی درس دیا جائے اس میں بچہ کی شمولیت یا شراکت کا ہونا ضروری ہے انہوں نے اس نظریہ کو بھی پیش کیا کہ تعلیم کا انتظام حکومت کی نگرانی میں ہونا چاہیئے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی خوبیاں ہو سکتی ہیں لیکن ہم بوجہ طوالت ان کو نظر انداز کر رہے ہیں۔



باب ۲

سقراط، افلاطون، ارسطو

زمانہ کے ساتھ ساتھ ہی یونانیوں کی زندگی میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی گئیں۔ ان تبدیلیوں کے اگرچہ بہت سے اسباب تھے لیکن ہم خاص خاص کا ہی تذکرہ کر رہے ہیں۔

ایرانیوں کی لڑائیوں سے یونانیوں کو ایک خاص تمدن اور ثقافت سے دوچار ہونا پڑا۔ جو ہر حال میں ان سے برتر تھی۔ یونانیوں نے ان کی طرز زندگی، سماجی اور سیاسی، معاشرتی اور ادبی کارناموں کو دیکھا اور ان سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے بھی ایرانیوں کی بہت سی خوبیوں کو اپنا لیا۔ یونان میں بھی نظریہ شہنشاہیت کو جنم دیا گیا۔ جو خاص ایرانی تھا۔ ایرانیوں کے علاوہ ان کو مشرق کے دیگر ممالک سے بھی تعلقات منسلک کرنے پڑے ان لوگوں کے اثرات سے بھی ان کے خیالات میں حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

ان اثرات کا سب سے اہم نتیجہ یہ نکلا کہ انفرادیت پر توجہ دی جانے لگی۔ مذہبی معاملات اور رسم و رواج کو بھی سائنسی اور عملی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی گئی۔ فلسفہ پر خاص طور سے توجہ دی جانے لگی اسی طرح سے ادبی معاملات میں بھی خاطر خواہ تبدیلیاں رونما ہونے لگیں، اب اجتماعی زندگی کے بجائے انفرادی زندگی پر توجہ دی جانے لگی۔

ان فوری تبدیلیوں سے معاشرہ میں انحطاط شروع ہو گیا پرانے اور فرسودہ خیالات کی جگہ نئے نئے خیالات اور نظریات منظر عام پر آنے لگے۔ ہر چیز پر منطقی نظر سے غور کیا جانے لگا۔ Aristophanes کے مطابق بچہ میں عیاری، چالاکی، ہوشیاری اور مکاری وغیرہ پست خیالات پیدا ہونے لگے۔ بیویاں بدمزاج، فضول خرچ اور بیوفا ہو گئیں شوہر بھی اپنے فرائض سے راہ فرار اختیار کرنے لگے اس طرح شہریوں میں بے ایمانی، خودغرضی اور ایسے ہی دوسرے پست خیالات رونما ہونے لگے۔ غلاموں نے آقاؤں سے بغاوت شروع کر دی۔ ان میں سستی اور لاپرواہی بھی بدرجہ اتم آ گئی۔ اس طرح پورا معاشرہ برائیوں

کی آماجگاہ بن گیا جس سے شہری زندگی مفلوج ہونا شروع ہوگئی۔

تعلیم پر بھی ان تبدیلیوں کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اب اس کو بھی انفرادی معیار سے جانچنا شروع کردیا۔ وقت کی تبدیلیوں نے مملکت کو مجبور کیا کہ ایسا نظام تعلیم جاری کیا جائے جس سے انفرادی ترقی ہوسکے۔ سابقہ تعلیم کو تنگ اور غیر فطری قرار دیا گیا۔ تقریر اور مباحثہ پر عبور حاصل کرنے کو اصل تعلیم خیال کیا جانے لگا۔ اور انہیں خوبیوں کو معاشرہ کی ترقی کے لئے ضروری اور لازمی خیال کیا جانے لگا۔

ان تبدیلیوں پر قابو حاصل کرنے کے لئے معلمین کا ایک نیا طبقہ وجود میں آیا جو Sophistae یا Wise Men کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ یونان میں بیرونی ممالک سے آکر آباد ہوئے تھے۔ یہ لوگ کافی سیاحت کرچکے تھے اس لئے ان کے تجربات بہت وسیع تھے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ یونان میں اور خاص طور سے ایتھنز میں تبدیلیوں کی اشد ضرورت ہے انہوں نے دعویٰ کیا کہ ان کا مقصد نوجوانانِ قوم وملت کی قوم اور ملک کی ترقی اور ترویج کے لئے تیار کرنا ہے یہ لوگ تقریباً ہر مضمون پر کلی دسترس رکھتے تھے وہ اپنے شاگردوں کو ہر چیز کو اسباب ودلائل سے جانچنے کی تلقین کرتے تھے۔ ابتدا میں یہ لوگ فیس نہیں لیتے تھے لیکن پھر کچھ عرصہ کے بعد فیس لینا شروع کردی۔ تخمینہ سے پتہ چلتا ہے کہ تین سال کی فیس ۱۰،۰۰۰ ڈرہماس لیتا تھا۔

ان لوگوں کو ان کی قابلیت اور طریقۂ تدریس کی وجہ سے کافی دلعزیزی نصیب ہوئی جس کی وجہ سے شہری ان سے مشکوک ہوگئے، یہ لوگ اعلیٰ کردار کے مالک تھے لیکن جب ان کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا اور یہ ایک پیشہ میں تبدیل ہوگئے تو ان میں کچھ نیم ملا قسم کے لوگ بھی شریک ہوگئے لیکن پھر بھی ان کے کارنامے قابل تحسین وآفرین ہیں یہ سوفسطا اپنے شاگردوں کو نیچرل سائنس، سیاسیات، معاشیات وغیرہ پر بھی تعلیم دیتے تھے ان تمام مضامین میں وہ فن خطابت پر بہت ہی توجہ دیتے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کے طریقۂ تدریس میں بھی خرابیاں آنی شروع ہوگئی جس کے نتیجہ میں گفتار اور خطابت میں صرف لفاظی کو ہی بنیادی حیثیت دیدی گئی۔ ان لوگوں نے اخلاق وسیرت کی تعمیر وتشکیل کو بھی نظرانداز کردیا۔

ان سوفسطوں کی تعلیم سے نوجوانوں میں دکھاوٹ پیدا ہوگئی۔ وہ لوگ اپنے آپ کو میدان میں لانے کے لئے مضطرب تھے کیونکہ اب جھوٹی شان ہی تعلیم کا معیار قرار دیدیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں Aristophanes کے الفاظ کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

"The youths became marrow of chest
And glib of Tongue"

جیسے ہی کوئی سوفسطہ نظر آتا نوجوان اس کو گھیر لیتے تاکہ اس سے کچھ معلومات حاصل کرسکیں۔

جلد ہی ان سوفسطوں نے بھی نوجوانوں میں بے چینی اور ابتری پیدا کردی کیونکہ اب توازن ختم ہوچکا تھا۔ سخت قسم کی ورزش کو ختم کردیا گیا تھا۔ پرانے ادب کو فرسودہ اور لغو سمجھا جانے لگا تھا۔ اور اس کی جگہ Simonides کی شاعری کو فوقیت حاصل ہوگئی تھی۔ دیگر فلسفی جن میں سب سے اہم شخصیت Archilochus کی تھی۔ ان لوگوں کا مقصد صرف اخلاقیات پر بھی توجہ دیتی تھی۔ علم موسیقی کا بھی قدیم نظریہ ختم کردیا گیا۔ اب اس کو صرف خوشی اور سکون حاصل کرنے کے لئے ذریعہ ہی سمجھ لیا گیا تھا قومی اور مذہبی نظموں کو جذباتی اور آسان اور سادہ نظموں سے متبادل کردیا گیا تھا۔

سوفسطہ تحقیق اور جستجو کے قائل تھے اور انفرادیت کی نشو و نما پر بہت زور دیتے تھے چنانچہ ان نظریات کی وجہ سے ثقافت میں بھی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ ان کا رویہ بہت ہی منفی اور انتہا پسندانہ تھا۔ ان کے نزدیک اخلاق اور علم کا بھی کوئی معیار مقرر نہیں تھا۔ زندگی کے مقاصد بھی متعین نہیں تھے۔ Pratagoras پہلا شخص تھا جس نے کہا:۔

"Man is the Meas Ures of All things

المختصر اس طرح سوفسطوں نے افراد کو مملکت کی محکومی سے آزاد کرا کر ایک نئے نظریہ کی تعمیر و تشکیل کی اگرچہ ان کا خیال وقتی تھا جس کی وجہ معاشرتی برائیاں تھیں لیکن ان کے ہوتے ہوئے بھی ان کے نظریات اور افکار نے ایک نئی اور اعلیٰ ثقافت کی طرف پیش قدمی کی۔

مجموعی حیثیت سے یہ سوفسطہ اس بات کے متمنی تھے کہ لوگوں میں اندھی تقلید اور بغیر اسباب و دلائل کے کسی بات کو ماننے کو ختم کیا جائے۔ اور ہر شخص میں جذبہ ذمہ داری پیدا کیا جائے۔

سوفسطوں کے خلاف بھی ایک طبقہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ معاشرہ میں اسی وقت توازن برقرار رہ سکتا ہے جبکہ معاشرہ کو ان خوبیوں سے مزین کیا جائے جو قدیم عہد میں موجود تھیں۔ یہ بھی اپنے خیالات میں انتہا پسند تھے۔ یہ معاشرہ میں کسی قسم کی بھی تبدیلی

کے خلاف تھے۔ یہ تحریک سوفسطوں کے میدان میں آنے سے پیشتر ہی وجود میں آچکی تھی۔ اس ضمن میں سب سے اہم شخصیت Pythagoras کی تھی۔ اس شخص نے توازن برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس نے انفرادیت کے برخلاف سوشلسٹ نظریہ کو پیش کیا۔ اس نے کہا جس طرح انسان مختلف اعضاء کا مجموعہ ہے یہی حال معاشرے کا ہے۔ اس کے لئے اس نے ایک خاص نظام تعلیم بھی پیش کیا۔ اس تعلیم کا مقصد معاشرہ اور افراد میں متوازن رشتہ قائم کرنا تھا۔ اس نے اس چیز کی بھی کوشش کی کہ جمناسٹک، حسیات، موسیقی، حساب جیومیٹری فلکیات اور منطق کے ذریعہ انسان کو ذہنی قوت بہم پہونچائی جائے اس نے آپس میں بہادری محبت کے جذبات کو بھی پروان چڑھانے کی کوشش کی۔ اس نے توہم پرستی، مذہب اور جمالیاتی نظریات کو ملاکر ایک نئے خیال کو جنم دیا جس کا تذکرہ اس نے Magna Graecia میں کیا ہے۔ دوسری شخصیت اس ضمن میں Aeschylus کی تھی جس کو بدرالمیہ Father of Tragedy کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ اس شخص نے بھی اس بات کی بھرپور کوشش کی کہ گذشتہ مذہبی روایات کو اخلاقی نظر سے بیان کیا جائے۔ یہی وجہ اس کی شہرت کی ہے جس طرح سے ایتھنز میں Aristophanes نے مزاحیہ Comedy کے ذریعہ عوام کو خیالات بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسی طرح Xenophen نے بھی انکے سامنے ایک نیا راستہ پیش کیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ عوام کو ہر حال میں حکومت کا فرمانبردار ہونا چاہیئے۔ Escher نے بھی ان سے پیشتر اس طرف توجہ دی تھی کہ ایتھنز کے شہری فنون جنگ مہارت کے ساتھ ساتھ دیگر خوبیوں پر بھی توجہ دیں۔

ان دونوں طبقوں کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو دونوں کو ہی انتہا پسند سمجھتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان لوگوں کی تعداد بھی بڑھنے لگی اس طبقہ کا اعتقاد تھا کہ اس طرح سے نظام قائم کیا جائے کہ ایک طرف تو مملکت کی بقا برقرار رہے اور دوسری طرف فرد کو بھی ہر طرح سے آزادی حاصل ہو، ویسے تو اس میں کافی لوگ گذرے ہیں لیکن سب سے مشہور سقراط افلاطون، اور ارسطو کے نام نامی ہیں۔ ان لوگوں نے کہا کہ یہ درست ہے کہ رسمی اعتقادات اور مراعات جن میں دیوی دیوتاؤں کی پوجا بھی شامل ہے ان کو بالکل ختم کرنا ناممکن ہے اور نقصان دہ ہے بلکہ پرانی اور قدیم رسومات اور سماجی اقدار کو ملحوظ خاطر رکھ کر اس طرح

تبدیل کیا جائے کہ وہ وقت اور موقع کے مطابق فرد کو ڈھال سکیں۔ انہوں نے سوفسطوں پر الزام لگایا کہ ان کا نظریہ منفی اور ناقابل عمل ہے چاہے تو بہ کہ دور قدیم کو یہ نظریہ رکھتے ہوئے ترقی کی جائے کہ متوازن شخصیت کی نشو و نما ہو سکے۔ ہم ان کے نظریات و افکار کو علیحدہ علیحدہ پیش کر رہے ہیں جن کا مطالعہ ہر حال میں سودمند ثابت ہوگا۔

سقراط Socrates (469 - 399 B.c.)

جیسا کہ پیشتر تحریر کیا جا چکا ہے کہ میانہ روی پر اعتقاد رکھنے والوں میں سب سے اہم شخصیت سقراط کی ہے۔ سقراط کے بارے میں تفصیلاً معلومات حاصل نہیں ہوئیں جو کچھ بھی اس کے بارے میں علم ہے وہ صرف اس کے شاگرد رشید افلاطون کی ہی وجہ سے ہے۔ سقراط کا طریقہ معلمی بھی دیگر سوفسطوں کی ہی طرح تھا۔ یہ Pratagoras کے خیالات و افکار سے بہت متاثر تھا اس لئے اس نے بھی اس کے مشہور و معروف قول "فرد حقیقت اور سچائی کی کسوٹی ہے" سے ابتدا کی تھی۔ اس نے اس کے ساتھ ہی ساتھ اس بات پر بھی زور دیا کہ انسان سے وہ فرد واحد مراد نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب مجموعی انسان سے ہے۔ اس نے کہا کہ مجموعہ انسانی کے لئے کچھ خاص چیزوں میں یکسانیت اور ہم آہنگی ہونا ضروری ہے۔ "فرد حقیقت کی کسوٹی ہے"۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جہاں تک علم اور معلومات کا تعلق ہے جو سچائی اور حقیقت کے لئے راہ کی حیثیت رکھتی ہے اس دنیا میں موجود ہے لیکن فرق اتنا ہے کہ ہر شخص اس سچائی اور حقیقت کے بارے میں صحیح علم نہیں رکھ سکتا۔ سوفسط جس کو علم کہتے تھے سقراط کے مطابق وہ صرف رائے Opinion ہے جس کی تشریح وہ اس طرح کرتا ہے کہ ہر انسان میں اتنی اہلیت نہیں ہوتی کہ وہ اس حقیقت کے ہر پہلو سے روشناس ہو سکے بلکہ وہ مشکل سے اس کے ایک ہی پہلو کو سمجھ سکتا ہے اور چونکہ اس کو وہ اپنے خیالات اور ان کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ اس کو ہی صحیح خیال کرتا ہے کیونکہ وہ ان کی اپنی حسیات، جذبات اور ہیجان سے ان کی آزمائش نہیں کر سکتا بلکہ وہ اس کو اپنی استدلال خوبی سے جاننا چاہتا ہے جو زیادہ تر دنیا کے تعلقات اور تجربات پر منحصر ہوتی ہے اس کو وہ رائے کے نام سے پکارتا ہے۔

سقراط کا نظریہ تھا کہ ہر شخص علم حاصل کرنے کی اہلیت رکھتا ہے لیکن اس کو اپنی

خداداد صلاحیتوں کے مطابق ہی کامیابی ہوتی ہے۔ جو ہر شخص میں مختلف ہوتی ہے وہ کہتا ہے کہ فلسفی کا کام یہ ہے کہ ہر کس و ناکس کو اس قابل بنادے کہ وہ اپنی صلاحیتوں اور قابلیت کا اندازہ کر سکے۔ پھر وہ ان کو اس طرح تعلیم و تربیت دیں کہ وہ نیک اور مناسب نتائج اخذ کر سکیں۔ فلسفیوں کا یہ بھی کام ہے کہ وہ ہمیشہ غور و خوض کرتے رہیں تاکہ وہ دوسروں کے پیش کردہ خیالات کا تذکرہ کر سکیں۔ سوفسطوں کی لمبی لمبی تقریریں جو فن خطابت کا بہترین نمونہ ہیں وہ کبھی بھی عوام کے لئے فائدہ مند نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ ہر شخص کے بس کا روگ نہیں ہے کہ وہ ان میں سے حقیقت کا علم حاصل کر سکے۔

مقاصد تعلیم Aims of Education سقراط کے متعلق تعلیم کا مقصد انسان میں نیکیوں اور اچھائی کو اجاگر کرنا ہے۔ بالفاظ دیگر اخلاق اور سیرت کی تعمیر ہے۔ جب افراد کو تعلیم و تربیت دی جائے گی تو اچھائی اور برائی میں تفریق کر سکیں گے اور چونکہ ان میں خیر بالنسبت شر کے زیادہ ہے اس لئے وہ نیک راستہ پر چلنے کی کوشش کریں گے جب ہر شخص نیک اعمال کرے گا تو نتیجہ ظاہر ہے کہ پورا معاشرہ خوبیوں سے بھر پور ہو جائے گا جس میں ہر شخص اپنی زندگی آرام و سکون سے گذارسکے گا وہ یہ بھی کہتا ہے کہ لاعلمی یا جہالت ہی تمام برائیوں کو جڑ ہے اگر معاشرہ سے برائیوں اور خامیوں کو دور کرنا ہے تو ضروری ہے کہ ہر شخص کو زیور تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کیا جائے تعلیم کے ذریعہ "خود کو پہچانو" کے اصول کو مد نظر رکھنا چاہیئے جب ہر شخص خود کو سمجھنے کی کوشش کرے گا تو ظاہر بات ہے کہ اس کا کیریکٹر مثالی بن جائے گا۔ یہ بالکل اسلامی اصول ہے تعلیم کا مقصد یہ بھی ہونا چاہیئے کہ اخلاقی اور ذہنی قوتوں میں توازن برقرار رکھا جا سکے کیونکہ اگر کوئی بھی قوت تجاوز کر جائے گی تو وہ فرد کے لئے اور پھر معاشرے کے لئے نقصان دہ ہو گی۔ سقراط نے دیگر سوفسطوں نے اس خیال کو مسترد کر دیا کہ ہر شخص حقیقت کی کسوٹی ہے بلکہ اس نے ان کے خلاف کہا کہ صرف تعلیم یافتہ لوگ ہی حقیقت کی کسوٹی ہیں کیونکہ وہی حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں جاہل اور ناخواندہ لوگوں میں اتنی اہلیت نہیں ہوتی کہ وہ حقیقت کو سمجھ سکیں البتہ وہ حقیقت کے بارے میں رائے ضرور قائم کر سکتے ہیں جو غلطی پر بھی مبنی ہو سکتی ہے۔

سقراط نے تعلیم کا سب سے اہم مقصد علم اور عمل میں یکسانیت کو بھی قرار دیا۔

بالفاظ دیگر عالم باعمل ہونا ہی تعلیم کا مقصد خاص ہے اس طرح وہ کہتا ہے کہ تعلیم کا مقصد فرد کو اس کے فرائض سے روشناس کرانا ہے اور وہ جب ہی آگاہ ہو سکتا ہے جب کہ وہ اس کا علم رکھتا ہو کیونکہ علم سے آگاہ ہونا مطلب رموز حقیقت سے واقفیت حاصل کرنا ہے اور جب وہ حقیقت سے واقف ہو جائے گا تو وہ ہر ممکن کوشش اس پر عمل کی بھی کرے گا۔ اس طرح فرد اور معاشرہ میں توازن پیدا ہو جائے گا۔ المختصر سقراط تعلیم کے ذریعہ Virtuous Man پیدا کرنا چاہتا تھا۔

نصاب تعلیم اور ادوار تعلیم : Content of Education & Stages of Education

جیسا کہ بیشتر تحریر کیا جا چکا ہے کہ سقراط کی کوئی تحریر موجود نہیں ہے جو کچھ بھی اس کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ اس کے شاگردوں کے ذریعہ۔ انہوں نے اس سلسلہ میں کسی بات کا کبھی تذکرہ نہیں کیا ہے۔ ہماری رائے ناقص یہ ہے کہ سقراط یہاں پر ایتھنز کے مروجہ ہی نصاب تعلیم اور ادوار تعلیم کو مناسب خیال کرتا ہوگا۔ کیونکہ وہ ایتھنز کا باشندہ تھا۔ اگر ان میں اس کو کوئی برائی نظر آتی تو وہ ضرور اس سلسلہ میں بھی کچھ نہ کچھ اظہار کرتا۔

طریقہ تعلیم Method of Education

سوفسطوں کے طریقہ ہائے تدریس میں بہت سی خامیاں آگئی تھیں ان کی طویل تقاریر جو لفاظی سے بھرپور ہوتی تھیں۔ بچہ کو بور کر دیتی تھیں چنانچہ سقراط نے ان کے سوال وجواب کے طریقہ کو کچھ تبدیلیوں کے بعد اپنا کر اسی کے ذریعہ اپنے شاگردوں کو تعلیم وتربیت دینی شروع کی اس نے اس طریقہ کو اس کثرت سے اپنایا کہ لوگ غلطی سے یہ خیال کرنے لگے کہ یہ اسی کا ایجاد کردہ طریقہ ہے حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے اس کو "سقراطی طریقہ تدریس یا طریقہ گفتگو کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے انگریزی میں Dialectic Method, Socratic Method conversational Method. کہتے ہیں۔ اس زمانہ میں سوفسطوں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ بچوں سے ایسے سوالات کرتے تھے جن سے ان کی استعداد اور دلچسپی کا پتہ چل سکے اور پھر ان سوالات کی بنیاد پر ان سے ایسے سوالات کئے جاتے تھے جن کے بارے میں ان کو معلومات نہیں ہوتی تھی۔ یہاں پر وہ ایک خاص طریقہ کو اپناتے تھے جس کو Midwifery یا Maieutic کہتے تھے۔ اس

کے ذریعہ وہ مخاطب کو مجبور کر دیتے تھے کہ وہ اپنی کمی کو محسوس کر سکے چنانچہ سقراط کبھی ایسا ہی کرتا تھا اس کے یہ سوالات کائنات کے ہر علم اور شے کے بارے میں ہوتے تھے۔ اس طریقہ کے ذریعہ سقراط اپنے شاگردوں میں غور و فکر تجسس موقع کی نزاکت اور خود اعتمادی، منطقی استعداد اور دیگر خوبیوں کو اجاگر کر دیتا تھا جس سے اس کا مقصد شاگرد کو بدلتے ہوئے ماحول میں زندگی گزارنا اور نیک راہ پہ گامزن ہو کر حقیقت کی تلاش میں آرام و آسائش سے ترقی کی طرف گامزن ہونا تھا۔

سقراط کے اس طریقہ تدریس کی اہمیت اور افادیت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ جتنے بھی ماہرین تعلیم اور مفکرین تعلیم گذرے ہیں انہوں نے کسی نہ کسی طرح اس طریقہ کو فروغ دیا ہے جس سے اس کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے لیکن ان تمام باتوں کے علاوہ بھی اس طریقہ میں کچھ خامیاں ہیں مثلاً ہر مضمون کو اس کے ذریعہ نہیں سمجھایا جا سکتا۔ ساتھ ہی ساتھ ابتدا میں اس کو نہیں اپنایا جا سکتا اس کیلئے بچہ کی معلومات سابقہ کو کافی ہونا شرط ہے۔

المختصر سقراط کا نام نامی میدان تعلیم میں ایک اہم ستون کی حیثیت رکھتا ہے اس کی ہر دلعزیزی کی وجہ سے اس کی قوم نے اس کو سچائی سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن اس نے زہر پی کر یہ ثابت کر دیا کہ عالم وہی ہے جو با عمل بھی ہو اس مختصر کتابچہ میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ اس پر سیر حاصل بحث کی جا سکے۔

افلاطون : Plato 427-347 B.C.

یونان کے ہی نہیں بلکہ سارے عالم کے عظیم ترین فلسفی اور مفکر افلاطون کے نام سے ہر شخص واقف ہے۔ افلاطون ایک متمول اور اعلیٰ خاندان کا چشم و چراغ تھا اس لئے اس کے نظریات اور مزاج عوام سے مختلف تھے وہ عوام سے ربط و ضبط اور خلط ملط کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن پھر بھی اس کو عوام سے ہمدردی تھی۔ اپنے خاندان کی شان و شوکت اور عظمت کی وجہ سے وہ عوام کو اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کا مالک نہیں سمجھتا تھا۔ اس کے مطابق اعلیٰ ذہنی صفات اعلیٰ طبقے کا ہی حصہ ہیں۔ سقراط کے مبہم

اور غیر واضح نظریات کی افلاطون نے وضاحت ہی نہیں بلکہ تکمیل کرنے کی بھی کوشش کی اور اس طرح اس نے سقراط کے نظریات پر مستحکم اور منضبط معاشرہ کی بنیاد قائم کرنے کی کوشش کی۔

جب حکومت ایتھنز نے سقراط کو سزائے موت دی تو افلاطون بوجہ خوف ملک چھوڑ کر بھاگ گیا۔ کافی عرصے وہ ادھر ادھر مارا مارا پھرا۔ اس دوران میں اس نے مختلف ممالک کے فلسفہ حیات کا مطالعہ کیا۔ اور آخر میں پھر ایتھنز واپس آگیا۔ اس نے فرد اور مملکت کے درمیان متوازن رشتہ قائم کرنے کی کوشش شروع کی جس کا تذکرہ اس نے اپنی شہرۂ آفاق تصانیف جمہوریت اور قانون میں کیا ہے۔ ان تصانیف میں اس نے معاشرہ کی تکمیل و تشکیل کے لئے تعلیم کو بنیاد قرار دیا ہے جس کا تذکرہ ہم اجمالاً کر رہے ہیں۔ شوقین حضرات تفصیلی مطالعہ "چند عظیم مفکرین تعلیم" میں کر سکتے ہیں۔

مقاصد تعلیم Aims of Education : افلاطون کا خیال ہے کہ معاشرہ کو برائیوں سے پاک وصاف کرنے فرد اور معاشرے میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ افراد کو زیور تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کیا جائے تاکہ وہ حقیقت اور سچائی کو پہچان سکیں۔ جب وہ حقیقت سے آشنا ہو جائیں گے تو پھر ان میں اور معاشرے میں تصادم کی گنجائش نہیں رہے گی۔ یہاں تک افلاطون سقراط کا ہمنوا ہے لیکن اسکے آگے چل کر وہ مقاصد تعلیم میں اپنے استاد سے اتفاق نہیں کرتا وہ سقراط کے برعکس کہتا ہے کہ علم حاصل کرنے کی صلاحیت ہر فرد میں نہیں ہوتی بلکہ یہ جوہر تو قدرت نے بعض افراد کو ہی عطا فرمایا ہے ایسی صورت میں معاشرہ اور افراد میں ہم آہنگی اسی وقت ممکن ہے جب کہ ہر فرد کو قدرتی صلاحیتوں کو معلوم کر کے اس کے سپرد وہی کام کئے جائیں جن کیلئے قدرت نے اس کو اس دنیا میں بھیجا ہے۔ کیونکہ یہی وہ طریقہ ہے جس سے وہ خود مطمئن ہو سکتا ہے۔ اور نتیجہ میں فرد معاشرہ کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم ہو سکتے ہیں۔ اس تقسیم کو ہی افلاطون "انصاف" کے نام سے موسوم کرتا ہے بالفاظ دیگر معاشرے اور فرد کے ساتھ انصاف جب ہی کیا جا سکتا ہے جبکہ اسی کو اس کی اہلیت کے مطابق کام سونپ دیا جائے اس سے فرد اور معاشرہ دونوں پر امن رہ کر ترقی کی طرف گامزن ہوں گے فرد اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر خود بھی ترقی کرے گا جس سے معاشرہ بھی ترقی کر سکے گا۔

افلاطون نے اس مثالی نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے دو تجاویز پیش کی ہیں۔ اول، ایسی مملکت کا قیام جہاں ہر فرد کے ساتھ انصاف کیا جائے اور اس کی قدرتی صلاحیتوں کو دریافت کر کے ان کی نشو و نما کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ اور پھر ان صلاحیتوں کے مطابق ان کے فرائض مقرر کئے جائیں تاکہ وہ ان کو بخوبی انجام دے سکے دوسری تجویز یہ ہے کہ تعلیم کے ذریعہ قدرتی صلاحیتوں کو دریافت کر کے ان کی نشو و نما کی جائے۔

افلاطون کہتا ہے کہ فرد ایک منظم جماعتی زندگی یعنی مملکت ہی کے ذریعہ انصاف حاصل کر سکتا ہے چنانچہ اپنی مثالی مملکت میں وہ افراد کے باہمی تعلقات کی بھی وضاحت کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ معاشرہ کی بنیاد مختلف پیشوں پر ہے بالفاظ دیگر اس نے بنی نوع انسان کو صلاحیتوں کے مطابق تین حصوں میں منقسم کیا ہے۔ بنی نوع انسان سے مطلب شہری ہیں کیونکہ ایتھنز میں حقوق صرف شہریوں کو ہی حاصل تھے اول اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کے مالک جن کے ذمہ حکومت، حکومت کی ذمہ داری، معاشرہ کی حفاظت اور ہر کس و ناکس کے ساتھ انصاف کرنا جن کو افلاطون Golden Men کہتا ہے۔ دوسرے درجہ پر وہ لوگ جو جسمانی طاقت کے مالک ہوں اور وہ فوجی خدمات انجام دے سکیں۔ ان لوگوں کا کام پہلے طبقہ کی اطاعت اور معاشرے کو دشمنوں سے محفوظ رکھنا۔ ان کو وہ Silver Men کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

تیسرے نمبر پر وہ لوگ جو زراعت، دستکاری اور تجارت وغیرہ کے ساتھ ہی ساتھ دونوں طبقوں کی خدمت بھی کریں۔ ان کو وہ Iron Men کے نام سے پکارتا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت کر دینی بھی ضروری ہے کہ افلاطون نے بنی نوع انسان کو طبقوں میں تقسیم تو ضرور کیا تھا لیکن اس کی یہ تقسیم قدرتی صلاحیتوں پر مبنی تھی جس کا تعلق پیدائش نسل، یا دولت سے بالکل نہیں تھا۔ المختصر افلاطون کے مطابق مقاصد "To Discover The Talents And Assign Duties Accordingly" تھے۔

دور اول (پیدائش سے ۷ سال) افلاطون نے ایتھنز کی مروجہ تعلیم کو ہی اپنایا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے کہ بچہ کے پیدائش کے بعد سے سات سال کی عمر تک اس کو گھر پر ہی تعلیم دی جائے گی۔ اس دور میں اس کے معلمین اس کے والدین ہی ہوں گے والدین کا فرض ہوگا کہ وہ بچے میں اعلیٰ خوبیاں پیدا کریں اس کے لئے ان کو اخلاقی

کہانیاں بچہ کو سنائی جائیں ساتھ ہی ساتھ اس پر بھی توجہ دینی چاہئیے کہ بچہ کی تندرستی بھی اچھی ہو اس کے واسطے اس کو ورزشیں کرانی چاہیں۔ اور اس قسم کی چیزوں پر توجہ دینی چاہیے جس سے بچہ میں اخلاقی خوبیاں اور بہادری کے جذبات پیدا ہو سکیں۔

دورِ دوم (۷ سال سے ۱۸ سال) سات سال کے بچہ کو مدرسہ بھیجا جاتا تھا جہاں اس کو جسمانی ورزشیں اور موسیقی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جمناسٹک اور موسیقی کی تعلیم اور اس کے مقاصد وہی تھے جو ایتھنز میں اس زمانہ میں رائج تھے۔ اس دور کی تعلیم صحت مند جسم صحت مند دماغ کے اصول پر مشتمل تھی ان کھیلوں اور موسیقی کا مقصد محض تفریح نہیں بلکہ اخلاقی اور جسمانی تربیت پہونچانا تھا۔

تیسرا دور (۱۸ سے ۲۰ سال) ۱۸ سال کی عمر میں ایک خاص آزمائش کی جائے گی اور جو لوگ مزید تعلیم کے قابل نہیں ان کو دستکاری زراعت اور دیگر پیشوں پر لگا دیا جائے گا۔ اور جن میں مزید صلاحیت ہوگی ان کو دو سال کی فوجی تعلیم دی جائے گی۔ اس میں بچہ کو فوجی بیرکس میں رہنا ہوگا اور اس کی تعلیم و تربیت عملی ہوگی۔

چوتھا دور (۲۰ سال سے ۳۰ سال) ایتھنز میں تعلیم صرف ۲۰ سال تک ہی دی جاتی تھی افلاطون نے اس میں مزید اضافہ کیا چنانچہ ۲۰ سال کی عمر میں ایک آزمائش پھر کی جائے گی جو بہت ہی سخت ہوگی۔ یہ آزمائش ذہنی اور جسمانی دونوں مضامین پر مشتمل ہوگی: تاکہ زیادہ سے زیادہ صلاحیتوں کے مالک اس دور میں مناسب تربیت حاصل کر سکیں اس دور میں فلسفہ ریاضی، علم ہندسہ موسیقی، علم نجوم وغیرہ ذہنی تربیت کے لئے پڑھائے جائیں گے جن میں فلسفہ کی تعلیم کی صلاحیت نہیں ہوگی ان کو مجسٹریٹ اور حکومت کے چھوٹے عہدوں پر مامور کر دیا جائے گا۔ جو ذہین اور قابل ہوں گے ان کو مزید تعلیم دی جائے گی۔

پانچواں دور (۳۰ سال سے ۳۵ سال) وہ طلبہ جو خاص صلاحیت اور استعداد کے مالک ہوں گے ان کو مزید پانچ سال تعلیم و تربیت پر صرف کرنے پڑیں گے اس دور میں ان کو صرف فلسفہ کی ہی تعلیم دی جائے گی۔ یہ لوگ فلسفی کہلائیں گے افلاطون کا خیال تھا کہ صرف فلسفی ہی حقیقت اور سچائی کو پہنچاں سکتے ہیں۔ اس لئے وہ حکومت کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کی اہلیت رکھتے ہیں تعلیم و تربیت نے ان میں تمام خوبیوں کو بدرجہ اتم اجاگر کر دیا ہے اس لئے وہ ہر ایک کے ساتھ انصاف کر سکیں گے۔ اس طرح افلاطون کی تصوراتی

مملکت وجود میں آئے گی جس کے سربراہ فلسفی ہوں گے ان کے احکام کی پابندی تمام شہریوں پر فرض ہوگی۔

تعلیم نسواں Education of Women افلاطون نے جمہوریت میں عورتوں کی تعلیم پر بھی اپنے خیالات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو بھی وہی صفات عطا کیں جو مردوں کو البتہ ان کے دائرہ عمل میں اور جنس میں فرق ہے عورتیں معاشرہ میں وہ تمام کام انجام دے سکتی ہیں جو مرد کرتے ہیں۔ اس کے خیال میں مملکت کے نظم ونسق میں عورتوں کے لئے جنسی اعتبار سے کوئی مخصوص خدمت مقرر نہیں کی ہے جو کام مرد کر سکتے ہیں۔ ان کو عورتیں بھی بخوبی انجام دے سکتی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ عورتیں جسمانی طور سے کمزور ہوتی ہیں اس لئے وہ زیادہ محنت کے کام انجام دینے سے قاصر ہیں ورنہ وہ فلسفی، سپاہی اور مزدوروں کے کام بخوبی انجام دے سکتی ہیں ان کو خانگی اور مادری فرائض سے رہائی دینے کے لئے ایک اشتراکی نظام زندگی کی ضرورت ہے جہاں مملکت کے قائم کردہ نرسری میں تمام بچے پرورش پائیں اور عورتیں حسب قابلیت مختلف امور انجام دے سکیں۔

طریقہ تعلیم Methods of Education جیسا کہ بیشتر تحریر کیا جاچکا ہے کہ افلاطون نے زیادہ تر ایتھنز کے مروجہ نظام تعلیم کو ہی اپنانے کی کوشش کی ہے بجز معمولی تبدیلیوں کے چنانچہ اس ضمن میں بھی اس نے ان ہی طریقہ ہائے تدریس کو برقرار رکھا ہے جو ایتھنز میں مروج تھے۔ مثلاً سیکھو اور کرو Learning By Doing ساتھ ہی ساتھ اس نے سقراطی طریقہ تدریس کو بھی کافی اپنانے کی کوشش کی ہے جس میں بچہ کو تعلیم بذریعہ سوال و جواب دی جاتی تھی جس پر ہم سقراط میں کافی بحث کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ طریقہ تقلید اور زبانی طریقہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ بیس سال سے ۳۵ سال تک کی تعلیم کا جو اضافہ کیا ہے اس میں البتہ زیادہ تر زبانی طریقوں کو ہی اپنایا جا سکتا ہے کیونکہ ان ادوار میں بچہ کو منطق، فلسفہ، ریاضی وغیرہ ایسے مضامین کا درس دیا جائے گا جن کو عملی شکل میں پیش کرنا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے جہاں تک تعلیم نسواں کا سوال ہے اس میں بھی وہ عملی تعلیم کا ہی قائل نظر آتا ہے اس نے استخراجی Deductive طریقہ تدریس کی ابتدا کی ہے۔

تبصرہ Comments

افلاطون سب سے پہلا شخص ہے جس کے افکار و خیالات کا ہزاروں سال سے انسانی زندگی پر کسی نہ کسی طرح اثر پڑ رہا ہے اس کے خیالات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ انسان سے بالاتر تھا۔ افسوس ہے کہ یہاں پر ہم اس کے نظریات و افکار پر مدلل بحث کرنے سے قاصر ہیں بہت جلد کمترین کی تصنیف افلاطون اور تعلیم منظر عام پر آنے والی ہے ناظرین اس کا مطالعہ ضرور کریں۔ بہرحال یہاں پر ہم اس کی خامیوں اور خوبیوں کو نہایت اختصار سے پیش کر رہے ہیں۔

افلاطون کے خیالات پر سب سے زیادہ نکتہ چینی اس بات پر کی جاتی ہے کہ اس نے انسان کو مشین سمجھ لیا تھا۔ اس کے مطابق بچہ کی صلاحیت کسی خاص دور تک ہی منحصر ہے جو غلطی پر مبنی ہے انسان کی صلاحیتیں کسی بھی دور میں نمایاں ہو سکتی ہیں۔ اس لئے اگر کوئی بچہ پہلے دور میں کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتا تو افلاطون کے مطابق ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وہ تعلیمی مراعات سے محروم ہو جاتا ہے قابلیت، اہلیت، صلاحیت اور استعداد میں ہر بچہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ کچھ بچوں میں یہ اوصاف جلد اور کچھ میں دیر سے ظاہر ہوتے ہیں۔ بہرحال افلاطون انتہا پسند تھا اس لئے اس نے اس کو اپنایا جو غلطی پر مبنی ہے۔

افلاطون پر دوسرا الزام یہ ہے کہ وہ غلامی کا حامی تھا اور وہ تعلیم و تربیت صرف شہریوں کا حق تصور کرتا ہے۔ افلاطون جیسے شخص سے ایسی امید نہیں کی جا سکتی تھی لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ معاشرے سے ڈرتا ہو کیونکہ وہ سقراط کا حشر دیکھ چکا تھا اس لئے اس نے معاشرے کی طبقے واریت کو پسندیدہ نظر سے دیکھا۔ لیکن یہاں پر اس بات کو بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر معاشرے میں طبقہ واریت کسی نہ کسی شکل میں ضرور ہوتی ہے۔ افلاطون نے اس کو تعلیمی بنیادوں پر قائم کرنے کی کوشش کی جس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

افلاطون فلسفیوں کی اشرافیہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس کے نزدیک فلسفی انسان نہیں بلکہ فرشتہ تھے حالانکہ یہ بات بالکل ہی غلط ہے۔ ہزاروں سال سے تجربات شاہد ہیں کہ انسان ہر حال میں انسان ہے خدا تعالےٰ نے اس کو خواہشات، جذبات، احساسات ہیجانات وغیرہ وغیرہ کے تابع کر دیا ہے آج تک کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ کوئی شخص ان سے

مبرا رہا ہو۔ چاہے وہ کتنا ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو بلکہ پیغمبران اور انبیاء میں بھی یہ جذبات بدرجہ اتم پائے گئے ہیں۔ تو بھلا پھر فلسفی تو کیا چیز ہیں۔؟

افلاطون کی اسکیم کی سب سے بڑی یہ بھی خامی ہے کہ وہ عورتوں کے لئے کسی علیحدہ نصاب تعلیم کا قائل نہیں حالانکہ ہر شخص جانتا اور مانتا ہے کہ عورتوں کا میدان گھر کے اندر ہے ان کو ایسی تعلیم دینی چاہیے جو ان کو اچھی ماں اور اچھی بیوی بنا سکے۔ یہ بات ضرور ہے کہ وہ ذہنی اعتبار سے مردوں سے کم نہیں ہوتی لیکن جنسی اعتبار سے ان کو مردوں کا محکوم ہونا شرط ہے آج جن معاشرہ میں عورت کو آزادی حاصل ہے اگر بغور دیکھا جائے تو عورت کی بے بسی کا پتہ چلتا ہے۔ مغربی ممالک نے عورت کو جس طرح کھلونا بنایا ہے۔ اس کی ذمہ داری افلاطون کے خیالات ہی پر ہے۔ بہرحال کچھ بھی ہو، عورت ہر حال میں عورت ہے جس کو ناقص العقل کہا گیا ہے اس لیئے اس کے لئے نظام تعلیم مختلف ہونا شرط ہے۔

مندرجہ بالا خامیوں کے علاوہ اور بہت سی ہیں۔ لیکن اب ہم افلاطون کی اسکیم کی خوبیوں پر نظر ڈالتے ہیں۔

افلاطون کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ اس نے جو مقاصد تعلیم مقرر کئے ہیں ان سے بہتر مقاصد کا تعین آج تک کوئی بھی نہ کر سکا جیسا کہ گذشتہ تحریر کیا جا چکا ہے کہ افلاطون صرف ایک مفکر تھا۔ اس لیئے اس کے افکار پر اس طرح سے نظر ڈالنی ہے کہ وہ حقیقت پر کہاں تک منحصر ہیں تو بلا مبالغہ کہنا پڑتا ہے کہ اگر اس کے نظریات کو عملی زندگی میں اپنایا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ ایک مضبوط اور متوازن معاشرے کا وجود ہو سکتا ہے حالانکہ یہ بڑا مشکل امر ہے کہ کسی شخص کی صلاحیتوں کا مناسب اندازہ لگایا جا سکے کیونکہ یہ بھی وقت کے ساتھ ہی ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔

افلاطون کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ابتدائی تعلیم سب کے لئے لازمی قرار دی ہے لازمی تعلیم جب ممکن ہے جب کہ ذمہ داری حکومت پر ہو اور یہی وجہ ہے کہ آج تمام ممالک میں تعلیم و تربیت کی ذمہ داری حکومت پر ہے یہ افلاطون کا ہی کارنامہ ہے۔

افلاطون کا یہ بھی کارنامہ ہے کہ اس نے سب سے پیشتر اس بات کا پتہ لگایا کہ ہر شخص میں یہ استعداد نہیں ہوتی کہ وہ علم حاصل کر سکے حقیقت بھی یہی ہے آج بھی جب کہ ہم اتنے ترقی یافتہ ہو چکے ہیں۔ اور نفسیات پر بھی کافی کام کیا جا رہا ہے پھر بھی ہم اس قابل نہیں ہوئے کہ

معاشرے کے تمام افراد کو تعلیم دے سکیں کیونکہ یہ قدرتی استعداد ہے جو بچہ کو ورثہ میں یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی جاتی ہے۔

افلاطون کہتا ہے کہ تصور ہمارے ذہن میں ہے اس طرح حقیقت کو تصور کی مدد سے پہچانا جا سکتا ہے۔ یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ ہم جب تک تصوراتی دنیا میں نہیں جانتے ہم کسی طرح ترقی نہیں کر سکتے یہ بھی افلاطون کا موجودہ زمانہ پر احسان ہے۔

ان کے علاوہ افلاطون پہلا شخص ہے جس نے معاشرہ اور سماجی مسائل کا حل تعلیم کو ہی قرار دیا ہے پھر ساتھ ہی ساتھ وہ کہتا ہے کہ تعلیم کی ذمہ داری مملکت اور والدین دونوں پر ہے اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا تعلیم کے جو مثالی مقاصد افلاطون نے بیان کئے ہیں یہ ضرور ہے کہ وہ مثالی ہیں لیکن پھر بھی کافی حد تک وہ حقیقت پر مبنی ہیں۔ افلاطون اس بات کا بھی قائل تھا کہ تعلیم بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ہونی چاہیے۔ تاکہ معاشرہ کی ترقی میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہو سکے۔ اگر بنظر غائر مطالعہ کریں تو اس کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے ان تمام خوبیوں کے علاوہ افلاطون کی ایک سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس نے انفرادیت کی آزادانہ نشوونما پر توجہ دی ہے جس کے مطابق بچہ کی سیاسی۔ ذہنی، اخلاقی اور جمالیاتی نشوونما ممکن ہے۔ افلاطون ہی وہ شخص ہے جس نے معاشرہ کی تقسیم تعلیمی نقطہ نظر سے کی ہے۔ جب کہ موجودہ زمانہ میں یہ تقسیم پیدائش یا دولت پر کی جاتی ہے۔ اس کے خیالات سے لبرل تعلیم کا نظریہ وجود میں آیا جس نے آگے چل کر بہت مقبولیت حاصل کی۔

افلاطون ایک نئے طریقہ تدریس استخراجی Deductive Method کا بانی و مبانی کی حیثیت سے بھی قابل داد ہے اس طریقہ کی اہمیت و افادیت سے کسی شخص کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔

ارسطاطالیس

Aristotle.

(386-322. B.C)

ارسطاطالیس جو عرف عام میں ارسطو کے نام سے مشہور ہے کسی تعارف کا محتاج نہیں ماہرین اور مفکرین اس کو بابائے سیاسیات کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں کیونکہ وہی پہلا شخص ہے جس نے سیاسیات کو بقاعدہ علم کی شکل میں پیش کیا۔ ارسطو اپنے استاد یعنی افلاطون سے بہت ہی متاثر تھا۔ چنانچہ اس نے بہت سے تصورات و نظریات اپنے استاد ہی کے اختیار کئے ہیں لیکن ان کو اچھوتے اور حقیقت پسندانہ طریقہ سے پیش کیا ہے۔ ارسطو حقیقت پرست مفکر ہے جو جزیات کی تشریح کر کے موضوع کی ہیئت کو واضح کرتا ہے اسی وجہ سے اس نے استقرائی طریقہ کو اپنایا ہے کیونکہ اسکے خیالات جو منظم اور منطقی تھے اس طریقہ کو اپنانا لازمی تھا۔

مقاصد تعلیم Aims of Education ارسطو کا مشہور مقولہ "انسان فطرتاً معاشرتی حیوان ہے" جس کے لئے تعلیم و تربیت بہت ہی ضروری اور لازمی ہے اس لئے اس نے اپنی دو مشہور زمانہ تصانیف "اخلاقیات Ethics اور سیاسیات Politics" میں اس پر تفصیلاً بحث کی ہے وہ کہتا ہے کہ انسانی روح عقل فعالی اور عقل انفعالی کا مجموعہ ہے اس لئے معیاری تعلیم وہ ہے جو جسم اور ان دونوں کی تربیت پر مشتمل ہو۔ ارسطو زندگی کا مقصد مسرت کو قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اس کو حاصل کرنے کا بہترین اور آسان طریقہ فرد اور معاشرہ کی حدود کا تعین کرنا ہے ان حدود کا تعین بذریعہ تعلیم ہی ممکن ہے اس لئے وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ تعلیم اس قسم کی ہونی چاہیئے کہ اس سے اچھے اور برے میں فرق کیا جا سکے۔ ساتھ ہی ساتھ جسمانی اور ذہنی نشو و نما بھی ہو سکے۔ جسمانی تعلیم کے لئے ورزش، مختلف قسم کے کھیل اور فعالی عقل کے لئے سائنس اور فلسفہ انفعالی عقل کے لئے موسیقی ادب اور اخلاق تجویز کئے ہیں تعلیم کا مقصد خوابیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنا ہے مملکت کا بنیادی فریضہ ہے کہ وہ اپنے شہریوں کے لئے ایسی تعلیم کا انتظام کرے جس سے ان کی خوابیدہ

صلاحیتیں بروئے کار آسکیں۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے ہر شہری اپنا مقام اور اہلیت کو پہچان سکتا ہے۔ اگر ایسا ہو جائے گا تو مملکت میں ہر شخص اپنی اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کی کوشش کرے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ مملکت اور افراد میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی اور اس طرح مملکت دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرے گی۔ چنانچہ اس طرح ارسطو نے تعلیم کا مقصد انسان میں عمدہ صفات پیدا کرنا مقرر کیا ہے ابتدا میں بچہ عقل فعالی اور انفعالی میں تفریق کرنے سے قاصر ہے لیکن عمر کے ساتھ ساتھ وہ ان میں تفریق کرنے لگتا ہے۔ اس تفریق کی وجہ سے ابتدا میں بچہ کو کم سے کم مضامین اس کی فطرت کے مطابق پڑھانے چاہئیں۔ اور پھر نفسیات کے مطابق مضامین میں بتدریج اضافہ کرتے رہنا چاہیئے۔ سب سے اہم مقصد تعلیم وہی ہے جس میں بچہ کی نفسیاتی ضروریات اور اس کے ماحول کو مدنظر رکھا جائے۔

نصاب تعلیم اور ادوار تعلیم Content of Education & Stages of Education.

نصاب تعلیم کے متعلق ارسطو کا حقیقت پسندانہ خیال ہے کہ ہر مملکت، معاشرہ اور سماج کی ضروریات مختلف ہوتی ہیں اس لئے مملکت کا فرض ہے کہ وہ اپنی ضروریات کے مطابق نصاب تعلیم مقرر کرے افراد کے مجموعہ کا نام مملکت ہے جس قسم کے افراد ہوں گے اسی قسم کی مملکت اگر افراد اعلیٰ صفات کے مالک ہیں تو مملکت مستحکم اور مضبوط ہوگی۔ افراد میں اعلیٰ اوصاف بذریعہ تعلیم ہی پیدا کئے جا سکتے ہیں اس لئے نصاب تعلیم ایسے مضامین سے ترتیب دیا جائے جس سے افراد میں زیادہ سے زیادہ خوبیاں پیدا ہو سکیں۔

ارسطو بھی افلاطون کی طرح مساوات کا قائل نہیں ہے وہ کہتا ہے کہ تعلیم صرف آزاد شہریوں کا حق ہے آزاد انسان کا پیشہ شہریت ہے ارسطو کہتا ہے کہ ہر دور کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں تعلیم جب ہی فائدہ مند ہو سکتی ہے جب کہ ان خصوصیات کو مدنظر رکھ کر تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

دور اول پیدائش سے ۵ سال :۔ اس دور میں بچہ کے والدین ہی معلمین کے فرائض انجام دیں گے والدین کا فرض اولین ہے کہ بچہ کی فطرت کے مطابق اس کی نشوونما

پر توجہ دیں۔ اس کے لئے ورزش کا انتظام کیا جائے کھیل کھلائے جائیں۔ ایسی سہولتیں مہیا کی جائیں جس سے اس کا جسم زیادہ سے زیادہ مضبوط اور توانا ہو سکے کیونکہ مضبوط اور طاقتور جسم میں ہی مضبوط اور طاقت ور دماغ ہو سکتا ہے ایسی تمام چیزوں سے بچہ کو روکا جائے جس سے اس کے اخلاق پر برا اثر پڑے۔ چنانچہ اس دور میں بچہ کو اخلاقی کہانیاں تاریخی شخصیات کے متعلق المختصر ایسے مضامین کا درس دیا جائے جس نے بچہ کی ذہنی اور جسمانی ترقی ہو سکے۔

دور دوم (۵ سال سے ۷ سال تک): ارسطو کے مطابق اس دور میں بھی بچہ گھر پر ہی رہے گا۔ معلمین والدین ہی رہیں گے۔ البتہ وقتاً فوقتاً سرکاری ملازمین آکر اس کا معائنہ کیا کریں گے۔ تاکہ وہ اس بات کا اندازہ کرسکیں کہ بچہ کی نشوونما فطری اصولوں کے مطابق ہو رہی ہے یا نہیں اگر ان کو کسی قسم کی کوتاہی نظر آئے تو وہ فوراً اس کے دور کرنے کی تدابیر کریں۔ اس دور کی خصوصیت یہ ہوگی کہ بچہ کو زیادہ سے زیادہ ان چیزوں کا مشاہدہ کرایا جائے جن سے اس کو آئندہ دوچار ہونا ہے۔ دوسری خصوصیت اس دور کی یہ ہوگی کہ جسمانی صلاحیتوں کے ساتھ ہی ساتھ ذہنی صلاحیتوں پر بھی توجہ دی جائے۔

دور سوم (۷ سال سے ۱۴ سال) ارسطو اس دور کو سنگ میل کی حیثیت دیتا ہے کیونکہ اب بچہ میں نیک و بد میں تفریق کرنے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہے اس دور میں بچہ کو مدرسہ بھیجا جائے گا اور اساتذہ کا فرض ہوگا کہ وہ بچہ کی نفسیات کے مطابق اس کو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔ ان کو اس کی رجحان طبع کے مطابق مضامین کا درس دیں۔ تدریس کے ساتھ ہی ساتھ اس کی جسمانی نشوونما پر بھی پوری توجہ دی جائے گی۔ اس دور میں علم موسیقی اور ریاضی بھی پڑھائے جائیں گے، علم موسیقی سے اس میں جمالیاتی اور اخلاقی شعور پیدا کیا جائے گا۔ اور ریاضی سے اس کی دماغی صلاحیتیں اجاگر ہوں گی۔ گذشتہ ادوار اور آئندہ ادوار کی کامیابی و کامرانی کا سہرا اسی دور کی تعلیم و تربیت پر ہوگا۔ اس دور میں معلم کو چاہیے کہ وہ طلبہ کے ساتھ نہایت ہمدردانہ اور مشفقانہ برتاؤ کرتے ہوئے ان کی صلاحیتوں کو جلا دے۔ کیونکہ اس دور کی معمولی سی لغزش بھی بچوں کو تباہ و برباد کرسکتی ہے۔

دورِ چہارم (۱۴ سال سے ۲۱ سال)۔ بچہ سن بلوغیت کو پہونچ گیا ہے اب اس کو مکمل شہری بننا ہے مملکت کی فلاح وبہبود انہیں پر مشتمل ہوگی۔ اس لئے اس دور کی تعلیم ایسی ہونی چاہیئے جس سے ذہنی، جسمانی، اوراخلاقی نشو ونما میں یکسانیت برقرار رہے اس دور میں ریاضی، علم ہندسہ، علم نجوم قواعد، ادب، شاعری، فن خطابت، علم السیاسیات، علم الاخلاق وغیرہ پڑھائے جائیں گے تاکہ ذہنی جسمانی اور اخلاقی نشو ونما ہوسکے۔ ساتھ ہی ساتھ اخلاقی نشو ونما بھی مقصود ہے۔ سائنسی فلسفہ، ادب اور نفسیات سے ان کی ذہنی نشو ونما میں مدد ملے گی۔ اس دور کی اہم خصوصیت یہ ہوگی کہ اس میں وہ تمام خوبیاں پیدا ہوسکیں جو ایک مکمل اور اچھے شہری کے لئے ضروری ہیں۔ مملکت کا اولین فرض ہوگا کہ وہ اس دور کی تعلیم کو خود اپنی نگرانی میں دلوانے کا بندوبست کرے کیونکہ یہی لوگ اس دور سے گذرنے کے بعد مملکت کا نظم ونسق سنبھالیں گے اس لئے کوئی بھی پہلو نظر انداز نہیں کیا جاتا چاہیئے اس دور میں بچہ کی ہمہ گیر شخصیت کی نشو ونما کو مقدم رکھا جائے گا۔

دورِ پنجم: ارسطو کہتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو ۲۱ سال کے بعد بھی تعلیم جاری رکھنا پسند کریں گے۔ یہ لوگ محنتی، ذہین اور شوقین ہوں گے مملکت کا فرض ہے کہ ان کے لئے اپنی نگرانی میں تعلیم وتربیت کا انتظام کرے یہ دور خاص طور سے ذہنی تعلیم کے لئے مخصوص ہونا چاہیئے ان کو ایسے مضامین پڑھانے چاہیں جن سے ان کی ذہنی صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ اجاگر ہوسکیں مثلاً علم طبیعیات، حیات، نفسیات، فلسفہ منطق، الٰہیات، مابعد الطبیعیات وغیرہ وغیرہ ان علوم کو پڑھنا سمجھنا سوچنا اور غور کرنا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں ہے کیونکہ یہی وہ علوم ہیں جن کے ذریعہ حقیقت کا علم اور قوانین فطرت دریافت کئے جاسکتے ہیں جو انسانی تعلیم کی معراج ہے۔

تعلیم نسواں *Education of Women*: ارسطو تعلیم نسواں کے خلاف ہے افلاطون کے برعکس اس کا خیال ہے کہ قدرت نے عورتوں کو مردوں سے مختلف پیدا کیا ہے وہ کہتا ہے کہ عورتوں کے فرائض گھر پر ہیں اور بچوں کی دیکھ بھال کرنا ہے وہ مردوں کی طرح بیرونی زندگی سے واسطہ نہیں رکھتی۔ اس لئے ان کو ایسی تربیت دی جائے جس سے وہ اچھی بیویاں اور اچھی مائیں بن سکیں۔ اس کے لئے

ان کو امور خانہ داری کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات بہم پہونچانا چاہیئے وہ کہتا ہے کہ یہ قانون قدرت ہے کہ مرد عورت پر حکمرانی کرے۔ یہ حق اس کو قدرت نے عطا کیا ہے۔ بہر حال ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ عورتوں کے لئے ابتدائی تعلیم کی سفارش کرتا ہے اس کا یہ خیال کہاں تک صحیح اور غلط ہے اس کو ہم نظر انداز کر رہے ہیں۔

طریقہ تعلیم Method of Teaching ارسطو نے بھی ایتھنز کے مروجہ طریقہ ہائے تدریس کو ہی کافی حد تک اپنایا ہے لیکن چونکہ اس نے نئے مضامین کا اضافہ کیا تھا۔ اس لئے اس نے ان کے واسطے استقرائی طریقہ Inductive تدریس کو جنم دیا ہے کیونکہ وہ ہر حال میں اس بات پر زور دیتا تھا کہ بچہ کو جو کچھ بھی درس دیا جائے وہ اس کے مشاہدے اور تجربات پر منحصر ہونا چاہیئے۔ ارسطو کا خیال تھا کہ پہلے جسمانی تعلیم دی جائے اس تعلیم کے دوران اس بات کا خیال رکھا جائے کہ بچہ کا اخلاق بھی بہتر سے بہتر ہو سکے ارسطو پہلا مفکر تعلیم ہے جس نے تعلیم کو نفسیاتی طریقوں پر استوار کرنے کی کوشش کی اس نے خود بھی لاتعداد چیزوں کا مشاہدہ کیا اور ان کے تجربات کر کے کسی خاص نتیجہ پر پہونچنے کی کوشش کی اس کی باریک بین نظر نے جانوروں کی لاشوں کو چیرا، پھاڑا اور ان کے اندرونی اعضاء کے متعلق معلومات کیں اس طرح وہ دنیا کا پہلا سائنسداں ہے جس نے حیاتیات کی بنیاد رکھی اس نے انسانی دماغ اور اس کے افعال پر بھی توجہ دی اس نے اس بات کا دعویٰ کیا کہ انسانی دماغ کی دو صورتیں ہوتی ہیں کسی چیز کو دیکھنا اس پر سوچنا، چنانچہ اس نے کہا کہ ابتداء میں بچہ کی سوچنے سمجھنے کی طاقت بہت محدود ہوتی ہے اس میں نقل کرنے کی قوت زیادہ ہے وہ وہی کرتا ہے جس کو وہ کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ مندرجہ بالا طریقوں کے علاوہ اس نے "کرو اور سیکھو" کے طریقہ کو بھی تعلیم کے لئے ضروری قرار دیا اور پھر اس نے زبانی یاد کرنے پر بھی تھوڑی بہت توجہ دی بہر حال اس نے جو طریقہ ہائے تدریس آج سے ہزاروں سال پیشتر اپنائے تھے آج بھی کوئی شخص ان کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کر سکتا۔

تبصرہ Comments

خامیاں: ارسطو کے نظریات میں کچھ خامیاں بھی ہیں جن کا تذکرہ کیا جاتا ہے

وہ عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کے خلاف ہے چنانچہ وہ افلاطون کے برعکس کہتا ہے کہ قدرت نے عورتوں کو مردوں سے مختلف پیدا کیا ہے اس لئے ان کو اعلیٰ تعلیم دینا بیکار ہے البتہ وہ ابتدائی تعلیم کی سفارش کرتا ہے وہ ان کے نصاب کو بھی مردوں سے مختلف چاہتا ہے کیونکہ اس کے خیال کے مطابق مردوں اور عورتوں کے دائرے کار مختلف ہوتے ہیں. مردوں کی فطرت ہے کہ وہ عورتوں پر حکمرانی کریں کیونکہ یہ حکمرانی قدرت نے ان کو تفویض کی ہے عورتوں کا کام مردوں کی خدمت کرنا بچوں کی پرورش کرنا اور گھر بار کی دیکھ بھال کرنا ہے. اس ضمن میں یہ کہدینا کافی ہے کہ زیادہ لوگ اس سے اتفاق کرتے ہیں جب کہ کچھ اس کے استاد افلاطون سے ہم اس بحث کو بوجہ طوالت نظر انداز کر رہے ہیں ناظرین خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ وہ بھی افلاطون کی طرح غلامی کا حامی ہے. تاریخ شاید ہے کہ یہ صرف دنیاوی تقسیم ہے بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ غلام آقا سے قابل اور ذہین ہوتے ہیں۔ اسلام نے اسی وجہ سے اس کی مخالفت کی ہے چنانچہ اگر ہم تاریخ اسلام کا مطالعہ کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ غلاموں نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں ان کی نظیر نہیں ملتی مثلاً طارق بن زیاد، صلاح الدین ایوبی، بلبن، قطب الدین، ایاز۔ وغیرہ وغیرہ۔ ہندوستان میں تو باقاعدہ خاندان غلامان نے حکمرانی کی ہے جب کہ ارسطو کا خیال ہے کہ غلاموں میں اتنی اہلیت اور ذہانت نہیں ہوتی کہ وہ تعلیم حاصل کر سکیں وہ اپنے نقطہ نگاہ کو واضح کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ دوسروں کی رہبری وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ذہنی اعتبار سے دوسروں سے برتر ہوں اس لئے یہ فطری امر ہے کہ کچھ لوگ غلام ہوں اور کچھ آقا غلاموں کی موجودگی میں ہی آقا بننے کا موقع ملتا ہے یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس کی وجہ سے آقا اور غلام دونوں میں خوبیاں پیدا ہو سکتی ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ غلاموں پر آقاؤں کو مظالم نہیں کرنے چاہیئے۔

خوبیاں: ان خامیوں کے علاوہ اب ہم کچھ خوبیوں کو قلم بند کرتے ہیں۔ ارسطو کہتا ہے کہ انسانی ترقی اور تنزلی کا دارومدار مملکت پر ہے۔ اگر مملکت کمزور ہوگی تو وہاں کے باشندوں کی زندگی وبال ہو جائے گی اگر وہ طاقتور منظم اور مضبوط ہوگی تو باشندے خوشحال اور ترقی یافتہ ہوں گے اس طرح ارسطو نے تعلیم کی ذمہ داری مملکت کے سپرد

کی ہے کیونکہ تعلیم ہی وہ ذریعہ ہے جس سے انسان اور حیوان میں تفریق کی جا سکتی ہے جب شہری تعلیم یافتہ ہوں گے تو وہ اپنے حقوق و فرائض کو سمجھیں گے۔ اور پھر ان کے مطابق کام انجام دیں گے اس طرح مملکت اور شہری دونوں ہی راہ ترقی پر گامزن ہوں گے۔

ارسطو کا کارنامہ ہے کہ اس نے نصاب تعلیم کو بھی ہر ملک معاشرہ اور سماج کے لئے مختلف قرار دیا ہے جو حقیقت پرستانہ نظریہ ہے چنانچہ وہ کہتا ہے کہ نصاب تعلیم کو مقرر کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ وہ ماحول اور ضروریات کے مطابق ہو ساتھ ساتھ تعلیم میں اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ وہ اچھے کردار پیدا کر سکے جب بچہ اچھے کردار کا مالک ہوگا تو وہ مملکت سے زیادہ سے زیادہ تعاون کرے گا جس سے برائیاں دور ہوں گی جو ملک و قوم کے لئے فائدے مند ہوگا۔

ارسطو پہلا شخص ہے جس نے تعلیم و تربیت کی بنیاد نفسیات پر رکھی چنانچہ وہ کہتا ہے کہ مقاصد تعلیم، نصاب تعلیم اور طریقہ تدریس کو بچہ کے نفسیات کے مطابق ترتیب دینا چاہیئے اس پر مملکت کو خاص طور سے توجہ دینی چاہیئے کہ وہ رجحان طبع مقامی ضروریات کے مطابق ہی مضامین کو ترتیب دے اس بات پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا کیونکہ تمام دنیا نے اس کے اس خیال سے اتفاق کیا ہے بلکہ وہ یہی کہتے ہیں کہ یہی وہ طریقہ ہے جس سے ایک صحت مند معاشرے کی تعمیر و تشکیل ہو سکتی ہے۔

ارسطو کے نظریات کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ تعلیم کی بنیاد تحقیق اور مشاہدے پر ہونی چاہیئے اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ تعلیم کا سب سے زریں اصول ہے چنانچہ آج تمام ترقی یافتہ ممالک اس فکر میں ہیں کہ ایسے اصولوں کا پتہ لگایا جائے جس سے طریقہ ہائے تدریس کے ایسے اصولوں کو معلوم کر کے ان کے مطابق تعلیم دی جائے چنانچہ اس سلسلہ میں لاتعداد تحقیقات کی جا رہی ہیں ساتھ ہی ساتھ وہ اس بات کی بھی سفارش کرتا ہے کہ تدریس کا دارومدار مشاہدے اور تحقیقات پر ہونا چاہیئے۔ وہ کہتا ہے کہ ذہنی تعلیم ہر حال میں برتر ہے چنانچہ موجودہ زمانہ میں اس اصول پر تمام ممالک کاربند نظر آتے ہیں اس کا یہ بھی کارنامہ ہے کہ اس نے ایک نئے طریقہ تدریس کو جنم دیا جو استقرائی طریقہ کے نام سے مشہور ہے۔

ارسطو نے سائنس میں اب سے ہزاروں سال پیشتر وہ خیالات پیش کئے جو

مفکرین اور سائنسدان آج پیش کر رہے ہیں۔ اگر مذہبی ٹھیکیدار اپنے تعصب کی وجہ سے ان کو پروان چڑھنے کا موقع دیتے تو آج دنیا کہیں سے کہیں پہونچ جاتی، سائنس میں اس کی تحقیقات کا میدان زیادہ تر حیاتیات ہی رہا اور اسی وجہ سے اس کو پدر حیاتیات کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

المختصر یورپ جو آج دنیا کا رہبر نظر آرہا ہے اس نے ارسطو کے خیالات سے اپنی علمی اور ادبی زندگی میں ہر ممکن فوائد حاصل کئے ہیں۔ عہد قدیم اور عہد وسطیٰ میں افلاطون دنیا کا سب سے عظیم فلسفی اور معلم خیال کیا جاتا تھا لیکن بارہویں صدی کے بعد فکر کے ہر دائرے میں ارسطو کو ہی آخری سند تسلیم کر لیا گیا۔ اس کی باریک بین نظر نے سیاسیات، حیاتیات تعلیم اور نفسیات پر ایسی ضربیں لگائیں جو آج بھی صحیح ثابت ہو رہی ہیں حکومت اور ریاست کے متعلق ارسطو کا شغف اس قدر زیادہ تھا کہ اس نے ریاستوں اور شہروں کے آئین پر کم از کم ۵۸ مقالے لکھے جو اب ناپید ہیں۔ [۱]

یونانی تعلیم اور موجودہ تعلیم

Greek Education And The Modern Education.

ذیل میں ہم یونانی نظریات تعلیم کا دور جدید کی تعلیم سے مختصراً مقابلہ و موازنہ کر رہے ہیں تاکہ ناظرین ان کے افکار و خیالات کی اہمیت سے بخوبی واقف ہو سکیں۔

جمنازیہ The Gymnastic یونانی جمنازیہ کی تعلیم پر بہت ہی زور دیتے تھے کیونکہ وہ اس کی اہمیت اور افادیت سے اچھی طرح واقف تھے حقیقت بھی یہ ہے کہ ترقی و تنزلی کا دارومدار انسان کی ہمت پر منحصر ہوتا ہے انہوں نے موجودہ زمانے کے برخلاف ۹ سال (۷ سال سے ۱۶ سال) اسی تعلیم کے لئے وقف کر دیئے تھے موجودہ زمانہ میں جسمانی تعلیم کا مقصد صرف جسمانی نشوونما کرنا ہی ہے

جب کہ یونانی اس کے ذریعہ بچہ میں ذہنی، جمالیاتی اور اخلاقی نشوونما پر بھی توجہ دیتے تھے اس ضمن میں سب سے اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ قول اور فعل کے تضاد کو بھی دور کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس دور میں وہ بچہ کو حسیات، جذبات، احساسات اور خواہشات پر بھی قابو رکھنا سکھاتے تھے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ دورِ جدید میں کھیل اور اسپورٹس میں صرف چند بچے ہی شامل ہوتے ہیں جب کہ اکثریت ان کو دیکھ کر ہی خوشی اور اطمینان حاصل کرتی ہے جب کہ یونان میں ایسا نہیں تھا۔ وہاں پر سب کو اس میں حصہ لینا پڑتا تھا۔ لڑکیاں تک اس سے مستثنیٰ نہیں تھیں۔ یونان میں جمنازیہ کی تعلیم و تربیت بھی دورِ جدید سے مختلف کی جاتی تھی۔ وہاں پر بچہ کو اس میں ماہرانہ صلاحیت حاصل کرنا شرط تھی۔ جبکہ موجودہ زمانہ میں اس میں کامیابی کو ہی کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔ یونانی کھیل کود اور اسپورٹس پر بھی آج کل سے بہت ہی زیادہ توجہ دیتے تھے۔ اگر ہم یوں کہیں کہ اس زمانہ میں تعلیم کے نصاب دو تھے جن میں ایک کا تعلق جسمانی نشوونما اور دوسرے کا تعلق ذہنی، جمالیاتی اور اخلاقی نشوونما سے تھا تو مبالغہ نہ ہوگا بچہ کو ان دونوں میں کامیابی حاصل کرنا شرط تھی اسی طرح سے اسکول بھی دو حصوں میں منقسم ہوتا تھا۔ ایک کو جمنازیم اور دوسرے کو میوزک اسکول کہتے تھے۔ بچہ کو مکہ بازی، تیرنا، کشتی لڑنا وغیرہ کی بھی ماہرانہ تعلیم دی جاتی تھی۔ جب کہ دورِ جدید میں ایسا نہیں ہے۔

میوزک : Music دورِ جدید میں علم موسیقی کو ہم بہت ہی محدود معنی میں استعمال کرتے ہیں جب کہ یونان میں اس کا مفہوم بہت ہی وسیع تھا۔ اس میں وہ تمام مضامین شامل تھے جن کا تعلق روحانی، جمالیاتی اور اخلاقی زندگیوں سے ہو۔ مثلاً شاعری، تاریخ، ڈرامہ نویسی، فن خطابت اور سائنس وغیرہ۔ ابتدائی دور میں اگرچہ اس کی وسعت صرف ہومر Homer کی نظموں کو ازبر کرنا ہی تھا لیکن وقت کے ساتھ ہی ساتھ اس میں اضافہ ہو گیا تھا اور اس طرح مندرجہ بالا مضامین شامل کر لئے گئے تھے۔ ان کے علاوہ الفاظ و معانی کی تشریح اور پس پردہ خیالات کی وضاحت بھی شامل تھی منظر نگاری، تصوری اور وہ خیالات جو بچہ کی سمجھ سے بالاتر ہوتے تھے انکی وضاحت بھی شامل تھی اس میں بچہ کو زبان اور اس کی صوتی اشکال کے بارے میں بھی علم بہم پہونچایا

جاتا تھا البتہ ابھی بچہ کی فنی مہارت پر خاص توجہ نہیں دی جاتی تھی کیونکہ اس کو ابتدائی دور خیال کیا جاتا تھا ان تمام مضامین کو شامل کرنے کا مقصد بچہ کی متوازن شخصیت کی تعمیر و تشکیل تھا ساتھ ہی ساتھ اس میں پاکیزہ خیالات بھی اجاگر کئے جاتے تھے۔ تاکہ وہ اپنی روحانی زندگی بھی سنوار سکے جب کہ موجودہ زمانے میں علم موسیقی کو صرف خوشی اور وقت گذاری کا ذریعہ ہی سمجھ لیا گیا ہے۔

ادبی پہلو Literary Aspects جہاں تک ادبی زندگی کا سوال ہے تو یونانیوں نے طرز تحریر کو چھ سو قبل مسیح میں معلوم کر لیا تھا۔ اس سے بیشتر ہومر کی Illiad & odyssey کو ہی ازبر کر لیا جاتا تھا اسی سے ان کو مذہبی اور اخلاقی راہنمائی بھی حاصل ہوتی تھی کیونکہ ان کے یہاں کوئی بھی مذہبی کتاب نہیں تھی۔ انہیں تصانیف سے وہ صرف و نحو کے بارے میں بھی علم حاصل کرتے تھے۔ کیوں کہ ابھی تک اعراب کا وجود نہیں تھا ریاضی اور اس کی دوسری شاخیں بھی ابتدائی منزل طے کر رہی تھیں۔

رقص Dancing: دور جدید میں ہم ڈانس کو بھی بہت ہی محدود معنی میں استعمال کرتے ہیں جب کہ یونان میں ایسا نہیں تھا۔ ان کے مطابق رقص کا خاص مقصد بچہ میں صوتی اثرات کے مطابق عمل کرنا تھا۔ بچہ آواز کے مطابق اپنی جسمانی حرکات کرتا تھا۔ ان آوازوں میں ایک خاص قسم کا توازن رکھا جاتا تھا۔ تاکہ بچہ کا ہر حصہ اس کے مطابق عمل پیرا ہو کر اپنی جسمانی نشوونما کر سکے۔ یونان میں رقص و سرور کا دوسرا مقصد مذہبی تھا۔ فنون حرب میں ماہرانہ صلاحیتیں پیدا کرانا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ ان مقاصد کے تحت ان ناچوں کو اس طرح مرتب کیا جاتا تھا جس سے یہ مقاصد پورے ہو سکیں بعض اوقات شہر کے تمام بچے جو زیر تعلیم ہوتے تھے ان کو جلوس کی شکل میں شہر میں گشت کرایا جاتا تھا۔ جو ڈھول یا باجے کی مخصوص تھاپ پر اپنے جسمانی کرتب پیش کرتے تھے بعض وقت فوجی ڈرل بھی اس طرح کرائی جاتی تھیں۔ ان میں ایک خاص چیز یہ بھی تھی کہ موجودہ نظریہ کے خلاف وہ لوگ بچہ میں خیالات، جذبات، احساسات اور حسیات کی تربیت بھی رقص کے ذریعہ دیا کرتے تھے اس سے ان کا مقصد تفریح حاصل کرنا بالکل نہیں تھا۔

تعلیم کا اخلاقی مقصد : The Moral Purpose of Education

یونانیوں کے نصاب تعلیم کو دیکھ کر اخلاقی مقاصد کا آسانی سے پتہ لگایا جاسکتا ہے جمناسٹک اور میوزک دونوں اقسام کے مضامین کی تدریس کا مقصد بچہ میں اخلاقی خوبیاں پیدا کرنا تھا۔ مثلاً غصہ پر قابو حاصل کرنا، تحمل، بردباری، محنت، صبر و استقلال، جذبہ حب الوطنی اور شجاعت وغیرہ ان دونوں نصابوں کے ذریعہ بچہ کی شخصیت میں توازن پیدا کیا جاتا تھا اخلاقی تعلیم بھی بچہ کو عملاً ہی دی جاتی تھی۔ اس کے سامنے کوئی ماڈل پیش کر کے اس کو ہدایت کی جاتی تھی کہ اس کی خوبیاں وہ پیدا کرے مذہب پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی تھی۔

تعلیم کے عام مقاصد : General Aims of Education

اس ضمن میں یونانیوں نے دور جدید سے بالکل ہی مختلف نظریات پیش کئے ہیں جن میں سے خاص خاص حسب ذیل ہیں۔

سیاسی مقاصد : Political Aims: اہل یونان نے اس بات پر غور کیا کہ فرد کی سیاسی آزادی کو کس طرح برقرار رکھا جاسکتا ہے اس سلسلہ میں ان کا نظریہ تھا کہ فرد آزاد ہونے کے ساتھ ہی ساتھ حکومت کا پابند بھی رہے۔ چنانچہ اس کے لئے انہوں نے جمہوری نظام کو اپنایا کیونکہ اس میں دونوں خوبیاں موجود ہیں اسپارٹا میں بادشاہ تک بھی قانون کے ماتحت تھا ایتھنز میں جمہوریت کے ذریعہ فرد اور معاشرے میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی انہوں نے موجودہ دور کو عوامی فلاح و بہبود وفاداری، شہری کے حقوق و فرائض سے روشناس کیا اہل یونان نے نظام تعلیم اس طرح وضع کیا کہ اس نے فرد کی سیاسی آزادی کو قائم رکھنے میں معاونت کی۔ جو اہل یونان کا سب سے عظیم کارنامہ ہے۔

ذہنی مقاصد Intellectual Aims اہل یونان نے دنیا میں سب سے بیشتر فرد کو فکر کی مکمل آزادی سے نوازا۔ چنانچہ علم برائے علم Knowledge for the Knowledge sake کا نظریہ سب سے پہلے یونان میں ہی ملتا ہے۔ سب سے پہلے حقیقت کی تلاش یونان میں ہی شروع کی گئی۔ وہ ہر چیز کی تحقیق کرتے تھے علم پر مذہبی پیشواؤں کی اجارہ داری نہیں تھی تجسس، اہل یونان کا رہبر تھا۔ یونانیوں سے پیشتہ

اور ان کے بعد ہمیشہ ہی تعلیم پر مذہب کا قبضہ رہا ہے لیکن یونان میں ایسا نہیں تھا جن لوگوں کو تعلیم کا شوق تھا وہ اس کے علم بردار بن گئے۔ انہوں نے عقل، مشاہدے اور تحقیق کو اپنا فرمانروا مان لیا۔ سقراط کا مقولہ "KNOW THYSELF" خود کو پہچانو کسی تشریح کا محتاج نہیں ہے ہر شخص اپنی زندگی کا مقصد مقرر کرنے کا اہل تھا علوم زندگی کا مقصد حاصل کرنے کا ذریعہ تھے۔

جمالیاتی مقاصد Aesthetic Aims اس ضمن میں اہل یونان بے مثال تھے انہوں نے تصوراتی حسن وحقیقت کو مادیت کا جامہ پہنایا۔ آرٹ کو حقیقت کی جلوہ نمائی کا ذریعہ قرار دیا۔ انہوں نے آرٹ میں کمال حاصل کیا وہ حسن کو مجسمہ سازی، نقاشی، موسیقی اور شاعری کے ذریعہ تصورات کی دنیا سے احساسات کی دنیا میں لائے جس کے لئے وہ قابل مبارک باد ہیں۔

طریقہ ہائے تدریس Methods اس ضمن میں بھی یونانی موجودہ زمانہ سے بہتر تھے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس زمانہ میں نصاب تعلیم بہت ہی محدود تھا وہ مذہبی و اخلاقی تعلیم بھی عملی دیتے تھے۔ وہ زندہ ماڈل کو پیش کرکے بچے میں اخلاقی اور مذہبی خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا سب سے اہم طریقہ کرو اور سیکھو Learnin By Doing تھا وہ بچہ کی عادات و اطوار کی تشکیل پر بہت زور دیتے تھے جس کے لئے وہ وہی طریقہ ہائے تدریس اپناتے تھے جن سے وہ اپنے مقاصد میں کامیابی سے ہمکنار ہو سکیں۔ انہوں نے سقراطی طریقہ Socratic یا Dialec- Tic Method طریقۂ تدریس اور استخراجی (Deductive Method) اور Indu- ctive Method استقرائی طریقہ ہائے تدریس کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ جن کی افادیت اور اہمیت سے آج بھی انکار نہیں کیا جا سکتا اور موجودہ زمانے میں ہم ان کے ہی طریقوں کو اپنا رہے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان میں کچھ اصلاح کر لی گئی ہے۔

ادارے The Institutions یونانیوں نے اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے نئے نئے اداروں کو جنم دیا کیونکہ ان کو احساس تھا کہ ایک نئے قسم کی ثقافت ابھر رہی ہے جن کو Rhetoric Dialectic & Philosophical Schools کہہ سکتے ہیں۔ انہوں نے یونیورسٹیاں بھی قائم کیں جن میں افلاطون اور ارسطو

اداروں میں Isocrates, Zeno کی اکاڈمینر قابل بیان ہیں Epecurious کے قابل تحریر ہیں اور انہیں وجوہات سے یونان تہذیب وثقافت کا گہوارہ بن گیا جو آج تک دنیا کو اپنی شمع سے منور کر رہا ہے۔



باب ۳

یورپ میں تعلیم کی ترویج و ترقی

ابتدائی دور

Development of Education in Europe

(Early Period)

عہد عتیق میں اہل یونان اہل یہود اور اہل روم نے دنیا کی تہذیب و ثقافت میں بے مثال کارنامے انجام دیئے ہیں۔ دنیا کی کوئی قوم یا خطۂ زمین ایسا نہیں جس نے ان کے افکار و نظریات سے فوائد حاصل نہ کئے ہوں۔ ان اقوام نے اپنے مخصوص انداز فکر کی وجہ سے ایک مثالی Ideal زندگی کو اپنانے کی کوشش کی۔ انفرادیت کی ابتدا اہل یونان نے کی تھی لیکن اس کو بام عروج تک پہونچانے والے اہل یہود تھے۔ ان لوگوں نے جمالیاتی ذہنی اور اخلاقی میدانوں میں بھی امثال قائم کیں رومیوں کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ان خوبیوں کو تصوراتی دنیا سے عملی دنیا میں منتقل کیا ان کی کوششوں سے تاریخ عالم میں پہلی بار یہ خیال پیش کیا گیا کہ انفرادی ترقی پر توجہ دی جائے گی۔ تو اجتماعی ترقی خود بخود ہو جائے گی۔ ان بیشتر انسانوں کی سماجی اور انفرادی زندگی کو ماضی اور حال سے ناپا جاتا تھا لیکن انہوں نے اس کے برعکس یہ جگہ مستقبل کو دیدی کیونکہ بچہ کو آئندہ زندگی کے لئے تیار کرنا ہی تعلیم کا مقصد قرار پایا۔

ابتدا میں انفرادیت کی ترقی کے لئے مناسب مواقع فراہم نہ ہو سکے جس کی اہم وجہ تعلیم تھی کیونکہ اکثریت یعنی ۹/۱ حصہ جاہل تھا۔ اہل یہود فطرتاً جمہوری خیالات کے حامی تھے لیکن پھر بھی وہ رسم و رواج، فرسودہ خیالات و اعتقادات سے منسلک تھے اس طرح معاشرہ چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم تھا اسی زمانہ میں فلسفیوں اور منطقیوں نے زندگی کی اہمیت اور مقاصد کا پرچار شروع کیا۔ انہوں نے کہا کہ تمام لوگ بھائی بھائی ہیں۔ اور سب کو اللہ تبارک تعالےٰ نے پیدا کیا ہے لیکن ان کو خاطر خواہ کامیابیاں نصیب نہ ہو سکیں جس کی وجہ یہ تھی کہ یونانی رومی اور یہودی اپنی اپنی

انفرادیت برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ غلامی کا عام رواج تھا عورتوں کو بھی بُری نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کو مساوی حقوق بھی حاصل نہیں تھے۔ یونانی اور رومی تو بچہ کو قربان تک کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔

ان حالات میں دنیا کو وسیع النظری، اتحاد، ہمدردی اور انسانیت کے سبق کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اہل یونان، روم اور یہود نے انفرادیت کی اہمیت پر لائحہ عمل تیار کر کے اس کی تکمیل کی کوشش کی، حقیقتاً ان عینی اصولوں کی ابتدا حضرت عیسٰی علیہ السلام سے ہوتی ہے۔ ان اصولوں کی تبلیغ سب سے پیشتر روم میں کی گئی حالانکہ اس کی بنیاد اہل یہود کے وطن میں ہوئی تھی۔ ان عقائد کے مطابق توحید باری تعالیٰ، اخوت، ہمدردی اور جذبہ انسانیت اس کے بنیادی اصول تھے ان کا یہ بھی ایمان تھا کہ دوسروں کے دلوں پر حکمرانی کرنا ہی مذہب ہے جب کہ رسم و رواج اور دیگر بندشوں کو لغو اور بیکار خیال کیا جاتا تھا۔ اسی سلسلہ میں مندرجہ ذیل الفاظ ملاحظہ ہوں:

"These Things, I Command you," Said He, "That ye Love one Another" Therefore, All Things what So Ever ye would That Men Should Do To you, Do ye Even So To Them."

(A History of Education P 274 by F. P. Graves.)

مذہب کی ترقی نے رسم غلامی، امیر و غریب کے فرق کو ہی نہیں بلکہ تمام فرسودہ خیالات کو بھی ختم کر دیا۔ ان کے مطابق نظریہ قومیت بھی لغو اور بے بنیاد تھا کیوں کہ ساری دنیا کا مالک ایک ہے اور ایک شخص دوسرے کا بھائی ہے عورتوں کو مناسب مرتبہ دیا گیا بچہ کو باعث رحمت تصور کیا جائے گا چنانچہ اس ضمن میں ملاحظہ ہو۔

IT Would Better for him that A Millstone were hanged About his Neck and he cast into the Sea than that he Should offend one of

These little ones" , a histor of Education
(P. 274 By Graves.)

ان اصولوں پر قدیم عیسائیت نے مکمل عمل نہیں کیا۔ اسی طرح دور اندیش اور تعلیم یافتہ لوگوں نے اس میں اصلاحات کو ضروری اور مقدم خیال کیا۔ چنانچہ کھاؤ پیو اور موج کرو کے خلاف ایک تحریک شروع ہوگئی۔ اس تحریک کو یونانی فلسفہ نے اور مواد دی نتیجہ یہ ہوا کہ Philo نے یونانیوں اور یہودیوں کے افکار و نظریات کو ایک نئے طریقے سے پیش کیا جس میں فلسفیانہ خیالات کے ساتھ ساتھ اچھائیوں اور خوبیوں کو اپنانے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔ ان باتوں سے متاثر ہو کر رومیوں کو بھی اپنے افعال و خیالات پر نظر ثانی کرنی پڑی اس سلسلہ میں سب سے اہم لوگ Seneca, Epictetus , Marcus Aurelies یہ تھے۔ ان لوگوں نے فرائض اور حقیقت نوازی کی دعوت دی اور ان کی ہی کوششوں سے مردہ افکار و نظریات کو حیات نو ملی۔ چنانچہ اخلاقی اقدار کو بنیادی حیثیت دی گئی اور فہم و ذکاوت اسباب و دلائل کو ثانوی حیثیت سے پیش کیا گیا۔

ابتدائی دور میں عیسائیوں کی تعلیمی حالت خراب وخستہ تھی۔ اس زمانہ میں اسکول بھی نہیں تھے لیکن جب مذہب کو دوبارہ عروج ہوا تو تعلیم کو لازمی اور ضروری خیال کیا جانے لگا اور پھر ضروریات زندگی اور مذہب سے مجبور ہوکر انہوں نے تعلیمی اداروں پر توجہ دینی شروع کی تاکہ بگڑے ہوئے حالات کو سدھارا جا سکے۔ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کو سامنے رکھ کر اس کو اپنانے کی کوشش پر زور دیا۔ اس مادی دنیا کے بے ثباتی کا نقشہ عوام کے سامنے پیش کر کے ان کو ابدی زندگی کی اہمیت سے آگاہ کیا اس طرح ابتدائی دور میں عیسائیوں کی تعلیم کا اولین مقصد دوسری دنیا یعنی ابدی زندگی کے لئے تیار کرنا تھا۔ گرجاؤں کی تعمیر تیزی سے ہونے لگی۔ اس وقت دانشوروں کے سامنے اہم مسئلہ مقاصد تعلیم کا بھی آیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ کس قسم کی ہونی چاہئے اس دور میں تعلیم ان لوگوں کے لئے ضروری تھی۔ جو چرچ کے اراکین کی حیثیت سے مذہبی خدمات انجام دیتے تھے۔ یہ پابندی بھی عائد کی گئی کہ تعلیم و تربیت کا وقت اور متعلمین کی عمروں کو بھی متعین کیا جائے کیونکہ اگر جاہل

لوگ اس خدمت کو انجام دیں گے تو نقصان دہ ہوگا۔ ان خوبیوں سے مرصع کرنے کے لئے خاص قسم کے اداروں کی ضرورت تھی۔ ان اداروں میں ابتدا میں صرف دو ہی سال کا کورس تھا۔ لیکن Origen سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دو سال اور چار سال کے دو مختلف نصابوں پر مشتمل تھا ان اداروں کو ضرورت کے مطابق چار حصوں میں منقسیم کر دیا گیا تھا۔

۱:۔ Catechumenal Schools ابتدائی اسکول ہی تھے ان میں طلبہ کو اس قسم کی تعلیم دی جاتی تھی جس سے وہ عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کر سکیں اس طرح ان کو مذہبی اصول اور دیگر مذہبی باتوں پر عبور حاصل ہونا شرط تھا۔ ان اداروں میں اکثریت معتقدین کے بچوں اور یہودی جنہوں نے عیسائی مذہب قبول کیا ہو اور ایسے لوگ ہوتے تھے جو مذہبی جوش و خروش سے پر ہوتے تھے۔

۲:۔ Catechetical Schools مندرجہ بالا اداروں کو اس نام سے بھی بعض اوقات پکارا جاتا تھا کیوں کہ ان کے مقاصد اور طریقہ ہائے تدریس ویسے ہی تھے لیکن یہ ادارے مقامی ضروریات کے مطابق اعلیٰ تعلیم و تربیت کا بندوبست کرتے تھے۔ اسکندریہ میں اس قسم کے ادارے تھے ان میں فلسفہ یونان علم خطابت کو ہی ذریعہ تدریس بنایا گیا تھا ان کے ساتھ عیسائی مذہب کی تبلیغ بھی کی جاتی تھی۔ اس قسم کے ادارے اسکندریہ کے علاوہ دیگر مقامات پر بھی تھے Origen نے اس قسم کے ادارے caesarea میں قائم کئے تھے

۳۔۴:۔ The Episcopal & Cathederal Schools

کچھ ادارے عیسائی پادریوں کی تعلیم و تربیت اور نو مذہب لوگوں کی تعلیم کے لئے بھی قائم کئے گئے تھے۔ یہ مختلف مقامات پر تھے۔ ایک خاص اسکول شاہ روم کی سرپرستی میں روم میں بھی کھولا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک بڑی لائبریری بھی تھی۔ جو پادری ان اداروں میں تعلیم و تربیت کے لئے داخل ہوتے تھے ان کو سخت قوانین کی پابندی کرنی پڑتی تھی۔ یہ ادارے بہت ہی مقبول ہوتے جا رہے تھے۔ چنانچہ پانچویں اور چھٹی صدی میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی اس کی وجہ یہ تھی کہ پادری یا راہب بننے کے لئے ان میں تعلیم حاصل کرنا لازمی تھی اس طرح ان کا ایک جال سا بچھا ہوا تھا۔

یہ ادارے چرچ کے ہی تحت تھے البتہ ان میں پڑھنا لکھنا اور انجیل مقدس کو رٹنے کے علاوہ مناجات اور دیگر مضامین کا بھی درس دیا جاتا تھا۔ بعض اداروں میں روزانہ اور بعض میں ہفتہ میں دو یا تین بار درس و تدریس کا انتظام تھا ان معلمین کو Catechists کے نام سے پکارا جاتا تھا ان کے لئے مذہبی معاملات پر عبور رکھنا شرط اول تھی۔ اس Catechomenal تعلیم ہم موجودہ زمانہ کی Parish کی تعلیم سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔

عیسائیوں کی شانی تعلیم و تربیت نے ایک مستقل شکل اختیار کر لی تھی اس وقت یونانی فلسفہ جس کو رومیوں نے جلا دی تھی لیکن جو صرف مادی دنیا سے ہی تعلق رکھتی تھی اب لوگوں نے سنجیدگی سے ان مسائل پر غور کرنا شروع کر دیا تھا چنانچہ معاشرہ دو حصوں میں منقسم ہو گیا تھا۔ وہ لوگ جو دنیاوی زندگی کو ہی سب کچھ خیال کرتے تھے اور دوسرے وہ جو دنیاوی زندگی کے ساتھ ہی ساتھ آخری زندگی کو بھی سدھارنے کے قائل تھے اس طرح یونانی، رومی اور عیسائیوں میں ایک خلیج پیدا ہونے لگی جس کے ردعمل کے طور پر ایک فرقہ ایسا بھی وجود میں آیا جس نے مذہب کو ڈھکوسلہ خیال کیا۔ اس طرح مذہبی اور غیر مذہبی فرقوں میں بھی تصادم شروع ہو گیا۔ کافی عرصہ کے بعد ایک فرقہ ایسا بھی پیدا ہو گیا جو ان دونوں کو انتہا پسند خیال کرتا تھا اس فرقہ نے کہا کہ فلسفہ حقیقت کی تلاش کا نام ہے جس کا تذکرہ انجیل مقدس میں بھی موجود ہے اس سلسلہ میں Justin Martyr کا نام مشہور ہے اس نے کہا۔

"The teachings of Plato are not alien To Those of christ, though not in all Respects similar, for all writers are able to have a dim vision of Realities By Means of the in-Dwelling seed of the implanted world."

یہ یونانی عیسائی جو دونوں فرقوں میں اتحاد کے قائل تھے Apologists کے نام سے مشہور ہیں Justin نے اس بات کی کوشش کی کہ یونانی رومی اور عیسائیوں کے

فلسفہ کی تطبیق کی جائے عام زاہدانہ اصولوں میں یہ حضرت عیسیٰؑ سے اپنے خیالات کو منسلک کرتے تھے۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد یونانی اور عیسائی بھی اسی نقطہ نظر سے سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ان کا فائدہ اشتراک میں ہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیت میں بذات ہو ذہنی اور فکری اصولوں کو اپنایا جانے لگا۔ اور پھر فیثاغورث، افلاطون اور ارسطو اور دیگر فلسفیوں کے خیالات کو حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم سے مربوط کیا جانے لگا۔ اس تحریک کو Gnosticism کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے اس طرح ایک تعلیمی اسکیم کو دوبارہ ترتیب دیا گیا جس میں افلاطون کے عینی اصولوں کو بنیادی حیثیت حاصل ہوئی اس طرح نامکمل اور برائیوں سے بھرپور مادی زندگی کو روحانی زندگی کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی گئی۔ انجیل مقدس کو دوبارہ ترتیب دیا گیا۔ اس سلسلہ میں Luke اور Paul کے نام قابل ذکر ہیں۔

المختصر دوسری اور تیسری صدی عیسوی میں اسکندریہ کے تمام فلسفی، یونانیوں کے قائل ہو گئے ان میں سب سے مشہور شخصیت clement کی تھی جس نے کہا کہ Gospel میں بھی افلاطون کے نظریات ملتے ہیں چنانچہ اس کے شاگردوں کی وجہ سے ایک نئے فلسفہ کو منظر عام پر لایا گیا جو Neo. Platonism کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

لاطینی پادریوں نے غیر مقلد ادب کی ابتدا میں ہی مخالفت کی تھی۔ رومن عیسائی بھی ان کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ ایک عام خیال کے مطابق چرچ کا نام عوام کی اخلاقی اصلاح کرنا بھی قرار دیا گیا۔ Jerome جو نہایت قابل مصنف تھا اس نے ایک خواب کا تذکرہ کیا جس میں اس نے اللہ تعالےٰ کے خیالات کا عیسائیوں کے بارے میں انکشاف کیا اس نے کہا کہ تمام عیسائی Cicerrnian کی طرح ہو گئے ہیں اس کے بعد ST. Augustine نے بھی مبلغانہ کام انجام دیئے اس نے اپنے خیالات کا اظہار مشہور زمانہ تصنیف City of God میں کیا اور پھر Confession کو تحریر کیا۔ ان کوششوں سے زمانہ وسطیٰ میں پھر مذہب کا دور دورہ ہو گیا۔

خانقاہی تعلیم

Monastry Education.

چوتھی صدی عیسوی سے اٹھارہویں صدی تک خانقانہ یا راہبانہ تعلیم نے یورپ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ خانقاہوں میں وہ لوگ عموماً رہا کرتے تھے جنہوں نے اس دنیا کو چھوڑ کر اپنی زندگی کا مقصد عبادت وریاضت قرار دیا تھا ان کا ایک مقصد مذہب کی تبلیغ و ترویج بھی تھا۔

" According to Rules controlling the conduct in is its Minutes Detail "

آگے چل کر یہ پادری بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گئے جن کو Conservative اور Secular کے نام سے پکارا جاتا ہے یہ خانقاہیں مغربی یورپ میں ساتویں صدی سے ریفارمیشن تک سب سے اچھے ادارے تسلیم کئے جاتے تھے اس سلسلہ میں Medicant راہبوں کا تذکرہ ضروری ہے۔ جن کے مطابق تعلیم بہت ہی وسیع نظریہ کی حامل تھی اور اس میں ہر قسم کی تعلیم کے لئے گنجائش تھی اس کے ماننے والے آج بھی موجود ہیں اور اسی طرح سے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

اس کی ابتدا کب سے ہوئی۔ اس سلسلہ میں مختلف نظریئے ہیں۔ خانقاہی تعلیم راہبانہ تعلیم یا زندگی کی ایک قسم ہے ابتدا میں یہ اصطلاح ان لوگوں کے لئے استعمال کی جاتی تھی جو اپنی زندگی کو بہت ہی مشکل اور تکلیف دہ اصولوں کے سخت گذارتے تھے۔ بطور تشبیہ وہ لوگ جو اپنی زندگی کو مذہبی امور کے لئے وقف کر دیں اور روحانی سکون حاصل کرنے کے لئے مختلف طریقوں کو اپنائیں۔ مثلاً جسمانی ریاضت، نفس کشی، کوڑے مارنا، کمزور کر لینا۔ دنیاوی خواہشات جذبات اور لذتوں سے منہ پھیر لینا۔ اگر ہم غور کریں تو یہ طریقہ ہر مذہب میں موجود ہے۔ اس سلسلہ میں مسلمان صوفی بہت مشہور و معروف ہیں کیوں کہ ان میں بھی ایک گروہ اس کا قائل ہے یہ لوگ دکھ اور تکالیف میں جان دیدینے کو ذریعہ نجات خیال کرتے ہیں اس روحانی زندگی اور عبادت

ریاضت کے علاوہ بھی خانقاہی زندگی کے کچھ اور اسباب بھی تھے. جن میں سے خاص خاص یہ ہیں۔

۱۔ راہبوں کا اعتقاد ہے کہ اللہ تعالےٰ مادی دنیا کے پرستاروں کو نجات نہیں دیتا۔ چنانچہ اگر عقبیٰ کا خیال ہے تو اس دنیاوی زندگی سے منہ موڑنا شرط ہے۔

۲۔ جب روم کی شہنشاہیت نے عیسائی مذہب کو قبول کر لیا تو اس میں خرابیاں پیدا ہونے لگیں چنانچہ مذہب اور عوام کے درمیان فاصلہ قائم ہو گیا۔ شہروں کی زندگی ریاضیت اور عبادت کے قابل نہ رہی۔ چنانچہ مذہبی لوگوں نے خانقاہوں کی طرف پیش قدمی کی۔

۳۔ اعلیٰ طبقہ اور دولت مند لوگوں نے عوام پر مظالم ڈھانے شروع کر دیئے چنانچہ مذہبی لوگوں کو شہروں کو خیر باد کہنا پڑا۔

۴۔ حضرت عیسیٰؑ کے دوبارہ جلوہ گر ہونے کے خیال نے لوگوں کو پاکیزہ زندگی گذارنے پر مجبور کیا جس کے لئے مناسب مقام خانقاہیں ہی تھی۔

۵۔ یونانی فلسفہ نے عیسائیوں کے خیالات و نظریات بدلنے میں مدد دی اور اب وہ حقیقت کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گئے ان ہی وجوہات نے راہبانہ زندگی کے لئے میدان ہموار کیا۔ عام خیال یہ ہے کہ اس کی ابتدا مصر سے ہوئی تھی۔ جو بعد میں یونان منتقل ہو گئی سب سے پہلے اس کو منظر عام پر لانے والا Anthony تھا۔ اس کے بعد اس کے اصول و قواعد کو منظم شکل میں پیش Beniدict نے کیا۔

راہبانہ زندگی اور تعلیم
Monastic Life & Education

خانقاہی زندگی کا مقصد راہبوں میں نظم و ضبط قوانین کی پابندی سختیاں اور دیگر ایسی باتوں کو اپنانا جس سے ان میں قوت برداشت پیدا ہو سکے اور وہ آئندہ زندگی میں آرام و سکون حاصل کر سکیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے تین باتوں کو ملحوظ خاطر رکھا تھا۔

۱: chastity & chelebacy :۔ اس کے مطابق خاندانی زندگی انسان کی ابدی زندگی کے لئے رکاوٹیں پیدا کرتی ہے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ انسان کی زندگی کا مقصد عبودیت ہے اس لئے ہر وقت حقیقی باری تعالیٰ کی عبادت و ریاضت کرنی چاہیئے یہی وسیلہ نجات ہے۔

۲: Poverty & Rejection خانقاہیں ضروریات زندگی سے پر ہوتی تھی وہاں پر میرے اور تیرے کا سوال نہیں تھا۔ سب کچھ اللہ تعالٰے کا خیال کیا جاتا تھا جس میں تمام راہب مساوی حقوق کے مالک تھے ان کو دنیاوی معاملات سے بالکل آزادی تھی ان کا مقصد خاص عبادت و ریاضت تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا تھا کہ وہ لوگ اعلیٰ کردار کے مالک ہوں ہر حال میں ان کے لئے مذہبی احکامات کی بجا آوری لازمی تھی۔

۳: Obedience ان تمام اصحاب پر جو خانقاہوں میں رہتے تھے ان پر لازم تھا کہ وہ اپنے معلمین کا حکم مانیں کیونکہ روحانی زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے اطاعت شرط اول تھی اس بات میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ان کو اپنی خواہشات جذبات اور انفرادیت کو فنا کرنا لازمی تھا۔ ان Ideals کی خاص بات یہ تھی کہ انسان کو سماجی بندھنوں سے آزادی حاصل ہو کچھ لوگوں کا اعتقاد گرجاؤں کے بھی خلاف تھا۔ کیونکہ عبادت و ریاضت ہر جگہ کی جا سکتی ہے شرط تو جذبہ ہے اس خانقاہ زندگی کے بہت سے اچھے پہلو بھی تھے جن کو ہم بوجہ طوالت نظر انداز کر رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ راہبانہ زندگی میں تعلیم کی کوئی خاص اسکیم نہیں تھی۔ راہبوں کے لئے اخلاقی خوبیوں کا مالک ہونا ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔ مذہبی زندگی کا مقصد بھی سوائے عبادات و ریاضت کے کچھ اور نہیں تھا لیکن پھر بھی ساتویں صدی سے تیرہویں صدی عیسوی تک یہی مقامات تعلیمی مراکز رہے۔ فرسودہ اور پرانے خیالات کو جدید خیالات نے بالکل ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس طرح طریقۂ تعلیم، نصاب تعلیم اور تنظیم تعلیم کی وضاحت ہم مندرجہ ذیل پہ روشنی ڈال کر آسانی سے کر سکتے ہیں۔

۱: Study in the Monastries :۔ خانقاہوں میں تحصیل علوم

۲. Schools in the Monastries خانقاہوں میں تعلیمی ادارے

۳. Preservation of learning خانقاہوں میں تحفظ علم

۴. Monastries As the Depositories of Learning خانقاہ بحیثیت ادبی خزانے

۵. Monks as the Literary Producers راہب بحیثیت ادبی معمار

۶. The seven Liberal Arts ہفت لبرل آرٹس

خانقاہوں میں تحصیل علوم : Study in the Monastry :

راہبانہ زندگی کے پیغمبر ST. Benedict کا اعتقاد تھا کہ روح کو ہمیشہ تلاش حقیقت کے لئے مصروف رکھنا چاہئیں۔ وہ کہتا ہے کہ کم از کم سات گھنٹہ یومیہ ادبی یا صنعتی کام انجام دینا چاہیئے اور پھر کم از کم پانچ گھنٹہ اور زیادہ سے زیادہ دس گھنٹہ یومیہ مطالعہ یا عبادت میں گذارنے چاہئیں اس خیال سے مطالعہ کی اہمیت ظاہر ہو جاتی ہے۔ مطالعہ کے لئے کتابوں کی ضرورت اور پھر ان کو پڑھنا ہر مبتدی کے لئے ضروری تھا کہ وہ نقل کرے تاکہ اس کی نقل کردہ انجیل مقدس سے دوسرے طلبہ فائدہ حاصل کر سکیں نقل کرنے کے لئے اصول و قواعد واقفیت ضروری تھی۔

دور وسطیٰ میں خانقاہیں محفوظ مقامات سمجھی جاتی تھیں۔ چنانچہ لڑائیوں اور بدامنی کے زمانے میں کمزور اور بزرگ لوگ خانقاہوں میں پہونچ جاتے تھے وہاں پر جب وہ دوسروں کو علمی مصروفیات میں دیکھتے تھے وہ خود بھی اسی کام میں منہمک ہو جاتے تھے۔ اس طرح خانقاہوں نے تعلیم، ادب تحقیق، چھپائی اور تربیت گاہوں کی حیثیت سے کام انجام دینے شروع کئے جنہوں نے آگے چل کر یونیورسٹیوں کی شکل اختیار کر لی۔

خانقاہوں میں تعلیمی کاموں پر بہت توجہ دیجاتی تھی ان کے لئے بہت سے اصول و ضوابط بنائے گئے جن کا دارو مدار زیادہ تر St. Benedict کے بنائے ہوئے اصولوں پر تھا۔ اب خانقاہوں کا معیار اس کے ادبی کارناموں سے جانچا جانے لگا۔ ان

کا قول تھا

"Love the Study of scriptures and you will not love vice"

اس طرح لاتعداد خانقاہیں جرمنی، فرانس، اٹلی اور سوئیزرلینڈ میں ادبی کاموں میں مصروف تھیں۔

لیکن کچھ خامیاں بھی تھیں مثلاً تعلیم صرف خانقاہوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ کتابوں کی کمی۔ بائبل کے مطالعہ کو ہی تعلیم سمجھا جاتا۔ سکولر ادب کو نظرانداز کر دیا گیا اور قدیم ادب پر زیادہ توجہ دی جانے لگی نتیجہ یہ ہوا کہ اقلیت ہی اس تعلیم سے فوائد حاصل کر سکتی تھی پھر راہب جاہل بھی ہوتے تھے جنہوں نے راہبانہ زندگی کو بطور پیشہ اختیار کر لیا تھا بہت سے راہبوں نے قدیم ادب کو ذریعہ معاش بھی بنا لیا تھا۔ تحقیق اور حقیقت پر توجہ نہیں دی جاتی تھی مذہبی معاملات میں کسی قسم کی جانچ اور پڑتال کو گناہ تصور کیا جاتا تھا۔

Schools in the Monastry خانقاہوں میں اسکول

Benedict نے تعلیم کے سلسلے میں خاموشی ہی اختیار کی ہے لیکن ضرورت سے مجبور ہو کر خانقاہوں میں اس قسم کے ادارے کھولنے پڑے جن میں لکھنا، پڑھنا، گانا، ریاضی وغیرہ کے بارے میں تعلیم و تربیت دی جاتی تھی۔ یہ کورس عموماً دو سال کی مدت میں پورا ہوتا تھا۔ ابتدائی دور میں ان اداروں میں بچہ کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی لیکن شہنشاہ چارلس کی کوششوں سے اس قسم کی سہولتیں بہم پہونچائی گئیں۔ چنانچہ گیارہویں صدی عیسوی میں ان اداروں کا جال پھیل گیا۔ ہر خانقاہ کے ساتھ اسکول ہونا شرط تھا اس دور کو Benedictom age بھی کہتے ہیں۔

جہاں تک مضامین اور نصاب کا تعلق تھا تو یہ ابھی ابتدائی مراحل طے کر رہے تھے بہرحال اعتقاد کے مطابق مذہبی تعلیم کے علاوہ قواعد، خطابت قانون، انجیل مقدس، ریاضی پر بھی توجہ دی جاتی تھی۔

The copying of the manuscripts & the Preservation of learning. نقل اور تحفظ علم

راہبوں نے انجیل مقدس کی نقل اوران

کو محفوظ رکھنے میں بھی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں خانقاہوں میں رہنے والوں
میں سے وہ لوگ جو کمزور اور کام کرنے سے قاصر ہوتے تھے ان کو اس کام پر لگا دیا جاتا
تھا. ایک وہ طبقہ بھی تھا جو بوجہ مجبوری باہر جانے سے معذور تھا وہ بھی اس کام کو کرتا
تھا. ہر خانقاہ میں ایک کمرہ مطالعہ ہوتا تھا جس کو ہم Reading Room کہہ سکتے
ہیں. اس کمرے میں حوالہ جات کے لئے ضروری کتب موجود رہتی تھیں تاکہ ان سے وقتاً
فوقتاً فائدہ اٹھایا جا سکے بعض خانقاہوں میں نقل کرنے کے لئے علیحدہ انتظام ہوتا
تھا اگرچہ اس نقل سازی کا کام دینی حثیت کا حامل تھا لیکن اس میں اخلاقی اور ذہنی
پہلوؤں پر بھی توجہ دی جاتی تھی. یہ لوگ روم کی کلاسیکی، یونانی ادب، انجیل مقدس
اور توریت کی نقل خاص طور سے کیا کرتے تھے کچھ عرصہ بعد یہ کام عورتوں کے سپرد کر دیا گیا تھا.

خانقاہیں بحثیت خزانہ علوم The monastries as Depositories of Literature & Learning

اس سلسلہ میں خانقاہوں نے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں چنانچہ ہم عیسائی راہبوں
اور خاص طور سے عربوں کے ممنون و مشکور رہیں جنہوں نے ادبی خزانوں کو محفوظ رکھنے میں
ہر ممکن کوشش کی جہاں تک لائبریری کا سوال ہے تو یہ بہت بعد کی چیز ہے البتہ ان
میں سے بیشتر ہر خانقاہ میں اس قسم کے کمرے موجود تھے جن میں نادر اور اہم کتب کو
محفوظ کر دیا جاتا تھا. ان تصانیف و تالیفات کی ذمہ داری وہاں کے انچارج پر ہوتی
تھی. اگر وہ شوقین اور ادب نواز ہوتا تھا تو اس میں کافی ذخیرہ ہوتا تھا. ورنہ نہیں بعض
اوقات ایک خانقاہ کے راہب کتابوں کو دوسری خانقاہ والوں سے تبدیلی بھی کر لیا
کرتے تھے جس کا مقصد زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا ہوتا تھا. نقل سازی نے
ایک پیشہ کی شکل اختیار کر لی تھی. اس طرح یہ طریقہ چھاپہ خانے کی ایجاد تک جاری و
ساری رہا.

راہب بحثیت ادبی معمار The monks as the Literary Producers

بارہویں صدی عیسوی تک تمام ادبی کارنامے راہبوں نے
ہی انجام دیئے ہیں اگر ہم اس دور کا موجودہ زمانے سے مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اس
دور میں یہ کام محدود پیمانہ پر کیا گیا لیکن ان لوگوں کی مشکلات اور دقتوں پر توجہ

دینے سے ان کی تعریف و توصیف کرنی پڑتی ہے ان کے کارناموں میں سے مشہور Gesta romanorum ہے کچھ عرصہ کے بعد ان راہبوں کی جگہ معلمین نے لے لی۔

ان راہبوں کا مقصد خاص مذہبی معاملات کو پھیلانا اور چرچ کی عظمت و شوکت سے نوازنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے تاریخی واقعات اور سوانح عمریوں پر کافی توجہ دی۔ ان کی تصانیف ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان میں لفاظی بھی پائی جاتی ہے۔

The seven liberal Arts.

دورِ قدیم اور عہدِ وسطیٰ میں ان کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ ان میں راہبوں کے مذاکرے۔ مذہبی، قصے، غرضکہ طرح طرح کے حالات کو تفصیل اور اچھوتے پیرائے میں پیش کیا گیا ہے ان میں افلاطون کے خیالات پر بھی مدلل بحث موجود ہے۔ کچھ عرصہ بعد ان کو Trivium اور Quadrivium میں منقسم کر دیا گیا تھا۔ اول الذکر میں قواعد، خطابت اور Dia Lectic کو شامل کیا گیا ہے۔ جب کہ موخر الذکر میں ریاضی، جیومیٹری، میوزک اور علم الفلکیات شامل ہیں۔ اس کی وسعت کا اندازہ لگانا مشکل ہے کیونکہ یہ انسانی زندگی کے ہی نہیں بلکہ کائنات کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔ Verro ایک رومی مصنف تھا اس نے ان میں فنِ تعمیرات، طب اور فلسفہ کو شامل کیا تھا۔ جب کہ Quintilian نے اس میں سے ریاضی اور Dialectic کو علیحدہ کر لیا تھا بہر حال یہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے نایاب ہیں جن کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

یونیورسٹی کی تعلیم

University Education.

یونیورسٹیوں کی بنیاد زمانہ وسطیٰ میں رکھی گئی ابتدا میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام بھی خانقاہوں میں تھا لیکن پھر تعلیم کی اہمیت اور افادیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے یونیورسٹیاں قائم ہونے لگیں اگر ہم ان کو اکاڈمیز کی ترقی یافتہ شکل کہیں تو بے جا نہ ہوگا یہ اکاڈمی سب سے پیشتر یونان میں قائم کی گئیں تھیں۔ لیکن پھر ان کا وجود ختم ہو گیا چنانچہ پھر یورپ میں سب سے پیشتر پیرس میں William of champeux نے ایک ادارہ قائم

کیا تھا اس میں Abelard کے زمانہ میں جو اپنے وقت کا قابل شخص تھا۔ ہزاروں طلبہ جمع ہو گئے تھے یونیورسٹیوں کی اہمیت کی وجہ Dialectic تھا کیونکہ زندگی کے لئے اس کو ضروری خیال کیا جاتا تھا یونیورسٹیوں کے بارے میں ہم اجمالاً تحریر کر رہے ہیں۔

The settled Life of the Northmen.

دسویں اور گیارہویں صدی میں لوگوں نے منتقل رہائش اختیار کر لی تھی۔ مغرب میں امن و امان کا دور دورا تھا۔ ایسے زمانہ میں زندگی ہر طرح کی ترقی کیا کرتی ہے چنانچہ اسی وجہ سے ثقافت میں تبدیلیاں رونما ہونی لگیں یہ لوگ Dialetic کی وجہ سے تعلیمی معاملات میں دلچسپی لینے لگے اس وجہ سے ان میں غور و فکر کی ابتدا ہوئی۔ اس طرح Teutonic نسل سے ابتدا ہوئی۔ ان لوگوں نے اٹلی، انگلینڈ، فرانس، اور جرمنی میں ذہنی کاموں کو شروع کیا۔ اس ذہنی انقلاب نے ہی یونیورسٹی کی طرف پیش قدمی کی۔

Reformed Papacy یا پاپائیت اور چرچ بھی اس دور میں ایک خاص موڑ پر آ گئے تھے ان کی ٹکر شہنشاہیت سے ہونا لازمی تھی اس ٹکراؤ نے لوگوں کو سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کیا۔ Dialectic کی وجہ سے مذہب اور مذہبی تعلیم پر بھی توجہ دینے پر مجبور ہو گئے۔ ان کا مقصد مذہبی اور سیاسی زندگی میں اصلاحات کرنا تھا۔

Increased of wealth اس دور میں تجارت میں بہت ترقی ہوئی نئے نئے راستوں کو معلوم کیا گیا۔ یورپ نے دنیا کے دیگر ممالک سے تجارتی تعلقات قائم ہی نہیں کئے بلکہ ان پر قبضہ بھی کر لیا دیگر ممالک میں جانے سے ان کے خیالات میں تبدیلی واقع ہوئی تجارت کی وجہ سے ملک مال و دولت سے بھر گیا اس لئے بھی ان کو اعلیٰ اور ذہنی تعلیم پر توجہ دینی پڑی۔

Crusade Movement مسلمانوں سے لڑائیوں نے تمام یورپ کو قریب تر کر دیا۔ ان کے خیالات میں تبدیلی ہوئی اور مغربی ممالک میں ذہنی انقلاب شروع ہو گیا ان لوگوں نے عربوں کو بنظر تعجب دیکھا جو ہر حال میں ان سے آگے تھے مشرق کے خیالات نے بھی ان کو سوچنے سمجھنے پر مجبور کیا عربوں کی تعلیمی حالت اور ان کے کارناموں کو دیکھ

کر ان کو اعلیٰ تعلیم پر سوچنا پڑا۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم نام Salerno کا ہے جس نے عربوں کی تعلیمی ترقی سے متاثر ہو کر اٹلی میں ایک اسکول قائم کیا تھا جس کو فریڈرک دوم نے ۱۲۲۴ء میں نیلیس سے ملا دیا۔ فریڈرک نے اس کے لئے خصوصی اجازت نامہ جاری کیا اور اس طرح Naples University کا قیام ہوا چنانچہ گیارہویں صدی عیسوی سے ذہنی آزادی شروع ہوئی۔ گرجاؤں نے اپنی بیڑیاں کاٹ کر پھینک دیں اور اب ایک دوڑ شروع ہو گئی اسی دور میں Scholastic Movement کا بھی ظہور ہوا جس نے بیداری میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس سلسلہ میں جرمنی شہنشاہ کے اس جھگڑے نے بھی مدد دی جو اس نے قوانین روم کے سلسلہ میں عوام سے کیا تھا۔ بہرحال ان تمام باتوں نے یونیورسٹی کے لئے میدان ہموار کر دیا۔

یونیورسٹیوں کا قیام

Founding of the universities

جیسا کہ بیشتر تحریر کیا جا چکا ہے کہ فریڈرک اول نے سب سے پہلے یونیورسٹی کے قیام کے لئے چارٹر عطا کیا۔ اس طرح ۱۱۵۸ء میں Bolgama میں موجودہ زمانہ کی سب سے پہلی یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا گیا Irnerius نے جو قابل معلم تھے اس کو بہت جلد معراج پر پہونچا دیا۔ اس طرح ۱۲۲۴ء میں فریڈرک دوم نے ایک دوسرے چارٹر کے ذریعہ Naples میں یونیورسٹی قائم کرائی۔ چنانچہ اب یونیورسٹیاں تیزی سے کھلنے لگیں۔

تیرہویں صدی عیسوی میں پوپ کی کوششوں سے یورپ میں انیس یونیورسٹیاں قائم ہو چکی تھیں چودہویں صدی میں ۲۵ کا اور اضافہ ہوا۔ پندرہویں صدی میں ۳۰ مزید یونیورسٹیاں کھولی گئیں اس طرح احیائے علوم سے بیشتر سارے یورپ میں قریباً اسی یونیورسٹیاں عالم وجود میں آ چکی تھیں۔

Structure & Organization زمانہ وسطی یورپ میں بہت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اسی عہد سے یورپ میں تبدیلیاں ہونا شروع ہوئیں۔

ذرائع آمد ورفت کی وجہ سے اس دور میں تجارتی ترقی بھی بہت ہوئی۔ اس سے پیشتر مذہبی اور اخلاقی زندگی پر چرچ کی اجارہ داری تھی اس سے بھی انہوں نے نجات حاصل کی۔ چنانچہ ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیمی مراکز کے طلبہ پر اب چرچ کے قوانین پر عمل کرنا ضروری نہیں رہا چنانچہ ان اداروں کو اب پادریوں سے نجات مل گئی جس کیلئے لازمی تھا کہ وہ اصول وقواعد کی تشکیل وتعمیر کریں چنانچہ اب یہ ادارے چرچ اور مملکت کے اثر سے محفوظ ہو گئے اب توانکے ایسے اصول وضوابط کو بنانا پڑا جس سے وہ اپنی انفرادیت قائم رکھ سکیں۔

یونیورسٹیوں کو مراعات

Privileges of the universities

یونیورسٹیوں کی مقبولیت، ضرورت اور اہمیت نے حکومت کو مجبور کیا کہ وہ ان کو زیادہ سے زیادہ مراعات عطا فرمائے ایک طرف تو وہ چرچ یعنی پوپ سے آزاد تھیں یعنی جیسی چاہیں ویسی تعلیم کا انتظام کرسکتی تھیں دوسری طرف مملکت کے اثر سے بھی محفوظ تھیں۔ یعنی ان کو فوجی تعلیم اور خدمت کے ساتھ ہی ساتھ ٹیکس سے بھی مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا حقیقت یہ ہے کہ یہ بیرونی اثرات سے مکمل آزاد تھیں۔

البتہ اندرونی معاملات میں ان کو خانقاہوں کی طرح اپنا نظم ونسق تشکیل دینا پڑتا تھا یہ آزاد، خود مختار ادارے تھے جن کو یہاں تک آزادی تھی کہ وہ سول اور مجرمانہ مقدمات کا بھی خود ہی فیصلہ کرتی تھیں چنانچہ یہ مراعات آج بھی جرمن اور امریکہ کی یونیورسٹیوں کو حاصل ہیں۔ (صرف چند کو) یہ اپنے طلبہ کو ڈگریاں بھی عطا کرتی ہیں ان کو درس و تدریس اور نصاب تعلیم پر بھی پورا حق تھا۔ Cessatio کو یہ اختیارات کسی قانون کی رو سے نہیں بلکہ رسم و رواج سے ملے تھے۔ انگلینڈ میں یہ حقوق آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کو بھی حاصل ہیں۔

The Division of Students & Teachers

ابھی تک یورپ میں ملکی اور قومی جذبات ابتدائی مراحل سے گذر رہے تھے اس لئے طلبا اور معلمین کی تقسیم قومی یا ملکی نہیں تھی۔ بلکہ یہ زبان یا بادشاہت کی حیثیت سے طے ہوتا تھا اس تقسیم کار کو Universitas Magistrorum at scholarium.

کہتے ہیں. یونیورسٹی لفظ کے معنی "ہم سب" (All of us) کے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ لفظ مقبول ہونے لگا اور آج بھی اس کا یہی مطلب ہے۔ البتہ طریقہ کار اور نظریہ میں کافی فرق ہے۔ پیرس میں اس زمانہ میں چار نسلوں کے لوگ آباد تھے فرانسیسی، نارمن، پکارڈس اور انگریز چنانچہ اسی لحاظ سے ان کی تقسیم بھی تھی ابتدا میں Bologna میں چار یونیورسٹیاں قائم کی گئیں تھیں. لیکن پھر ان کو دو میں ہی تبدیل کر دیا گیا تاکہ نظم ونسق اور کارکردگی اچھی طرح سے انجام دی جا سکے۔

Faculties نظم ونسق کو مناسب طریقہ سے چلانے کے لئے یونیورسٹی کو مختلف حصوں میں قومی لحاظ سے تقسیم کر دیا جاتا تھا. اسی چیز سے فیکلٹی یا شعبہ کا ظہور ہوا. اسی چیز نے آگے چل کر ڈیپارٹمنٹ کی طرف بھی پیش قدمی کی ۔ اس طرح ابتدا میں شعبہ قانون شعبہ دینیات وغیرہ کا قیام ہوا. یہ شعبہ مضامین کی ترتیب، طریقہ ہائے تدریس اور دیگر امور میں بھی آزاد تھے جہاں تک نسق ونظم کا تعلق تھا تو ان کا انتظام Procurator یا کونسل کیا کرتی تھی جس کے نمائندے ارشد سالانہ منتخب ہوا کرتے تھے ان کو کچھ خاص حقوق Delegated Powers ہوتے تھے بعض یونیورسٹیوں میں طلبہ کو بھی انتخاب میں حصہ لینے کا حق تھا. اس سے ظاہر ہے کہ ابتدا میں یونیورسٹیوں کا انتظام جمہوری تھا لیکن سولہویں صدی عیسوی میں سیاسی اشخاص کا بحیثیت افسر تقرر ہونے لگا جس سے ان کی آزادیاں سلب ہو کر رہ گئیں۔

Degrees ان یونیورسٹیوں کو ڈگریاں عطا کرنے کا بھی حق تھا ڈگری دیتے وقت طالب علم کے ادبی کارناموں کے ساتھ بہادرانہ کاموں کو بھی اہمیت دی جاتی تھی. ماسٹر ڈگری حاصل کرنے سے پیشتر امیدوار کو سات سال تک بحیثیت مبتدی کام کرنا پڑتا تھا. پھر اس کو کچھ وقت کے لئے سیاحت بھی کرنی پڑتی تھی جس کی اس کو اجرت ملتی تھی. اس طرح بحیثیت کامیاب امیدوار اس کو ڈگری دے دی جاتی تھی اور پھر اس کو گلڈ کا ممبر بنا لیا جاتا تھا. ماسٹر آف آرٹس بیتیس باجود دسال ڈاکٹر کا اپنے کو مستحق ڈگری سمجھتا تھا. اور پھر اس کو بھی سات سال تعلیم

حاصل کرنی پڑتی تھی۔

اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل الفاظ سے ان کے نصاب کا پتہ چلتا ہے۔

"To Read the ordinary texts in grammer, in Rhetoric and logic and learned to Define the words and Determine Meaning of Phrases, use of Terms and classifications."

چنانچہ اس دوران میں اس کو اپنے مضمون پر عبور حاصل کر لینا شرط تھی۔ اور پھر وہ اپنی Theses پیش کرتا تھا جس میں اس کو اپنے ممتحن سے کافی بحث و مباحثہ کرنا پڑتا تھا۔ اگر وہ ان کو اپنے نظریات و افکار سمجھانے میں کامیاب ہو جاتا تھا تو اس کو ڈگری مل جاتی تھی ورنہ نہیں۔ اس عہد میں پروفیسر، ڈاکٹر اور ماسٹر ہم معنی تھے ان میں سے کسی کو بھی حاصل کر لینے پر معلمی کا سرٹیفکیٹ گلڈ سے مل جاتا تھا۔

Methods & contents: ان اداروں میں زیادہ تر رسمی معلمانہ طریقوں کو ہی اپنایا جاتا تھا جس میں لیکچر، بحث و مباحثہ، مذاکرہ اور تقلید کو خاص اہمیت تھی۔ درس و تدریس کو موجودہ زمانہ کی طرح گھنٹوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ جو اکثر بہت طویل ہوتے تھے ان کی ساری تعلیم کتابی ہوتی تھی ان کی پوری کوشش یہ تھی کہ بچہ رسمی تعلیم پر عبور حاصل کرے اس کے بعد طرز گفتگو جس میں اس کو اپنے نقطہ نظر کو اسباب و دلائل سے پیش کرنے کی اہلیت پیدا ہو سکے تاکہ وہ ان کو منوانے کے لئے بحث و مباحثہ کر سکے۔ خاص طور سے Perisician, Donates, Aristolise, Porphyry کی کتابوں کا مطالعہ کرایا جاتا تھا۔ ان کے ساتھ ہی ساتھ علم طبیعیات اور مابعد الطبیعیات، منطق، فلسفہ، ریاضی، نجوم وغیرہ پر بھی دسترس حاصل کرائی جاتی تھی۔

Influence: ان یونیورسٹیوں کا یورپ کے باشندوں کی زندگی پر بہت اثر تھا۔ جو ان کے سیاسی، اقتصادی، معاشرتی مذہبی اور سماجی پہلوؤں پر نظر ڈالنے سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے۔ یہ جمہوری ادارے تھے۔ اس لئے یہ عوام کے حقوق کی بھی حفاظت کرتے تھے ان کی وجہ سے عوام کو طرز تحریر، تقریر وغیرہ

کی بھی آزادیاں نصیب تھیں وہ ہمیشہ حکمرانوں اور پادریوں کو مظالم کرنے سے باز رکھتے تھے کیونکہ ان لوگوں کی حکومت میں آواز ہوتی تھی۔ ان کی حیثیت اصل میں Estates کی سی ہوگئی تھی۔ یونیورسٹیوں کی وجہ سے چرچ کی بہت سی برائیاں دور ہوگئیں اگر ہم یوں کہیں کہ یہ عوام مملکت اور چرچ کے درمیان توازن برقرار رکھتی تھیں تو بے جا نہ ہوگا انہیں کی کوششوں سے Roger Bacon, Dante, Petrarch, WycliffE, huss, Copernicus جیسی عظیم ہستیاں پیدا ہوئیں جن کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔ یونیورسٹی کے بعد کالج کی ابتدا ہوئی۔ یہ اصطلاح سب سے پہلی آکسفورڈ میں استعمال ہوئی جس کا مطلب:

"Colleges" Denote Places where Students Find Board, Room & Instructions "

یہ لاطینی زبان کے لفظ Colegia سے نکلا ہے۔ جس کے معنی "To Read togather" کے ہیں۔ رومی Collegie کو ان لوگوں کے لئے استعمال کرتے تھے جو کسی خاص فن میں ماہر ہوتے تھے اور اس فن سے عوام کو سیر و تفریح بہم پہونچاتے تھے۔



باب ۴
یورپ میں تعلیم کی ترقی
(دورِ وسطیٰ)
Development of Education in Europe
(Middle Ages)

متکلمانہ نظریہ اور تعلیم Scholasticism and Education

دور وسطیٰ میں مختلف اقسام کی تحریکوں نے جنم لیا۔ ان میں سب سے اہم Scholasticism کی تحریک ہے جسکو ہم Intellectual Discipline کے نام سے بھی پکار سکتے ہیں۔ ان تحریکوں کے لاتعداد اسباب تھے۔ جو گیارہویں صدی عیسوی سے لیکر پندرہویں صدی عیسوی تک جاری رہیں۔ جیساکہ پیشتر تحریر کیا جا چکا ہے کہ اس دور میں یونیورسٹیاں قائم کی گئیں ادبی زندگی میں ناقابل فراموش کارنامے انجام دیئے گئے ان وجوہات سے ذہنی نشوونما میں حیرت انگیز ترقیاں ہوئیں۔ جنہوں نے تحریکوں کو پھیلنے اور پھولنے میں کافی مدد دی۔ اس دور میں Rabanus Maurus نامی شخص نے مذہب کو منطقی انداز میں پیش کیا۔ اس طرح بہت جلد ہی اس کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی اور کافی لوگ اس کے خیالات کے حامی ہوگئے اس تحریک کے خاص خاص مقاصد درج ذیل ہیں۔

۱۔ عوام کی قوت دلائل میں اضافہ کرنا تاکہ وہ ہر چیز کو منطقی حیثیت سے سمجھنے کی کوشش کریں۔

۲۔ علم کو سائنسی بنیادوں پر استوار کیا جائے اس میں مذہب اور فلسفی کی تطبیق کی جائے۔ انہوں نے تعلیمی میدان میں لافانی کارنامے انجام دیئے ہیں جن میں سے کچھ آج بھی جاری وساری ہیں۔

۳۔ فرد کو علوم پر مکمل دسترس حاصل ہونی چاہیئے جس کی بنیاد عقلی اسباب و دلائل پر ہو۔

اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ان لوگوں نے تعلیم کے طریقہ ہائے تدریس میں بھی تبدیلی کی۔ اور ان کو اس طرح استوار کیا کہ ان میں منطقی اور فلسفیانہ اصولوں کے ساتھ ساتھ یونانی فکر کو بھی دخل ہو۔ اس طرح ایک طرف تو وہ نئے خیالات و افکار کو اپنانا چاہتے تھے اور دوسری طرف چرچ اور مذہب کی بھی حفاظت کرنا چاہتے تھے۔ افلاطون اور ارسطو کے نظریات و افکار کو ضرورت کے مطابق تبدیل کر کے ایک نئے فلسفہ کو جنم دیا جس کو Nominalism کے نام سے پکارا گیا۔

تمام مضامین کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہر مضمون پر ارسطو کے خیالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ناقدانہ نظر ڈالی گئی۔ ایک زمانہ ایسا آیا کہ Scholastic Movement بہت ہی عزیز ہو گئی۔ اس تحریک کا Anselm کو بانی مبانی کہا جاتا ہے اس دور میں Abelard نے اپنے خیالات کا اظہار کیا جس کی وجہ سے Nominalism کو کافی نقصان پہونچا۔ اس تحریک کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے لوگوں میں روشن خیالی کے ساتھ ہی ساتھ مذہبی انداز فکر پر بھی توجہ دینے کا موقع ملا۔

ازمنہ وسطیٰ میں نائٹون کا نظام تعلیم Chivalry & Social Discipline

ازمنہ وسطیٰ کی تعلیمی تحریکوں میں سے ایک ہے اس کے مطابق تعلیم کا مقصد اعلیٰ معاشرتی نمونوں کو مدنظر رکھتے ہوئے عوام کو بیدار کرنا وہ بھی اس طرح کے ایک طرف سکولر اصول اور دوسری طرف مذہبی اصول کے درمیان متوازن رشتے قائم ہو سکیں اور پھر ترقی و ترویج کی طرف گامزن ہونا۔

Chivalry کا مطلب نائٹون کا نظام ہے جس کے لئے مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی قوانین کے مطابق تعلیم کا نظام قائم کرنا تاکہ وہ اور ان کی نسلیں اس طرح مثالی سیرت و کردار کی مالک ہو سکیں۔ اس تحریک میں صرف ان ہی امرار کی شرکت لازمی تھی جو مملکت کے تحت رہتے ہوئے معاشرے کی ترقی و ترویج کے لئے کوششیں کریں۔ اس نظام میں بچہ کو امرار در دسا کے نمونوں پر تربیت دی جاتی تھی۔ یہ ایک قسم کا

Discipline تھا جو بذریعہ تعلیم بچہ تک پہونچایا جاتا تھا۔

بچہ میں بہادری، شجاعت، خود پرستی عزت، تہذیب، شستگی، پھرتی، سنجیدگی معاملہ فہمی، ذکاوت، فہم و فراست اور فوجی شان و شوکت کے جذبات کو برقرار رکھنے کی صلاحیتیں پیدا کی جاتی تھیں۔ ان کو یہ سبق بھی دیا جاتا تھا کہ ان فرائض کی بجا آوری سے خدا بھی خوش ہوتا ہے۔ ان میں جذبہ حب الوطنی، عورتوں کی عزت اور انصاف وغیرہ سے شخصیت کو زیادہ سے زیادہ سدھارا جاتا تھا ان خوبیوں کے علاوہ ان میں کچھ برائیاں بھی موجود تھیں مثلاً غرور، تکبر، کشت و خون کے شوقین یہ لوگ غریبوں کے ساتھ برا سلوک کرتے تھے۔

اس تعلیم کو ہم دو حصوں میں منقسم کر سکتے ہیں۔ بحیثیت Page جس میں بچہ سات سال کی عمر سے ۱۴ سال کی عمر تک خاص قسم کے تربیت حاصل کرتا تھا۔ اس کے علاوہ دوسری قسم Squire اس میں تعلیم کو وہ ۲۱ سال کی عمر تک حاصل کر سکتا تھا۔ اس تعلیم و تربیت کے ادارے بہت ہی محدود تھے۔ اکثر یہ تربیت کسی نائٹ کے گھر یا بادشاہ کے دربار میں ہوتی تھی۔ ان کی تعلیم و تربیت کا اندازہ مندرجہ ذیل الفاظ سے باآسانی لگایا جا سکتا ہے۔

" All culminated in the office of Squire of the Body, who was the Immediate Personal Attendant upon the lord in Battle and in Tournament."

ازمنہ وسطیٰ میں تعلیمی ادارے : Schools in the Middle Ages.

خانقاہوں اور چرچ اسکولوں کے علاوہ ازمنہ وسطیٰ میں لاتعداد اسکول قائم کئے گئے۔ یہ بہرحال میں متذکرہ بالا اسکولوں سے مختلف تھے ان میں سے چند کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱. Chantry Schools :۔ اس قسم کے اداروں کی تعداد سب سے زیادہ تھی ان اداروں کے کرتا دھرتا وہ لوگ تھے جنہوں نے پادریوں سے اپنے خاندان والوں کے لئے مناجات اور طریقہ ہائے عبادت خرید لئے تھے ان اداروں میں طلبہ کی تعداد اور مضامین بھی مختلف ہوتے تھے۔

۲۔ Guild Schools یہ ادارے دوسرے نمبر پہ تھے یہ چرچوں اور پادریوں کے کنٹرول سے آزاد تھے گلڈ کے ممبر جو عموماً تاجر ہوتے تھے۔ اور جو پادریوں کی کفالت کرتے تھے اور ان سے بدلے میں مذہبی اور تعلیمی خدمات لیتے تھے یہ پادری بچوں کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ ان میں نیک اوصاف پیدا کرنے کی بھی کوشش کرتے تھے۔ ویسے تو اس قسم کے ادارے لاتعداد تھے لیکن ان میں Merchant Taylor کا اسکول جو لندن میں تھا بہت مشہور و معروف ہے ان اداروں میں لاطینی گرامر اور مقامی زبانوں کے لئے ضروریات زندگی سے تعلق رکھنے والے مضامین کا بھی درس دیا جاتا تھا۔

Burgher Schools :۔ ان اداروں کا مقصد سیکولر تعلیم کی ترویج کرنا۔ مالی حالت پہ کنٹرول اور معاشرہ کی ضرورت کی کفالت کرنا تھا ان میں پادریوں کو بحیثیت معلمین ملازم رکھا جاتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد دیگر لوگ بھی فرائض معلمی ادا کرنے لگے تھے۔

Private & Town Schools مندرجہ بالا اداروں کے علاوہ معاشرے اور وقتی تقاضوں کو یہ اسکول بحسن خوبی انجام دے رہے تھے اسی وجہ سے ان کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ اصل میں یہی ادارے تھے جنہوں نے آزادانہ اداروں کی طرف پیش قدمی کی۔ ان کا وقتاً فوقتاً معائنہ بھی چرچ کے افسر کیا کرتے تھے اس لئے ان پہ پادریوں کا کافی اثر ہوتا تھا۔

ان اداروں کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ان میں مقامی طلبہ کے علاوہ سیاح طلبہ بھی تعلیم حاصل کرتے تھے ان طلبہ کا طریقہ کار یہ تھا کہ ایک ادارے سے دوسرے تک مانگتے کھاتے جاتے تھے۔ پھر وہاں پہ کچھ وقت رک کر آگے بڑھ جاتے تھے۔ تبلیغ و اشاعت کا کام بھی انجام دیتے تھے ان کو خاص طور سے امداد راہبوں اور چرچ سے ملتی تھی۔

اس سے بیشتر کہ ہم آگے قدم بڑھائیں بہتر یوں معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً احیائے علوم پر بھی تحریر کرتے چلیں۔

نشاۃ ثانیہ
Renaissance

Renaissance کے ادبی معنی Rebirth کے ہیں لیکن عام طور سے اس کا مطلب چودہویں صدی عیسوی میں یونانی اور رومی کلاسیکل مضامین کی ترویج ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نشاۃ ثانیہ کا وجود جاگیردارانہ Feudalism نظام میں ہی ہوگیا تھا اس نے آرٹ، ادب، سائنس، فلسفہ سیاست مذہب تعلیم غرضیکہ ہر جگہ طوفان برپا کر دیا تھا نشاۃ ثانیہ کی ہی بدولت لاتعداد نظریات وخیالات منظر عام پر آئے مثلاً optimism رجائیت Wordliness مادیت Hedonism ثیت Naturalism انفرادیت Individualism فطرتیت Humanism۔ نسان نوازی وغیرہ ان میں سے خاص ہیں۔

اسباب Causes: یوں تو لاتعداد ہیں لیکن ہم خاص خاص کو ہی قلم بند کر رہے ہیں۔

۱. سب سے اہم عربوں اور بازنطینوں کے اثرات یہی سبب ہے کہ اس کی ابتدا اٹلی سے ہوئی۔

۲. صلیبی جنگوں نے اقوام یورپ کو مشرقی ممالک سے تعلقات قائم کرنے میں مدد دی۔ عربوں کے اثرات کے سلسلہ میں مشہور زمانہ مصنف Carol Atkinson کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"These saracenes not only Preserved learning But they were Improving upon it During the time the christian Scholars were Frettering their Intellectional Efforts in Fruit in less Asguiments"

۳. دولت کی زیادتی، صنعت وحرفت اور تجارت میں ترقی۔

۴. نئے نئے شہروں کا قیام اور قومی مملکتوں کا نظریہ۔
۵۔ خانقاہوں اور گرجاؤں میں کلاسیکی مضامین کی دلعزیزی۔
۶. Abelerd اور اس کے مریدوں کے فلسفانہ اور ناقدانہ نظریات۔
۷. دوسری دنیا سے راہ فرار۔
۸. یونیورسٹیوں کی کثرت جنہوں نے ذہنی زندگی میں طوفان برپا کیا۔
۹. بارود کی دریافت سے عوام کو قوت ملی۔
۱۰. چھاپہ خانے کی ایجاد نے تحریکوں اور نظریات کو پھولنے پھلنے کے مواقع بہم پہونچائے۔
۱۱. رومی خیالات نے سیکولرازم کو مقبول عام بنانے میں مدد کی۔
۱۲۔ ارسطو کے فلسفہ اور اس کے خیالات کی اشاعت۔
۱۳. آرٹ اور لٹریچر نے جذبہ قومیت کو ابھارنے میں مدد دی۔
۱۴۔ سائنسی ایجادات اور تحقیقات۔
۱۵. Roger & Bacon جیسے اشخاص نے عوام میں بیداری پیدا کی۔
۱۶۔ قومی زبان اور ادب کی ترقی۔
۱۷۔ گلڈ اور شہری زندگی کی ابتدار

اس مختصر سے کتابچہ میں یہ ناممکن ہے کہ نشاۃ ثانیہ کا ذکر علیحدہ علیحدہ ہر ملک کے ساتھ کیا جائے لیکن چونکہ اٹلی میں اس کی ابتدار ہوئی تھی اور یہیں سے یہ دیگر ممالک میں پھیلی اس لئے اس کا تذکرہ کرنا ضروری ہے۔

اٹلی میں نشاۃ ثانیہ Renaissance in Italy

نشاۃ ثانیہ کی ابتدا اٹلی سے ہوئی اس تحریک نے انسانی خیالات اور نظریات کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ اٹلی میں اس کی ابتدا یونانی اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے اثرات تھے۔ تیرہویں صدی عیسوی میں پاپائیت کے ہاتھ سے لیڈری نکلنی شروع ہوگئی تھی جس کی وجہ اسکولوں کا قیام قدیم مضامین کا مطالعہ دور وسطی میں ذہنی اور مذہبی زندگی میں تبدیلی اور Realism کو ہر جگہ داخل کرنے کی کوشش وغیرہ خاص اسباب تھے ان کے علاوہ یونیورسٹیوں میں سیکولر مضامین کی تدریس صنعت و حرفت میں ترقی۔ دوسرے

ممالک سے بذریعہ وینس نیلپس جنیوا اور پیسا سے آمدورفت وغیرہ اسی دور میں
قسطنطنیہ پہ مسلمانوں کا تسلط جس کی وجہ سے یونانی علمار کی اٹلی کو ہجرت وغیرہ
اہم اسباب ہیں۔

دور وسطی میں لاطینی کلاسک موجود تھیں Virgil کے مطالعہ پہ خاص توجہ
دی جاتی تھی۔ Dante کی کوششوں سے دور وسطی اور دورِ جدید میں اشتراک
پیدا کرنے کی کوشش کی گئی لیکن ان کے برعکس سب سے مشہور و معروف شخصیت
Petrarch کی تھی اس کو تاریخ تعلیم میں The First Great Representative of A New Type of Intellectual Life.
کہا جاتا ہے اس نے Cecero اور دیگر مشہور زمانہ مفکرین کو بحیثیت ماڈل پیش
کیا۔ Monroe اس سلسلہ میں رقم طراز ہے۔

"His writings were the first in Modern. Times To Reveal the Human Soul in the whole gamat of Passions Sufferings and Aspiration."

اس نے ادب برنثر کیہ کو ضروری اور اہم قرار دیا۔ اس نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف
"Sonnets" "Lives of Ancient Man" اور دیگر مضامین میں تعلیم کے
لئے نظریات اور افکار کو پیش کیا ان کے علاوہ Manual Chrysoldras,
Barzizza Boccaccio وغیرہ کے نام بھی قابل تحسین ہیں تعلیم کے علاوہ دیگر پہلوؤں
پر بھی کافی کام کیا گیا۔ خاص طور سے آرٹ میں Gitto, Masalcio, Vinci کے
نام مشہور ہیں۔ Vinci نے Last Super Vircin اور Raphael نے
Humanism کو بذریعہ آرٹ پیش کیا اسی طرح Leorardo اور Gallilio نے
طبیعیات میں قابل فخر کارنامے انجام دیئے۔

اس احیائے علوم کا سب سے اہم اور زبردست کارنامہ ثانوی تعلیم کو نئے انداز
سے پیش کرنا ہے تصانیف و تالیفات پر خاص توجہ دی گئی۔ لاتعداد عنوانات کو رجحانات
طبع کو مدنظر رکھ کر منظر عام پر لایا گیا تعلیم و تربیت کو صلاحیت سے ملزوم کر دیا گیا۔

اس سے پیشتر تعلیم و تربیت امراء اور روساء کا حق تھا۔ جیسا کہ Atkinson نے بیان کیا۔

"The Rulers were Intrested in surrounding themselves with Trained and Loyal Followers with would Be Gentlemen as well as Scholars."

سیاسی اور مذہبی خلیج کی وجہ سے چرچ اس بات میں دلچسپی لے رہا تھا کہ وہ قابل ترین لوگوں کو پیدا کرے اور مملکت کی دلچسپی لیڈروں میں تھی۔ دونوں کے لئے ہی تعلیم و تربیت کی ضرورت تھی اس دور میں ان لوگوں کو اپنی قابلیت، فہم و فراست کو ظاہر کرنے کے لئے دو ہی مقام تھے۔ چرچ یا دربار۔ چنانچہ ان ضروریات نے تعلیم میں معاونت کی اور اس کے لئے مختلف ذرائع نکالے گئے۔

شمال میں نشاۃ ثانیہ Northern Renaissance

(1500 ' 1700 A.D.)

اٹلی کا اثر دوسرے ممالک پر بھی ہوا چنانچہ ہر جگہ ذہنی بیداری شروع ہوگئی۔ اس طرح نشاۃ ثانیہ میں بھی اصلاحات کو ضروری سمجھا گیا اس طرح جنوب میں جہاں پر رسمی باتوں کو اولیت حاصل تھی دوسرے آلپس کے دوسری طرف کے علاقے جس میں فرانس اور ٹیوٹونک Teutonic نسل کے لوگ شامل تھے۔ چنانچہ جنوبی علاقوں میں ثقافت و تعلیم نے انسانی زندگی اور اس کی فطرت میں دلچسپی کو چھوڑ کر Ceceronianism میں دلچسپی لینی شروع کر دی جس میں صرف رسمی باتوں کو ہی ضروریات زندگی سمجھ لیا گیا۔ کیونکہ شمالی علاقوں میں کوئی خاص نظریہ نہیں تھا۔ اور نہ ہی وہاں پر تحقیق و تجربات کو بنیاد بنایا گیا تھا کیونکہ Petrarch اور Erasmus دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے ایک کا اثر شمال میں تھا جب کہ دوسرے کا جنوب میں۔

بہرحال شمال میں نشاۃ ثانیہ نے معاشرتی اور سماجی نشوونما پر زیادہ توجہ دی وہاں پر جمہوری اقتدار کو بنیاد بنا کر عوام میں مقبولیت حاصل کی گئی جب کہ جنوبی علاقوں میں اشرافیہ کو قبول عام تھا۔ ابتداء میں شمالی لیڈر مذہبی اور سماجی مصلح کی طرح منظر عام پر آئے انہوں نے عوام کی جاہلیت کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ان خیالات نے تعلیم کو سدھارنے میں ناقابل فراموش خدمات انجام دیں جن کا تذکرہ ضروری ہے۔

تعلیم میں تبدیلیاں
Changes in Education

پندرھویں اور سولہویں صدی میں نشاۃ ثانیہ نے ذہنی جمالیاتی اور سماجی زندگی میں بہت سی اصلاحات کیں جس کی وجہ سے بہت سی تحریکات وجود میں آئیں جن کا تذکرہ مناسب موقع پر کیا جائے گا۔ بہرحال سماجی تبدیلیوں سے انفرادی نقطۂ نظر میں تبدیلی ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نئے خیالات کو اسباب و دلائل سے جانچا گیا۔ جیسا کہ بیشتر لکھا جا چکا ہے دورِ وسطیٰ میں تعلیم رسمی تھی جبکہ اب اس نے انفرادی حیثیت حاصل کر لی۔

نشاۃ ثانیہ نے مندرجہ ذیل کارنامے انجام دیئے۔

۱. Revival the Life of the Past علمی اور تحقیقی کارنامے جو عہد عتیق میں یونانیوں اور رومیوں نے انجام دیئے تھے ان کو از سرِ نو زندہ کیا گیا اور ان کو نئی شکل و صورت میں بذریعہ آرٹ، ادب اور سائنس پیش کیا گیا۔

۲. The Subjective world of Emotions مقاصد زندگی کو بھی حیات نو بخشی گئی اور اب اس کا مقصد Contemplative Pleasures and Satisfaction of Life قرار پایا حسن و خوبصورتی کو پھر عروج حاصل ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ جمالیاتی ذوق و شوق کو بھی فلسفہ حیات اور مذہبی زندگی کیلئے لازمی قرار دیا گیا۔ ان نظریات کا اثر اسکولوں کے نصاب پر بھی ہوا۔

Discovery of Natural world :- زمانہ وسطیٰ میں مطالعہ نیچر کو ناقابل تلافی خیال کیا جاتا تھا لیکن اب اس میں تبدیلی آگئی اب اس پر مدلل بحث کی گئی طبعیات پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی گئی اس وجہ سے نیچرل سائنس میں لاتعداد نظریات و افکار کا اضافہ ہوا۔

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ نصاب تعلیم کو نئے انداز فکر سے تشکیل کیا گیا۔ جذبات جذبہ تحقیق و تجسس کو وقت کی پکار سمجھ لیا گیا لاطینی اور یونانی لٹریچر کا وسیع مطالعہ کیا گیا جس سے لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہی نہیں بلکہ ان کے سامنے

تعلیم و تربیت کے نئے نئے ابواب کھلے اس طرح عہد عتیق کے کلاسیکل لٹریچر میں تحقیق و تلاش کی ابتدا ہوئی جس سے ان کو ایک نئی راہ عمل ملی۔ جذبات کو ادب اور آرٹ میں پیش کیا گیا جس سے شاعری انشا پردازی اور ڈرامہ نگاری میں بھی مدد ملی۔ ہر بات کو غور و فکر مشاہدات و تجربات و تحقیق و جستجو کے ذریعہ جانچا گیا نئے ممالک کا پتہ لگایا گیا ایجادیں کی گئیں جس سے فرسودہ خیالات اور توہم پرستی کا خاتمہ ہوا۔ اور ان کی جگہ نئے نظریات و خیالات کو قبول عام نصیب ہوا۔

تعلیمی نشاۃ ثانیہ کا مطلب

Meaning of Renaissance of Education.

نشاۃ ثانیہ نے تعلیمی میدان میں بہت سے کارنامے انجام دیئے ہیں چنانچہ قدیم اور جدید تعلیم کو ملا کر ایک نئے طرز تعلیم کی ابتدا ہوئی اخلاقی تعمیر برل تعلیم اور سیرت کی تعمیر و تشکیل کو دوبارہ اہمیت حاصل ہوئی، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ احیائے علوم کا مطلب کلاسکس اور لسانی پہلوؤں سے ہی ہے لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے اس کی وضاحت Paulusvergerius نے اس طرح کی ہے۔

"Education is that Body of Kndwledge thet Develops and Trains the Highest Gifts of Body and mind.

چنانچہ نصاب تعلیم، مقاصد تعلیم اور طریقہ ہائے تدریس کو از سر نو مرتب کیا گیا تعلیم کے مفہوم کو وسعت عطا کی گئی افلاطون اور سسرد کے خیال میں تعلیم کا مقصد صرف علم ہی ہے اب تعلیم میں مندرجہ ذیل اہم خیالات کو بنیادی حیثیت دی گئی۔

۱۔ جسمانی تعلیم جس میں ادبی اور chivalry کو بھی شامل کر لیا گیا۔
۲۔ متعلمین کی قوت فیصلہ اور عملی قوتوں کو ابھارا جائے۔
۳۔ جمالیاتی ذوق کو پیدا کرنا تاکہ لوگ اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں۔
۴۔ نصاب تعلیم میں Humanities پر خاص طور سے توجہ دی گئی جس میں لسانیات کلاسیکل لٹریچر اور گرامر کو خاص مرتبہ دیا گیا لیکن کچھ عرصہ بعد Humanitic

Education صرف زبان اور ادب کے لئے ہی استعمال کی جانے لگی۔

سولہویں صدی عیسوی سے ہیومنیٹک تعلیم کو Ceceronism کے نام سے موسوم کیا جانے لگا اس وجہ سے سسرو کے خیالات کو پھر اہمیت حاصل ہوئی چنانچہ گرامر تقریر، غرضیکہ ہر جگہ اس کو اپنانے کی کوششیں شروع ہوگئیں Erasmus نے اسی نام کا ایک ڈائیلاگ تصنیف کیا جس میں اس نے تعلیم و تربیت پر مفصل بحث کی ہے۔

انسانی محبت اور تعلیم

Humanistic Education

Humanism تمام تحریکوں میں سب سے زوردار تھی۔ اس کی رو سے مسلک انسانیت یا فلسفہ انسانیت جس کی رو انسان کی ذات کائنات کا مرکز ہے اس لیے بجائے عالم آخرت یا عالم طبعی کے مجموعی انسانی زندگی کا مطالعہ اور اس کی ترقی کی کوشش کرنی چاہیئے اس کی تین صورتیں تھیں۔

۱۔ عیسائی ۲۔ دنیاوی ۳۔ پروٹیسٹنٹ

نشاۃ ثانیہ نے انسان کو بہت سی تبدیلیوں سے نوازا۔ ان تبدیلیوں میں کافی وقت صرف ہوا۔ یہ دور تیرہویں صدی عیسوی سے لیکر سولہویں صدی عیسوی تک کا مانا جاتا ہے دورِ جدید کا آغاز اسی سے ہوتا ہے اس تحریک کے بانیوں نے انسان کی سیاسی سماجی، معاشرتی، اقتصادی مذہبی تعلیمی غرضیکہ ہر جگہ انسانیت نوازی کو پیش کیا ہے اس تحریک کا آغاز سیکولرازم سے ہوتا ہے اس تحریک کو بعد میں دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔

۱۔ Social Humanism ۲۔ Individual Humanism

اس تحریک کے مشہور و معروف مفکرین۔ Erasmus, locke,
Vives, Loyola, strum ہیں ان لوگوں نے بھی Quintelian
اور Plutarch کی ہی شمع روشن کی تھی۔

ہیومنسٹک تعلیم نے "Represented a Rebellion Against Conservative forces" اس تحریک نے عوام کو آزادی اور انفرادیت

کے حسین اصولوں سے نوازا۔ ان لوگوں نے جو نصاب تعلیم مرتب کیا اس کے مطابق پڑھنا لکھنا لاطینی زبان کے علاوہ یونان و روم کے مصنفین ادیبوں اور شاعروں کے کارناموں پر بھی عبور حاصل کرنا تھا۔ تاریخ اور سوانح عمریوں سے گذشتہ علوم پر دسترس حاصل کرنا لازمی تھا۔ ان کی یہ بھی کوشش تھی کہ لوگوں میں Joy of living & To Inculcate the Apprciation of the Beauty بھی پیدا کریں اس تحریک میں جسمانی اخلاقی اور مذہبی تعلیم پر بھی کافی توجہ دی گئی تھی۔ انہوں نے تخلیقی قوتوں کو ابھارنے پر بھی کافی توجہ دی۔ اٹلی کے ہیومنیسٹ Humanists نے یونانی اصول Harmonious Development of Life کو بھی قبول کر لیا تھا۔

اس تحریک سے ثانوی تعلیم پر بہت اثر پڑا۔ انہوں نے ڈر خوف مار پیٹ یعنی بچہ کی ہر قسم کی سزا کے خلاف آواز اٹھائی عوام کی تعلیمی حالت بہتر بنانے کے لئے انہوں نے مختلف طریقوں کو اپنایا۔ ہالینڈ میں ۱۳۷۶ء میں جمہوری اصولوں پر تعلیمی بنیادوں کو استوار کرنے کے لئے Brethern of Common life نام کی سوسائٹی قائم کی انہوں نے اپنے نظریات اور افکار میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے خاص قسم کے ادارے قائم کئے جن پر مختصراً روشنی ڈالی جاتی ہے۔

Schools : Erasmus بہت بڑا Humanist تھا جلد ہی اس کو شہرت اور دلعزیزی حاصل ہو گئی اور اس طرح اس کے بہت سے مرید ہو گئے ان کی کوششوں سے اسکول کھلنے شروع ہوئے ان اسکولوں کا وجود انیسویں صدی تک رہا۔

۱۔ Court or Nobility Schools اس تحریک کی چرچ نے زبردست مخالفت کی لیکن رفتہ رفتہ خانقاہوں کے اسکولوں میں ان خیالات کو دلعزیزی حاصل ہونی شروع ہو گئی اس دور میں امراء اور روساء اسکول کھولنا اپنی شان و شوکت کے لئے ضروری سمجھتے تھے اس طرح حکمرانوں اور امراء روساء میں مقابلہ شروع ہو گیا اس قسم کے اسکولوں کی ابتدا بھی اٹلی سے ہی ہوئی تھی۔

۲۔ Schools for Princes اس قسم کے ادارے سب سے پہلے جرمنی میں قائم کئے گئے جو Furstenschulen کہلاتے تھے۔ یہ بھی اٹلی کے کورٹ اسکولوں کی ہی طرح تھے لیکن نصاب تعلیم اور لڑکوں پر کنٹرول کا سوال ہے تو یہ ان

سے مختلف تھے زیادہ تر یہ بورڈنگ اسکول تھے ان کا خاص مقصد حکمرانوں کے بچوں کو تعلیم و تربیت کے مواقع فراہم کرنا تھا۔

۳۔ The Gymnasium اس قسم کے ادارے Teutonic نسل سے لے کر آج تک جاری و ساری ہیں یہ ثانوی تعلیم کے لئے سب سے اچھے ادارے مانے جاتے ہیں ان کی ابتدا Burgher یا چرچ اسکولوں سے ہوئی تھی ان اداروں میں لاطینی کو کلاسک سے Pealectic Literature کو Rhetonic کو ریاضی میں تبدیل کر لیا تھا۔ ان اداروں میں یونانی عبرانی اور لاطینی زبانیں بھی پڑھائی جاتی تھیں۔ شاعری اور خطابت کو بھی نصاب میں شامل کر لیا گیا تھا اس ضمن میں سب سے مشہور ادارہ strassburg کا تھا جس کو strum نے ۱۵۳۷ء میں قائم کیا تھا۔

۴۔ English Public Schools یہ ادارے چرچ اور مملکت دونوں کے اثرات سے محفوظ تھے۔ یہ عوام کے چندے سے کھولے جاتے تھے ان میں سب سے مشہور Eton اور winchester کے ہیں۔ نشاۃ ثانیہ سے بیشتر لندن میں ST. Pauls کا اسکول بھی بہت مشہور تھا۔

۵۔ The Latin Grammar schools امریکہ کی نوآبادی میں بھی بہت سے ادارے قائم کئے گئے جن کا نصاب اور نظم و نسق بھی انگلستانی اسکولوں کی طرح ہی کا تھا ان پر عموماً لوکل کنٹرول ہوتا تھا ان میں خاص طور سے گرامر کی تدریس ہوتی تھی سب سے بیشتر اس قسم کا ادارہ Boston میں قائم کیا گیا جو بعد میں اکاڈمی میں تبدیل ہو گیا تھا۔

Universities :۔ اس تحریک کی مقبولیت کی وجہ سے جلد ہی یونیورسٹیوں میں بھی ان خیالات کو اپنا لیا گیا۔ ابتدا میں پرانے خیالات اور افکار سے ان کا تصادم ہوا جنہوں نے ان کو رد کرنے کی کوشش کی لیکن بعد میں ان کو سر جھکانا پڑا۔ چنانچہ تحریک کے مطابق نصاب کو وسیع کیا گیا۔ یہ تبدیلی بھی سب سے پیشتر اٹلی میں ہی ہوئی جس کے ساتھ ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ اس طرح یونانی زبان کی تدریس لازمی ہو گئی۔ اٹلی سے یہ خیالات جرمنی، فرانس اور انگلینڈ پہونچے جہاں پر ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

اصلاحِ دین اور تعلیم

Reformation & Education

نشاۃ ثانیہ کی خصوصیات کا اجمالاً تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ اٹلی میں نشاۃ ثانیہ نے زیادہ تر توجہ کلاسیکل اور غیر مقلد چیزوں پر دی جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے ادب کو بھی اسی طرح کا پیدا کیا اس کے برعکس شمالی یورپ کا علاقہ کلیسا اور عیسائی مذہب کا پیرو رہا اول الذکر تحریک کے حامی انفرادیت پسند تھے جب کہ موخر الذکر کا ایمان اصلاحی اور سماجی برائیوں کو دور کرنا تھا۔ پہلی والی کلاسیکل اداروں سے ملحق تھی جن کی بنیاد Teutonic خوبیوں سے تھا۔ یہ لوگ اخلاق اور مذہب کے قائل تھے۔ جب کہ لاطینی سیکولر خیالات کے حامی تھے یہی ان دونوں میں خاص اختلاف تھے۔

چرچ اور عیسائیت میں لاتعداد برائیاں پیدا ہوگئی تھیں جن کی اصلاح کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ ان اصلاحات نے بقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کرلی۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ تحریک تین حصوں میں منقسم ہوگئی۔ ایک کا خیال تھا کہ آہستہ آہستہ اندرونی طور سے اصلاحات کی جائیں جب کہ دوسرے فرقہ والے کہتے تھے کہ کسی قسم کی اصلاح کی ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ مذہب مکمل ہے جس میں چوں وچرا کرنا گناہ کبیرہ ہے۔

اسی دوران میں ایک تیسرا فرقہ بھی میدان میں آگیا جس کا اعتقاد تھا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی ہدایات پر عمل کر کے چرچ میں اصلاحات کی جا سکتی ہیں یہ طبقہ رومن کیتھلک چرچ میں پیدا ہوا تھا۔

ان خیالات سے تعلیم بھی اثر پذیر ہوئی چنانچہ یہ اصلاح دین جس کی وجہ سے عیسائی مذہب Catholics اور Protestants حصوں میں منقسم ہوگیا تھا۔ ابتدا میں نشاۃ ثانیہ کے دوش بدوش آگے بڑھی لیکن کچھ عرصہ کے بعد اس نے علیحدہ مستقل شکل اختیار کرلی جو اصلاح دین Reformation کے نام سے مشہور ہوئی چنانچہ اس کا اثر یہ ہوا کہ۔

" What is contrary to Reason was contrry to God,"

اس نظریہ کو بام عروج پر پہنچانیوالا مارٹن لوتھر Martin luther تھا چنانچہ

اس نے پوپ کے ڈھول کا پول کھولا جو بہت طویل قصہ ہے جس کو ہم نظر انداز کر رہے ہیں بہرحال اب کچھ لوگوں نے پوپ کی سرداری ماننے سے انکار کر دیا اور انہوں نے انجیل مقدس کو بھی اسباب و دلائل سے سمجھنے کی کوشش کی جن کو معمولی کامیابی نصیب ہوئی۔

ان عقائد کے برخلاف تعلیم پر Formalism کا قبضہ تھا جس کی خاص وجہ Protestantis کی مختلف فرقوں میں تقسیم تھی اس دور میں معمولی سے اختلاف پر بھی فرقہ قائم کر لیا جاتا تھا اس رسمی تعلیم نے پھر نئی Scholastic تحریک کو جنم دیا جو تیرہویں صدی عیسوی کی تحریک سے بالکل مختلف تھی۔

ان ہی اسباب کی وجہ سے مصلحین نے تعلیم میں آزادی، ثقافت کی ترقی، اور سائنسی میدان میں پیش قدمی شروع کر دی۔ بیکن توجہ کو رانہ خیالات اور جذبات کے عام طور سے لوگ سولہویں اور سترہویں صدی میں محسوس نہیں کر سکے لیکن آگے چل کر ان کو اس کا احساس ہوا یہی خیالات و نظریات ابتدائی تعلیم سے لیکر اعلیٰ تعلیم میں موجود تھے۔

ان نظریات نے نصابِ تعلیم پر بھی اثر ڈالے چنانچہ ان کو Humanistic بنانے کی کوشش کی گئی انجیل مقدس کا مطلب صرف کلاسیکل لٹریچر پر عبور حاصل کرنا ہی سمجھ لیا گیا۔ اس طرح تعلیم ایک بار پھر مذہبی اثرات کے تحت ہو گئی۔ ان نظریات کا تعلیمی اداروں پر بھی کافی اثر ہوا۔ چنانچہ ان مقاصد کے تحت نئے ادارے کھولے گئے جن کی بنیاد عام تعلیم Universal Education پر رکھی گئی۔ اس دور میں عام خیال یہ ہو گیا کہ اگر مملکت کی فلاح و بہبود منظور ہے تو فرد میں صلاحیتیں پیدا کی جائیں اس نے انفرادیت کی ترقی پر زور دیا۔ چنانچہ مذہبی زندگی میں ورک حاصل کرنے کے لئے اور سمجھنے کے لئے کہ حقیقت کیا ہے انجیل مقدس کا مطالعہ ضروری ہو گیا۔ اس خیال نے ہی لازمی تعلیم کی Compulsory Education کی طرف پیش قدمی کی۔

سولہویں صدی کے مصلحین Humanists اور Reformists میں معمولی فرق تھا چنانچہ کچھ Humanists نے صاحبین کی مدد کی
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصلاحات کے مقابلہ میں ایسے لوگ آگئے جو ان کو پسند نہیں کرتے

تھے۔ چنانچہ چرچ کے حامی اور مخالفین کا ٹکراؤ شروع ہو گیا۔ اس سلسلہ میں دو اشخاص ایسے ہیں جنہوں نے قابل فخر کارنامے انجام دیئے جن کے نام مارٹن لوتھر Martin Luther اور John Calvin ہیں۔

حقیقت پسندانہ نظریہ اور تعلیم
Realistic Education.

Renaissance اور Reformation کے ساتھ ہی ساتھ نظریہ حقیقت کی تحریک بھی پھولتی پھلتی رہی۔ ان لوگوں کے مطابق۔ "For the General Intellectualawakening of the western Europe."

اس نظریہ کے حامیوں نے Reformists اور Humanists کے ادنیٰ خیالات کی مخالفت کی اور کہا کہ زندگی کی کامیابی کا دارومدار حقیقت پسندانہ نظریہ پر ہے اس تحریک کو عروج سولہویں صدی میں ہوا۔ لیکن یہ نئی نہیں تھی۔

دور جدید کی کامرانی کا دارومدار زیادہ تر اسی تحریک پر ہے اس نے بہت سے حقیقت پسند افراد پیدا کئے جنہوں نے اپنے کارناموں سے شہرت عام و بقائے دوام حاصل کی ان میں Capernicus, Gallild Kepler & Newton کے نام بہت مشہور و معروف ہیں ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے کائنات کی ہر شے کو حقیقت پسندانہ نظریات سے جانچا اور پھر تحقیق و جستجو کے بعد اپنے نظریات کو پیش کیا۔

Realism تحریک میں تعلیم کو بہت ہی اعلیٰ وارفع مقام بخشا گیا۔ انہوں نے لسانیات اور ادب کے مطالعہ کی بجائے مظاہر قدرت کو اور سماجی اداروں کی تعلیم کو ضروری خیال کیا۔ چنانچہ اس طرح تعلیم میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا جس کا مقصد سائنسی میدان اور جدید سائنس میں ہر قسم کی تحقیق کی جائے انہوں نے اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے خاص قسم کے اداروں کو جنم دیا جو Out of slips کے نام سے پکارے گئے یہ لوگ اپنے خیالات کی تبدیلی کی وجہ سے تین حصوں میں منقسم ہو گئے۔

1. Humanistis 2. Social 3. Sense Realistic ۔

پہلے فرقے کے لوگ Humanism سے بھی تعلق رکھتے تھے جبکہ دونوں میں سب سے بڑا فرق یہ تھا کہ Humanists حرف ساخت اور کلاسیکی مضامین سے ہی تعلق رکھتے تھے جب کہ Humanistic Realists کلاسیکل تعلیم کے علاوہ سائنس تاریخ اور معاشرتی اصلاح کی کوشش بھی کرتے تھے۔ اور ان کوششوں میں اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ حقائق زندگی کا پتہ لگا کر ان کی تکمیل کی کوشش کریں۔ یہ حقیقتاً وقت سے بہت آگے تھے ان کی سب سے مشہور ہستی Rebelais گذری ہے جس کو اگر ہم جدید تعلیم کا بانی کہیں تو بے جا نہ ہو گا۔

دوسرے نمبر پہ Social Realists تھے۔ یہ اس دنیا کے قائل تھے یہ علم کو سماجی سرگرمیوں کے ذریعہ آسان طریقوں سے حاصل کرنے کے خواہش مند تھے ان کی نظر میں تعلیم کا مقصد Art of Living پیدا کرنا تھا۔ ان کا سب سے سرگرم رکن Michaelde Montaigne تھا اس نے Activity curriculum کی سفارش کی ہے جو تجربات اور مشاہدات پر مشتمل ہونا چاہیئے اس نے ٹیوٹر کی اہمیت پر بہت زور دیا ہے اسی کی کوششوں سے ٹیوٹوریل Tutorial سسٹم کی اتنی مقبولیت حاصل ہوئی جو آج بھی آکسفورڈ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں اپنایا جارہا ہے

تیسرا فرقہ Sense Realists کے نام سے پکارا جاتا ہے اس کے پیروکار حقائق زندگی کو تجربات کی کسوٹی پہ پرکھنے کے قائل تھے۔ یہ انہیں لوگوں کے کارنامے ہیں کہ آج دنیا نے سائنسی میدان میں اتنی ترقی حاصل کی ہے چنانچہ ان کا مقصد حقیقت کے رازوں کی تلاش وجستجو تھی اور پھر ان کو عملی زندگی میں اپنا کر ترقی کی طرف پیش قدمی تھی۔

اس فرقے کی مشہور ہستیاں John Amos Comenious ہیں ان لوگوں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے Pansophic Education کا نظریہ پیش کیا جس کا خاص مقصد Education That Includes all Knowledge ہے ان لوگوں کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ تعلیم کو مقامی اور ملکی زبانوں میں ہونا چاہیئے۔

نظریہ انضباطی اور تعلیم

Disciplinary Concepti of Education

اصلاح دین کا سب سے زیادہ اثر یہ ہوا کہ لاطینی زبان پر توجہ کو ختم کر دیا گیا اور اس طرح یہ صرف مذہب کی ہی زبان رہ گئی دوسری وجہ یہ تھی کہ نظریہ بین الاقوامی منظر پر آ رہا تھا۔ لاطینی زبان صرف ایک خاص طبقہ کی ہی ترجمان تھی اس وجہ سے Humanistic تعلیم کا زوال شروع ہو گیا۔ چنانچہ سترہویں صدی عیسوی میں ایک نیا نظریہ تعلیم کو پیش کیا گیا جو Disciplinary concepti of Education کے نام سے مشہور ہے ویسے تو اس کے وجود میں آنے کی بہت سی وجوہات تھیں لیکن درج ذیل خاص ہیں۔

سب سے اہم وجہ اس کی مقبولیت کی یہ تھی کہ اس نے Process of Living کو اپنا محور بنایا اس کے مطابق فعالی تجربہ جس کا تعلق ذہن سے ہوتا ہے اور جو خاص قابلیت پیدا کرتا ہے اور پھر وہ اپنی استعداد کے مطابق اس سے فائدہ اٹھاتا ہے اس استعداد کو مختلف طریقہ سے کام میں لایا جا سکتا ہے چنانچہ تعلیم کی کامیابی کا دار و مدار اس پر ہے کہ ابتدا میں بچہ کو کم سے کم مضامین کا درس دیا جائے۔ اور جیسے جیسے اس کی ذہنی قوتوں میں اضافہ ہوتے رہے ان کی تعداد بھی بتدریج بڑھتی رہنی چاہیں۔ ان کا ردعمل یہ ہوگا۔ کہ

"Peculiarly Adopted To The Development of The memory And of the Reason."

انہوں نے اس چیز پر بھی زور دیا کہ ابتدا میں ایسے مضامین کا انتخاب کیا جائے جس میں کسی حد تک یکسانیت ہو مثلاً منطق اور ریاضی یا تاریخ اور جغرافیہ اگر اس طرح تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ تو دماغ کی نشوونما اور تربیت خاص طور سے ہوگی جس سے آئندہ زندگی میں خوبیاں اور مسرتیں نصیب ہونا ضروری اور لازمی ہیں۔

دوسری وجہ Demand of the changed Society تھی۔ سماج میں تبدیلیاں ناگزیر ہوتی ہیں سولہویں اور سترہویں صدی میں اس قسم کی لاتعداد تبدیلیاں

ظہور میں آئیں ان تبدیلیوں کی وجہ سے Humanistic تحریک کی اہمیت ختم ہو گئی۔ چنانچہ اس کی جگہ اس نئی تحریک نے سنبھال لی چنانچہ تعلیم میں بھی معاشرے کی ضروریات کے مطابق تبدیلیاں کی گئیں۔

اہم وجہ Religious Support بھی تھی۔ اس سے پیشتر کی تحریکوں کو مذہبی امداد حاصل نہیں تھی لیکن چونکہ اس تحریک میں طریقہ ہائے تدریس اور مقاصد تعلیم خاص زاویہ سے پیش کئے گئے تھے اور پھر معاشرے اور چرچ کے تصادم نے ہر شخص کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اس میں اصلاحات کی کوشش کرے یہی ایک ایسی تحریک تھی جس نے وقت اور ضرورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اصلاحات کی کوشش کیں۔

اس سلسلہ میں ایک وجہ Psychological Support بھی کہی جا سکتی ہے اگرچہ اس کی ابتدا ارسطو سے ہوتی ہے لیکن پھر اس کی مقبولیت ختم ہو گئی تھی ازمنہ وسطی میں اس کو پھر عروج حاصل ہوا اس زمانہ کی مشہور ہستیوں جیسے Bacon اور Locke نے بھی اس کے لئے کوشش کی اس سے بھی تحریک کو مدد ملی۔

آخری وجہ Support of the Scientific Tendency نفسیات اور سائنسی ایجادات نے عوام کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ مقصد تعلیم بچہ کی ہمہ گیر نشوونما دوبارہ قرار دیدیا گیا۔ اس ضمن میں Pestalozzi کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔

باب ۵
یورپ میں تعلیمی ترقی
(دورِ جدید)
Development of Education in Europe
(Modern Period)

یہ دور تعلیمی اعتبار سے بھی اہم ہے اس وسیع دور میں یہ ناممکن ہے کہ اس کی تعلیمی ترقیوں کا تفصیلاً جائزہ لیا جا سکے۔ بہرحال اس دور میں جو خاص خاص مفکرین تعلیم گزرے ہیں ان میں سے کچھ پر اجمالاً روشنی ڈالی جاتی ہے اس سلسلہ کی سب سے پہلی کڑی روسو ہے اس لئے اس سے ابتدا کر رہے ہیں۔

Jean Jacques Rousseau جین ژیک روسو اور تحریک فطرتیت
(1712 - 1778)

روسو نے تعلیم میں نیچرل ازم Naturalism کی ابتدا کی نیچرلسٹ سے پیشتر عیسائی ممالک میں بچہ کو والدین کے گناہوں کا کفارہ خیال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ بچہ کے ساتھ نہایت انسانیت سوز برتاؤ کیا جاتا تھا۔ روسو نے اس کے خلاف جہاد کیا جس میں اس کو کافی کامیابی ہوئی۔ اس کا کہنا ہے کہ بچہ نیکیوں کا پتلا ہے نیچرلسٹ کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ بڑا ہو کر بچہ کیا بنے گا وہ کہتے ہیں کہ بچہ ہر حال میں بچہ ہے۔ جو قابل احترام ہے بچہ کے اعمال کتنے ہی قابل اعتراض کیوں نہ ہوں بالغوں کے معیار کتنے ہی اعلیٰ وارفع ہوں فوقیت بچہ کو ہی حاصل رہے گی تعلیم زندگی کے لئے تیاری نہیں بلکہ زندگی کا ہی دوسرا نام ہے۔

افلاطون کے بعد روسو پہلا شخص ہے جس نے اپنے افکار و نظریات سے میدان تعلیم میں ہلچل مچا دیا۔ اس ضمن میں Morley رقمطراز ہے۔

IT was in Rousseau that Polite Europe First Harkened to Strange Voices and Faint Rever

Berations from out of the vague and Shadow in which the common People Move."

روسو نے اپنے تعلیمی افکار و نظریات کا تذکرہ تفصیلاً اپنی مشہور زمانہ تصنیف Emile میں کیا ہے جو پانچ حصوں پر مشتمل ہے یہ کتاب موجودہ تعلیم میں انجیل مقدس کا رتبہ رکھتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ روسو کو تعلیم جدید کا پیغامبر کہا جاتا ہے اور اس کے عقیدت مندوں کو جدت پسند کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے روسو ایمیل میں نیچر کو ہی سب کچھ تسلیم کرتا ہے یہی چیز اس نے معاہدہ عمرانی میں لکھی کی ہے اس لئے وہ دنیا کا سب سے عظیم نیچرلسٹ کہلاتا ہے۔ ایمیل کا آغاز بڑے ہی دلچسپ اور اچھوتے انداز میں کرتا ہے۔

"Everything is Good as it comes from the Hands of the Author of Nature."

مقاصد تعلیم : Aims of Education : روسو ایمیل نام کے ایک لڑکے کو بحیثیت ہیرو پیش کرتا ہے وہ اس کو معیاری تعلیم دینا چاہتا ہے وہ اپنے کردار ایمیل کو جو ایک امیر خاندان کا چشم و چراغ ہے اپنی سرپرستی میں لے کر معاشرے سے باہر چلا جاتا ہے اور پھر اس مقام پر جاتا ہے جہاں سے اس کو تعلیم و تربیت دے سکے روسو کے خیال میں تعلیم ایک عمل بالیدگی ہے جو زندگی کو پرمسرت دانشمند از ہم آہنگ، متوازن اور کار آمد بنا دیتی ہے اس سلسلہ میں وہ ایک ہی بات کا متمنی نظر آتا ہے کہ تعلیم وہی ہے جس میں بچہ کو نیچرل صلاحیتوں کو ابھارنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی جائے اور اس کے معاملات میں کم سے کم دخل اندازی کی جائے اس کی قوت رجحان طبع کو پوری آزادی کے ساتھ پروان چڑھنے کا موقع ملے اس طرح روسو پہلا شخص ہے جس نے کہا کہ تعلیم کے مقاصد عمل اور ذریعہ مکمل طور پر بچہ کی زندگی اور تجربات پر منحصر ہونے چاہئیں۔ وہ مروجہ تعلیم کو لغو اور بیکار قرار دے کر ایک نئے نظریہ تعلیم کو پیش کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ انسان فطرتاً معاشرتی حیوان ہے اس لئے اس کو مناسب تعلیم نیچر سے ہی مل سکتی ہے ہر شخص کی نیچر مختلف ہوتی ہے اس کی نیچر کا پتہ لگانا اور

پھر اس کو اس کے مطابق تعلیم دینا ضروری ہے

اس کے بعد روسو منفی تعلیم کا Negative Education کا تذکرہ کرتا ہے منفی تعلیم وہ ہے جو دماغ کو برائیوں سے محفوظ رکھے انسانی اعضار کو مناسب طور سے نشوونما دے اور ان کو مناسب طور سے کام کرنا سکھادے بچہ کے جذبات، احساسات اور اس کے نیچرل تقاضوں کی تکمیل کر سکے روسو مروجہ تعلیم کے اس وجہ سے بھی خلاف تھا کہ وہ بچہ میں خوبیوں کی بجائے برائیاں پیدا کر دیتی تھی۔ پال منرو اپنی مشہور زمانہ تصنیف میں منفی تعلیم کے سلسلہ میں یوں لکھتا ہے۔

"IT Does Not Give Virtue, it Protects For vice, it Does Not Inculcate Truth it Protects From Error."

منفی تعلیم سے بچہ کی جسمانی نشوونما بھی اچھی طرح ہو سکتی ہے کیونکہ یہ آزادانہ نیچرل ماحول میں زیادہ سے زیادہ ترقی کے مواقع فراہم کر سکتی ہے۔ بچہ کو تازہ غذا اور ہوا ملے گی ہر چیز کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملے گا ہر چیز بچہ کے سامنے اصلی صورت میں پیش کی جائے گی جہاں تک دماغی صلاحیتوں کا سوال ہے بارہ سال سے پیشتر اس طرف مطلق توجہ نہیں دی جائے گی۔ کیوں کہ اس سے پیشتر بچہ اچھے اور برے میں تفریق نہیں کر سکتا۔ جہاں تک اخلاقی تعلیم کا مقصد ہے وہ بھی اس کو نیچرل ماحول میں دی جائے گی۔ بچہ کو ہر قسم کی آزادی ہو گی۔ کہ وہ کوئی کام بھی نیچر کے خلاف نہ کرے اگر وہ ایسا کرتا ہے۔ تو نیچر ہی اس کو سزا دے گی۔ مثلاً اگر بچہ ٹھنڈے پانی میں بھیگ جاتا ہے تو خود ہی سزا کا شکار ہو گا۔

اس سلسلہ میں یہ بھی تحریر کر دینا ضروری ہے کہ ابتدائے آفرینش سے تعلیم کے مقاصد کا تعین بالغوں کے نقطہ نظر سے کیا جاتا تھا۔ بچہ کی دلچسپیوں، اس کے ماحول، فطری تقاضوں اور اس کی عمر کا بالکل لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔ روسو کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس فرسودہ طریقہ کے خلاف آواز اٹھائی اور دعویٰ کیا کہ تعلیم سے اگر بچہ کو فائدہ پہونچانا مقصود ہے تو مقاصد تعلیم، نظام تعلیم اور طریقہ ہائے تدریس بچہ کی جبلت، ماحول، فطری تقاضوں اور عمر کے لحاظ سے مرتب کرنے چاہییں ورنہ اس سے ایک طرف تو بچہ کی زندگی تباہ و برباد ہو جاتے

کی اور دوسری طرف معاشرہ کا استحکام بھی خطرہ میں پڑ جائے گا۔

نصاب تعلیم اور ادوار تعلیم: Content of Education & stages of Educatin.

تمام ماہرین تعلیم اور مفکرین تعلیم نے ہمیشہ سے تعلیمی ادوار کو بنیادی مقام دیا ہے افلاطون اور ارسطو بھی ان کو تعلیم کے لئے ضروری اور اہم قرار دیتے ہیں لیکن روسو نے نصاب تعلیم اور ادوار تعلیم پر خاص زاویئے سے بحث کی ہے اسکی بحث اتنی مدلل اور اہم ہے کہ اس میدان میں بھی کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

روسو نے بھی افلاطون کی طرح ہر معاشرے کے لئے مختلف نظام تعلیم مقرر کیا ہے وہ بھی افلاطون سے اتفاق کرتا ہے کہ ہر معاشرے کی ضروریات مختلف ہوتی ہیں جینوا کے لئے وہ اسپارٹا کا نظام تعلیم مقرر کرتا ہے۔ اسپارٹا میں تعلیم و تربیت حکومت کے ذمہ تھی کیونکہ وہاں پر بھی معاشرہ نیچرل افراد پر مشتمل تھا۔ اسی طرح جینوا میں تعلیم و تربیت کی ذمہ داری حکومت کے سپرد کرتا ہے تعلیم ہر شخص کا بنیادی حق ہے جس سے کسی کو محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح فرانس کے لئے وہ دوسری قسم کا نظام تعلیم پیش کرتا ہے روسو نے بھی ایمیل میں افلاطون اور ارسطو کی طرح اعلیٰ طبقے کے بچوں کے لئے تعلیم کا خاکہ پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ادنیٰ طبقے کے بچہ نیچرل صفات سے بھرپور ہوتے ہیں۔ ان میں مساوات، سادگی خودداری اور دیگر صفات جن کی معاشرہ کو ضرورت ہوتی ہے بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ لیکن اعلیٰ طبقہ کے بچے جو ناز و نعم عیش و عشرت اور غیر فطری ماحول میں پرورش پاتے ہیں وہ ان خوبیوں سے نابلد ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کو ایسی تعلیم دی جائے جو ان میں نیچرل اوصاف کی نشوونما کر سکے۔

دورِ اوّل شیر خوارگی: (1. To 5 years) Infancy

اس دور میں بچہ گھر پر ہی تعلیم و تربیت حاصل کرے گا والدین فرائض معلمی ادا کریں گے والدہ بحیثیت نرس خدمت کرے گی۔ اس دور میں وہ اسپارٹا کے نظام تعلیم کی پرزور سفارش کرتا ہے اسپارٹا کے نظام تعلیم میں صرف جسمانی نشوونما ہی مقصد خاص تھا۔ روسو بھی اس خیال سے متفق ہے وہ اس دور میں ایمیل کی جسمانی

نشوونما پر زیادہ سے زیادہ توجہ دینا چاہتا ہے اس کو ہر قسم کی آزادی ہوگی وہ جو چاہے کرے اس دور میں نیچر ہی اس کی معلم ہوگی اور نیچر کے مضامین ہی اس کو پڑھائیں جائیں گے وہ اپنی نیچر کے مطابق جو چاہے وہ کرے گا۔ اس کو کوئی سزا دینے کا مجاز نہیں ہوگا۔ اگر وہ کوئی کام نیچر کے خلاف کرے گا تو خود ہی خمیازہ بھگتے گا۔ اس دور میں اس کو زیادہ سے زیادہ کھیل کھلائے جائیں گے۔ ورزش کرائے جائے گی۔ اخلاقی یا مذہبی تعلیم کی اس دور میں کوئی ضرورت نہیں ہے ہر چیز کو اس کے مشاہدے اور تجربات میں لانے کی کوشش کی جائے گی کیونکہ تعلیم کی افادیت انہی چیزوں پر منحصر ہے اس دور میں بچہ "کیوں" اور "کیسے" سے ناواقف ہوتا ہے وہ خود میں مگن رہتا ہے والدین کا فرض منصبی ہے کہ وہ بچہ کی جسمانی نشوونما پر خاص طور سے توجہ دیں۔ اس کو بہتر غذا اور مناسب آرام و آسائش بہم پہونچائیں۔ اگر ذرا سا بھی نقص نظر آئے اس کو فوراً دور کریں۔

دورِ دوم بچپن: Childhood (From 5 To 12 Years)

دیگر ماہرین تعلیم کی طرح روسو بھی اس کو سب سے اہم دور تصور کرتا ہے اس کا اظہار وہ اپنی جلد دوم میں کرتا ہے اس دور میں ایمیل کو منفی اصولوں کے مطابق تعلیم دی جائے گی۔ اخلاقی تعلیم پر توجہ دی جائے گی جسمانی اور اخلاقی دونوں پہلوؤں کو نیچرل اصولوں کے مطابق پروان چڑھایا جائے گا۔ بچہ کے احساسات اور جذبات کا خیال رکھا جائے گا۔ تعلیم زیادہ سے زیادہ مشاہدات پر مبنی ہوگی۔ اس دور میں بھی اس کو کوئی کتاب نہیں پڑھائے جائے گی۔ اس کو ناپنے تولنے کا موقع دیا جائے گا۔ اس کے سامنے مسائل زندگی پیش کئے جائیں گے۔ تاکہ وہ ان پر فیصلہ کر سکے۔ اس دور میں بچہ کی ضروریات محدود ہوتی ہے۔ اس میں آتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ ضروریات زندگی کی تکمیل کر سکے۔ اس لئے اس کو ایک صلاح کار یا مشیر کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کا معلم ہوگا۔ معلم کا کام بچہ کے ساتھ ہمدردانہ اور مشفقانہ برتاؤ کرنا ہے ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھی خیال رکھنا ہے کہ وہ کسی چیز کے بارے میں غلط خیالات تو قائم نہیں کر رہا ہے اگر ایسا ہو تو معلم کا فرض ہے کہ وہ فوراً ان کا تدارک کرے۔

دورِ سوم عنفوانِ شباب: Adolescence (From 12 To 15 Years)

اس دور میں بچہ کی طاقت اس کی ضروریات زندگی سے تجاوز کر جاتی ہے۔ یہ دور

بے چینی اور تجسس کا ہے۔ بچہ ہر چیز کے بارے میں جاننا چاہتا ہے اس میں خود نمائی اور خود شناسی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں روسو اس دور میں ایمیل کے لئے صرف ایک کتاب "Robinson Crusoe" کی سفارش کرتا ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جو بچے کی عکاسی کرتی ہے اس میں زندگی کو حقیقی رنگ میں پیش کیا گیا ہے یعنی ہر چیز عملاً پیش کی گئی ہے اس کتاب کی تدریس سے ایمیل میں لاتعداد اوصاف پیدا ہو سکتے ہیں اس دور میں پیشہ ورانہ تعلیم پر بھی توجہ دی جائے گی لیکن اس چیز سے گریز لازمی ہے کہ کون سا پیشہ اچھا ہے اور کیوں؟ تمام پیشے اپنی اپنی انفرادیت کے حامل ہوتے ہیں اس دور میں بھی جذبات زیادہ نمایاں نہیں ہوتے البتہ بچہ اسباب نتائج کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتا ہے احساسات اور جذبات میں تبدیلی شروع ہو جاتی ہے ہر چیز کو جاننے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے وہ اس دور میں خیالی پلاؤ بھی پکانے لگتا ہے۔ کبھی کبھی آئندہ زندگی کے بارے میں بھی سوچتا ہے لیکن یہ تمام خیالات حقیقت اور اچھائیوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس دور میں معلم کو کافی محتاط رہنے کی ضرورت ہے اس کو بچہ کی ہر نقل و حرکت پر نظر رکھنی چاہیئے۔ اور جیسے ہی دیکھے کہ وہ راستہ سے بھٹکنے والا ہے تو فوراً پیار و محبت سے راہِ راست پر لانے کی کوشش کرے۔

دورِ چہارم جوانی: (From 15 To 20) Manhood

اس دور میں ایمیل کو اصول تناسل سے روشناس کیا جائے گا۔ تنہائی انفرادیت اور اصول فطرت صرف نسبتی ہے ان کا اصل مقصد تصوراتی ہے۔ اعلیٰ ترین نیکیوں مثلاً ہمدردی، فیاضی، دوستی، مساوات، شکرگزاری اور جذبۂ انصاف کو نشوونما دینا اس دور کی اہم خصوصیات ہیں۔ معاشرتی زندگی کے لئے ان تمام خوبیوں کی ضرورت ہے بچہ محسوسات کی دنیا میں زندگی بسر کرتا ہے سماجی اور مذہبی زندگی کو وہ نہیں سمجھ سکتا رہ جاتی۔ اخلاقی فنی اور فلسفی دنیا ابھی ایمیل کی فہم سے بالاتر ہے لیکن انسان اور حیوان کی تفریق انہیں صفات پر منحصر ہے۔ چنانچہ اس دور میں وہ مندرجہ بالا خوبیوں کا مشورہ دیتا ہے۔ یہ جذبات، نفسیات عمرانیات اخلاقیات اور سیاسیات کے مطالعہ سے اجاگر کئے جا سکتے ہیں۔ اس دور میں وہ ادب سوانح عمریاں، سماجی تاریخ کی بھی سفارش کرتا ہے۔

ایمیل کو شفاخانوں اور جیل خانوں کی بھی سیر کرائی جائے گی تاکہ اس میں جذبہ ہمدردی پیدا ہو سکیں وہ آخر میں Bacon کی طرح ایمیل کو سیاحت کا بھی مشورہ دیتا ہے، کیونکہ اس سے بھی علم میں اضافہ ہوتا ہے اس دور میں بھی وہ معلم کو خاموشی کی تلقین کرتا ہے اسی دور میں ایمیل فرانس آجاتا ہے کیونکہ اب اس کو مکمل شہری بنانا ہے۔

تعلیم نسواں Education of women

پانچویں جلد میں روسو نے تعلیم نسواں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جس طرح اس نے ایمیل ایک فرضی کردار اپنایا تھا اسی طرح صوفیہ Sophie نام کی ایک فرضی لڑکی کو پیش کرتا ہے۔ ایمیل اب جوان ہو چکا ہے اس لئے اس کی شادی کرنا ضروری ہے اس کی شریکِ حیات میں جو خوبیاں وہ پسند کرتا ہے ان کو بذریعہ تعلیم وہ صوفیہ میں پیدا کرے گا جہاں تک خوبیوں کا سوال ہے تو روسو نے کافی زور دیا ہے لیکن تعلیمی نظریات بہت ہی مایوس کن ہیں۔ وہ ارسطو کا ہمنوا نظر آتا ہے چنانچہ عورتوں کے لئے وہ تعلیم کو بالکل ضروری خیال نہیں کرتا کیونکہ نیچر نے لڑکیوں کو لڑکوں سے مختلف بنایا ہے ان کا کام صرف مردوں کو خوش کرنا۔ اولاد کو پالنا اور مردوں کی خدمت گزاری اور بچوں کی تعلیم و تربیت و نگرانی ہے۔ ارسطو اور روسو میں فرق ہے کہ اول الذکر عورتوں کے لئے معمولی تعلیم کو ضروری خیال کرتا ہے جبکہ موخر الذکر ان کو بالکل ناخواندہ پسند کرتا ہے چنانچہ وہ اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو ایمیل صفحہ ۸۷

"A woman of culture is the Plague of Her Husband, Her children Her Faimily, Her Servants - Every Body."

طریقۂ تعلیم Method of Teaching

جہاں تک طریقۂ تعلیم کا سوال ہے تو اس کے مندرجہ ذیل خیال سے اس کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔

"Why Not, Begin By Showing him the object itself, so that He may Know, at Least, what you are Taking About,'
(EMILE. P. 137)

اس کے آگے پھر کہتا ہے۔

"The master Ought not to Give Precepts, But Should cause His Pupil To Find Them,
(Emile P. 20)

جیساکہ پیشتر تحریر کیا جاچکا ہے کہ روسو نیچر کو ہی سب سے بہتر طریقہ تدریس کہتا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے کہ نیچر کی عظیم الشان کتاب کا ایمیل کو مطالعہ کرایا جائے گا اور پھر اس کو حواس خمسہ اور جسم اور دماغ کو کام میں لانے کا موقع دیا جائے گا۔ بچہ کو کوئی کتاب نہیں پڑھائی جائے گی۔ بلکہ اس کو ایسے مضامین سے دور ہی رکھا جائے گا جن کو مشاہدہ میں لانا ناممکن ہو۔ مثلاً فلسفہ اور مذہب وغیرہ ایمیل کو زیادہ سے زیادہ خود ہی سیکھنے اور سمجھنے کا موقع دیا جائے گا اگر معلم ہر جگہ دخل اندازی کریگا تو بچہ کی نشوونما رک جائے گی۔ معلم کو بچہ کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں میں توازن کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

آخر میں روسو اس چیز سے بحث کرتا ہے کہ تعلیم کہاں پر دی جائے گی اور کون دے گا۔ ایتھنز اور اسپارٹا کے نظام تعلیم کی طرح روسو بھی پہلے گھر اور پھر اسکول کی سفارش کرتا ہے تعلیم کہیں پر بھی دی جائے اس سے اچھے اور برے دونوں قسم کے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ تعلیم و تربیت سے فائدہ ہر حال میں مملکت کو پہونچتا ہے اس لئے مملکت کا فرض منصبی ہے کہ اپنی نگرانی میں ایسے قوانین کے تحت تعلیم کا معقول اور مناسب انتظام کرے مقصد تعلیم بچہ میں خوبیاں نیکیاں اور اچھائیاں پیدا کرنا ہے۔

ابتدا ہی سے تعلیمی ڈھانچہ اس طرح مرتب کرنا چاہیئے جس سے بچوں میں تنظیم مساوات اور اخوت کے جذبات پیدا ہوسکیں دس سال کی عمر میں ایک فرانسیسی بچہ کو ہر لحاظ سے فرانسیسی ہونا چاہیئے۔ چنانچہ سب سے پیشتر اس کو ملکی حالات سے روشناس کرانا جائے جب وہ پندرہ سال کی عمر کو پہونچے تو اس کو ملک کی تاریخ کا مطالعہ سولہ سال کی عمر میں ملکی قوانین مشاہیر کے کارنامے اور اسی قسم کی دوسری چیزوں سے آگاہ کیا جائے۔ گھر یا اسکول تو بے معنی چیزیں ہیں اصل چیز تو وہ اوصاف ہیں جو تعلیم سے مقصود ہوں

معلمی کے بارے میں روسو کے خیالات بالکل اسلامی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس مقدس کام کو پیشے کے نام سے پکارنا اس کی توہین ہے یہ تو مشنری کام ہے جس کا صلہ اس دنیا میں نہیں بلکہ عاقبت میں ملتا ہے کسی شخص کا معلم ہونا اللہ تعالےٰ کا سب سے بڑا انعام ہے یہ پیغمبرانہ کام ہے دوران تدریس معلم کو بچہ کی نیچر، عادت اور ماحول کا خیال رکھنا چاہیئے بچہ کو مشغول رکھنا اس کو چست و چالاک بنا دیتا ہی اصلی تعلیم ہے وہ والدین کو قدرتی اساتذہ کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

ایمیل کے لیئے وہ پیشہ ورانہ تعلیم کی مذمت کرتا ہے کیونکہ اس کا تعلق امیر طبقہ سے ہے ایمیل وحشی ہے اس لیئے وہ اس کو جنگل میں لے جاتا ہے دیہاتی زندگی تصنع سے پاک اور نیچر ماحول پر منحصر ہوتی ہے اس طرح ایمیل فطرت کے آغوش میں فطری صلاحیتوں کے مطابق تعلیم حاصل کرے گا معلم کو ہر چیز کو عملاً پیش کرنا چاہیئے، اشیاء کی بجائے الفاظ کا سہارا بچوں کو گمراہ کر دیتا ہے۔ کیوں کہ وہ الفاظ میں گم ہو کر اصلیت کو فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ الفاظ کا زیادہ استعمال بچوں کو باتونی بنا دیتا ہے معلمین سے وہ امید کرتا ہے کہ وہ بچوں سے زیادہ سے زیادہ عملی کام کرائیں مثلاً چارٹ بنوانا، نقشے، گلوب تیار کرانا جب وہ ان چیزوں کو تیار کریں گے تو ان کی تعلیم ٹھوس بنیادوں پر ہوگی۔ اسباق سے دلچسپی اور تعلیم سے شوق پیدا ہوگا۔ بچہ کی تعلیم اس کے ذاتی تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہونی چاہیئے دوسرے لوگوں سے حاصل کرنے کا نام علم نہیں بلکہ نقالی ہے تعلیم کو باہر سے داخل نہیں کیا جا سکتا یہ تو داخلی چیز ہے داخلی خوبیوں کو اجاگر کرنا ہی اصل تعلیم ہے۔ طریقہ تعلیم بچوں کے آزاد اور فطری مشاغل ہونے چاہیں جو ماحول سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور بچہ کی ضروریات اس کی محرک ہوتی ہیں تعلیم اصل میں عمل سے راہنمائی ہے۔ عمل میں اضافہ نہیں۔ نیچرل طریقہ تعلیم یہ ہے کہ ضرورت عملی تجربہ اور نیچر کی تکمیل کی جائے۔

ہم نے مندرجہ بالا روسو کے افکار و خیالات کا اجمالاً تذکرہ کر دیا ہے تفصیلی مطالعہ کے لیئے شوقین حضرات چند عظیم مفکرین تعلیم کا مطالعہ فرمائیں۔ جہاں تک تبصرے کا سوال ہے تو صرف ہم سرخیاں ہی تحریر کرنے پر اکتفا کر رہے ہیں کیونکہ مضمون کافی طویل ہو چکا ہے اس کا تفصیلی جائزہ مندرجہ بالا کتاب سے کیا جا سکتا ہے۔

روسو کے افکار و نظریات سے تعلیم میں نفسیاتی تحریک شروع ہوئی۔ اگر ہم یوں

کہیں کہ موجودہ نفسیات کا بانی روسو ہی تھا تو مبالغہ نہ ہوگا کیونکہ وہی پہلا مفکر اعظم ہے جس نے بچہ کی نفسیات کو تعلیم کے لئے لازمی قرار دیا۔ اس سے پیشتر بچہ کی دلچسپیوں، اس کے جذبات، جبلت اور فطرت کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ معلم کی حیثیت ڈکٹیٹر کی سی ہوتی ہے روسو نے اس کے خلاف جہاد کیا اس نے کہا کہ معلم کا رویہ بچہ کے احساسات جذبات اور جبلتوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہونی چاہیئے۔ کیونکہ بالغوں کا طرز فکر بچہ کے لئے بالکل بیکار اور لغو ہوتا ہے آج دنیا کے تمام ترقی پسند ممالک میں بچہ کی نفسیات کو ہی بنیاد قرار دیکر تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جارہا ہے سینکڑوں قسم کی ریسرچز ہو رہی ہیں، تمام تربیتی اداروں میں معلمین کو تعلیمی نفسیات پڑھنا لازمی ہے تاکہ جب وہ عملی زندگی میں داخل ہوں تو زیادہ سے زیادہ نفسیات کو کام میں لاکر بچوں کو تعلیم دیں اس تحریک نے ویسے تو تمام دنیا پر اپنے اثرات قائم کئے ہیں لیکن انگلستان، فرانس، جرمنی، اور امریکہ میں اس پر کافی کام کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ویسے تو کافی لوگوں نے کام کیا ہے اور کر رہے ہیں لیکن ہم پستالوزی کو نفسیاتی تحریک کے علم بردار کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں۔

ہینرک پیستالوزی اور تحریک نفسیات

Heinrich Pestalozzi (1746 - 1827)

تحریک نفسیات میں پیستالوزی ایک خاص مقام کا مالک ہے صدیوں تک ارسطو کو باپائے نفسیات کا مقام حاصل رہا لیکن زمانہ کی ترقی کے ساتھ ہی ساتھ اس کے افکار و نظریات کا اثر کم ہوتا گیا جس کی خاص وجہ اس کے خیالات کو بنیاد مان کر لاتعداد مفکرین منظر عام پر آتے رہے جنہوں نے علم نفسیات پر مختلف زاویوں سے نظر ڈالی۔ اور آخر میں اس علم کو بھی انفرادی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ارسطو کے زمانہ سے لیکر اٹھارہویں صدی تک نفسیات کا مفہوم یہ نہیں تھا۔ جو آج ہے لیکن اس ضمن میں یہ تحریر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ ان مفکرین نے بھی انسانی دماغ کے تمام پہلوؤں پر غور و خوض کرنے کے بعد جو کچھ بیان کیا تھا۔ وہ آج بھی صداقت اور حقیقت کا حامل ہے۔

تحریک نفسیات کے مقلدین نے طریقہ ہائے تدریس کو مرکز قرار دے کر اپنی عمارت

کی تعمیر و تشکیل کی۔ انہوں نے کہا کہ طریقہ ہائے تدریس اس قسم کے ہونے چاہیں جس سے بچہ کی خوابیدہ صلاحیتوں کو آسانی سے پروان چڑھایا جا سکے۔ ذہنی صلاحیتوں کی نشو و نما تعلیم میں مشاہدہ اور تجرباتی طریقوں کی مدد سے تعلیم دینا اور بچہ کی متوازن نشو و نما کرنا لازمی ہے۔

(پیستالوزی سوئٹزرلینڈ میں پیدا ہوا تھا۔ اسکول اور کالجوں کی تعلیم سے فراغت کے بعد اس نے Burgdorf اور Yuerdun Neuhof میں اسکول کھولے جن کو بعد میں بند کر دینا پڑا۔ اس کے بعد اس نے تصانیف و تالیف کا کام شروع کیا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اس کی سب سے مشہور تصنیف "How Gertrude Teaches her children" ہے جس میں اس نے اپنے تعلیمی خیالات کا وضاحت سے تذکرہ کیا ہے لیکن جب اس کو ہر جگہ ناکامی ہوئی تو اس نے بحیثیت معلم کام شروع کر دیا۔)

مقاصد تعلیم Aims of Education

(پیستالوزی کا خیال تھا کہ معاشرہ کی اصلاح اور بقا جب ہی ممکن ہے جب کہ ہر بچہ کو اس کی صلاحیتوں کے مطابق تعلیم دی جائے تعلیم صرف پڑھنا، لکھنا سیکھنے کا نام ہی نہیں ہے بلکہ ان تمام پیشوں کی تربیت بھی لازمی ہے جن کی معاشرے کو ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس نے فنی زرعی اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنا بھی تعلیم کا اہم مقصد قرار دیا۔ پیستالوزی نے ارسطو اور روسو کے برعکس اس بات پر بھی زور دیا کہ تعلیم ادنیٰ طبقہ میں عام ہونی چاہیئے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ عوام کو تعلیم کی افادیت اور اہمیت سے آگاہ کر دیا جائے ساتھ ہی ساتھ اس نے تعلیم کو نفسیاتی بنیادوں پر استوار کرنے کی بھی کوشش کی پیستالوزی عملی انسان تھا۔ اور وہ اپنے خیالات اور نظریات کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا چنانچہ اس نے تجرباتی اسکول قائم کیے جو بورڈنگ ہاؤس بھی تھے۔ ہر ایک میں ڈیڑھ سو سے لیکر دو سو تک طلبہ تھے ان میں فرانس، جرمنی، اٹلی، پولینڈ اور انگلینڈ سے بھی آکر بچوں نے داخلے لئے تھے۔ اکثریت سوئٹزرلینڈ کے بچوں کی تھی۔ ذریعہ تعلیم جرمنی اور فرانسیسی تھا)

فرد کی ترقی ہی معاشرہ کی ترقی ہے۔ بالفاظ دیگر پیستالوزی نے انسانی اخلاقی کی تعمیر و تشکیل کو انسانی شخصیت کی بہتری کا اصول قرار دیا اور کہا کہ یہ خوبیاں بذریعہ تعلیم ہی پیدا ہو سکتی ہیں۔ وہ اس بات کی بھی پرزور سفارش کرتا ہے کہ تعلیم کا مقصد افراد میں اپنی مدد آپ کا جذبہ پیدا کر دینا بھی ہے اگر تمام افراد میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے تو معاشرہ خوبیوں سے پر ہو جائے گا۔ فرد معاشرتی تعلقات کی وجہ سے بے کس و مجبور ہو جاتا ہے۔ اس لئے وہ ہر معاملے میں دوسرے کی طرف دیکھتا ہے جس سے اس کی اپنی صلاحیتیں ماند پڑ جاتی ہیں اور پھر معاشرہ میں برائیاں جنم لینا شروع کر دیتی ہیں۔ پیستالوزی کہتا ہے کہ قدرت نے ہر شخص میں اچھائیاں اور برائیاں ودیعت کی ہیں۔ معاشرہ کا کام یہ ہے کہ ہر بچہ کی خوبیوں کو معلوم کر کے ان کی بالیدگی کی کوشش کرے اور برائیوں کو دور کرنے کے لئے ماحول پیدا کرے اس مقصد کی تعمیر و تشکیل بھی بذریعہ تعلیم ہی ممکن ہے اس لئے معاشرہ تعلیم کے لئے سازگار ماحول پیدا کرے تاکہ ہر بچہ زیادہ سے زیادہ اپنی خوبیوں کو پروان چڑھا سکے جو معاشرے اور فرد دونوں کے لئے افادیت کا حامل ہے۔

(تعلیم کا بنیادی مقصد بقول پیستالوزی پاک وصاف اور خوشگوار زندگی گزارنا ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے بچہ کی متوازن نشوونما ضروری ہے چنانچہ بچہ کی خوابیدہ صلاحیتوں کو اس طرح جلا دی جائے کہ وہ معاشرے کے لئے مفید ثابت ہو سکے چنانچہ اصلاحات میں سب سے اہم پہلو تعلیمی ہونا چاہیئے کیونکہ یہی وہ آلہ ہے جس سے انسان نیک و بد میں تفریق کر سکتا ہے چنانچہ وہ تعلیم کا مقصد۔

Education, "The Natural, Progressive and Harmonious Development of All The powers and Faculties of Human Beings."

یعنی سب سے اہم مقصد جسمانی، اخلاقی اور ذہنی نشوونما میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہے اس میں دل و دماغ اور ہاتھ تینوں کو شریک ہونا چاہیئے علم کو عمل سے محروم نہیں ہونا چاہیے)

نصاب تعلیم اور ادوار تعلیم : Content & Stages of Education

جیسا کہ بیشتر تحریر کیا جا چکا ہے کہ نفسیاتی تحریک کے حامیوں نے طریقہ ہائے

تدریس کو ہی اپنا مرکز مان کر تعلیم میں اصلاحات کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں پیستالوزی کے ایک تجرباتی اسکول کو پیش کیا جاتا ہے تاکہ ناظرین اس کے خیالات سے مستفیض ہو سکیں۔

پیستالوزی نے جو تجرباتی اسکول قائم کئے تھے ان میں عموماً ۶ سال سے ۱۸ سال تک کی عمر کے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ وہ بمعہ اپنی شریک حیات اور غیر شادی شدہ اساتذہ کے اسکول میں ہی رہتا تھا اسکول کا گھریلو ماحول تھا کیونکہ پیستالوزی گھر کو سب سے پہلا مدرسہ خیال کرتا تھا کیونکہ خاندانی زندگی سب سے بہتر معاشرتی اور فطری صفات استوار کرنے کا مرکز ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پر اخلاقی، سماجی، سیاسی زندگی کی بنیادیں قائم ہوتی ہیں مختصراً گھریلو تعلیم سے ہی بچہ کی شخصیت کے ہر پہلو کی نشو و نما ہو سکتی ہے۔ اسی وجہ سے پیستالوزی نے گھر اور اسکول میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے کچھ اساتذہ طلبہ کے ساتھ ان کے کمروں میں سویا کرتے تھے تاکہ وہ طلبہ کو بروقت ہدایت دے سکیں۔ تمام طلبہ موسم گرما میں ساڑھے پانچ بجے اور موسم سرما میں چھ بجے اٹھتے تھے۔ آدھ گھنٹہ ان کو ضروریات اور لباس کی تبدیلی کے لئے ملتا تھا۔ چھ سے سات بجے تک صبح کی عبادت جو درس اول کہلاتا تھا۔ اس کے بعد نہانا دھونا۔ پھر ناشتہ وغیرہ آٹھ بجے سے دس بجے تک درس و تدریس ہر پیریڈ ایک گھنٹہ کا ہوتا تھا۔ ابتدا مشکل مضامین سے ہوتی تھی اور جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا۔ آسان سے آسان تر مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ مثلاً سب سے پیشتر حساب، دس بجے کے بعد ان کو ناشتہ دیا جاتا تھا اور پھر درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو بارہ بجے تک جاری رہتا تھا۔ بارہ سے ساڑھے بارہ بجے تک وقفہ اس میں وہ دوپہر کا کھانا کھاتے پھر معمولی سا کھیل کود، ڈیڑھ بجے سے پڑھائی کا سلسلہ شروع ہو جاتا جو رات کے آٹھ بجے تک جاری رہتا آٹھ بجے سے نو بجے تک رات کی عبادت اور پھر رات کا کھانا اس طرح نو دس گھنٹہ درس و تدریس کے لئے مقرر تھے۔

دوران تدریس پیستالوزی کے اصولوں کو اپنایا جاتا تھا۔ مثلاً بچوں سے دماغی کام کم سے کم لیا جائے مشکل مضامین ابتدا میں اور آسان مضامین مثلاً موسیقی،

ڈرائینگ اور جسمانی ورزش وغیرہ آخر میں کھیل کود بھی تعلیم کا ہی حصہ تصور کئے جاتے تھے۔ بلکہ کوشش کی جاتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ مضامین کو کھیل کود کے ذریعہ سکھایا جائے۔ بدھ اور ہفتہ کو آدھے دن کی چھٹی رہتی تھی۔ ان اوقات کو خاص طور سے پکنک میں استعمال کیا جاتا تھا۔ پروگرام میں حسب ضرورت تبدیلی بھی کر لی جاتی تھی۔ اسکول کی زندگی نہایت سادہ اور خوشگوار تھی۔ ہر معاملہ میں فطری باتوں کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ تیرنا بھی نصاب میں شامل تھا بعض اوقات پیستالوزی کھیل کود میں اس قدر مگن ہو جاتا کہ رات کے دس بجے تک یہی سلسلہ جاری رہتا تھا۔

اسکول کی تنظیم نہایت سادہ اور فطری تھی ۸ سال سے کم عمر بچوں کو پرائمری جماعتوں میں رکھا جاتا تھا۔ ثانوی جماعتوں کو پھر دو حصوں میں منقسم کر دیا گیا تھا۔ ۸ سے ۱۱ سال اور ۱۱ سے ۱۸ سال نصاب تعلیم اور نظام الاوقات کو اس طرح ترتیب دیا گیا تھا۔

ابتدائی جماعتیں		ثانوی جماعتیں	
نیچرل اسٹڈی	۲ گھنٹہ فی ہفتہ	نیچرل تاریخ	۲ گھنٹہ فی ہفتہ
آرٹ	" " "	ٹیکنالوجی	" " "
جغرافیہ	" " "	ریاضی	۶ " "
دیہات کا علم	" " "	جیومیٹری اور ڈرائینگ	۴ " "
ریاضی	۶ " "	لسانیات	۴ " "
ڈرائینگ	۴ " "	موسیقی	۳ " "
زبان	۶ " "	دینیات	۹ " "
گانا	۳ " "		
دینیات	۶ " "		

اسکول کے ماحول کو مشفقانہ اور پدرانہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی تھی۔ پیستالوزی سختی اور سزا کے سخت خلاف تھا۔ تمام معلمین کو حکم تھا کہ وہ کسی طالب علم کو سزا نہیں دے سکتے البتہ خاص موقعوں پر پیستالوزی خود ہی سزا دیا کرتا تھا۔ جس کے لئے شام کو ایک جلسہ ہوتا تھا جس میں پہلے بچوں کے سامنے اخلاق مذہب اطاعت و فرمانبرداری پر وہ تقریر کرتا تھا۔ تاکہ بچہ اپنی غلطی محسوس کر سکے اور پھر اس کو معمولی

سزا دیا تھا۔

طریقہ تعلیم Method of Teaching

مندرجہ بالا سے پیستالوزی کے طریقہ ہائے تدریس کا اجمالاً اندازہ ہو گیا ہو گا۔ اب ہم ان اصولوں پر روشنی ڈال رہے ہیں جن کو وہ تدریس کے لئے لازمی خیال کرتا تھا۔ تعلیم کا مقصد اولیٰ بچہ کی تمام قوتوں کی نشوونما کرنا ہے اور جب ہی ممکن ہے کہ دوران تدریس ان میں توازن برقرار رکھا جائے ہمارے نظام تعلیم کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ ہم دماغ و دل اور ہاتھ کو جسم کے مختلف اعضا سمجھتے ہیں اور ہر ایک کی ترقی و منزل کو بھی دوسرے کے بغیر ناگزیر ہے۔

اس لئے بہترین طریقہ تدریس وہ ہے جس میں یہ تینوں ساتھ ساتھ شریک ہوں اگر ایسا ہو گا تو متوازن شخصیت کی تعمیر ممکن ہے ورنہ نہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پیستالوزی کہتا ہے کہ ابتدا میں تعلیم جنرل ہونی چاہیئے اپنی ابتدائی تقریروں اور تحریروں میں اس نے تعلیم کو انفرادی نقطہ نظر سے پیش کیا تھا جس میں گھریلو معاملات۔ زرعی تعلیم اور صنعت و حرفت کی تدریس پر بھی زور دیا ہے لیکن کچھ عرصہ بعد اس کے اپنے خیالات میں تبدیلی کرنی پڑی اور پھر کہتا ہے کہ اس سے پیشتر کہ بچہ کو کسی قسم کی تعلیم دی جائے بچہ کی عام فطری صلاحیتوں کو اجاگر کرنا چاہیئے۔ اور پھر رفتہ رفتہ بچہ کی توجہ کسی خاص مضمون کی طرف مرکوز کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ بالفاظ دیگر اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں۔ عام سے خاص کی طرف پیش قدمی کرنا چاہیئے From General To Particular اس خیال کو اس نے افلاطون، کانٹ اور روسو سے ہی حاصل کیا تھا۔

پیستالوزی نے اس بات پر بھی توجہ دی کہ وہ کس طرح دماغ کے افعال کا پتہ لگا سکے اس سلسلہ میں اس کو کافی کامیابی بھی ہوئی۔ وہ اپنی ساری عمر اس پر تحقیق کرتا رہا۔ چنانچہ وہ اس بات کا حامی تھا کہ تعلیم کا مقصد معلومات میں اضافہ نہیں بلکہ ان صلاحیتوں اور قوتوں میں اضافہ ہے جو ان کی محرک ہوتی ہیں بالفاظ دیگر وہ علم کو بچہ پر ٹھونسنے کے خلاف تھا بلکہ بچہ میں ان صلاحیتوں کو پیدا کرنا کہ وہ خود بخود آگے کی طرف پیش قدمی کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"I Tried More To Develop The Inner Capacity of the child than to Produce Isolated Results" (Green J.A. P. 348)

ہمارا مقصد حیات یہ ہونا چاہیئے کہ بچہ کی پوشیدہ صلاحیتوں کا پتہ لگا کر ان کو پروان چڑھانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ مختلف مضامین کو ہم مختلف ذرائع تصور کرتے ہیں جب کہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ ہم ہمیشہ بچہ کے علم میں اضافہ کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ ہم کو اس کی خوابیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ جب تک ہمارا مقصد بچہ کی ہمہ گیر نشوونما نہیں ہوگا تعلیم سے کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا تعلیم خود رو پودا ہے جو بچہ کی سرگرمیوں سے پرورش پانا شروع کرتا ہے اور یہ ساری عمر پرورش پاتا رہتا ہے یہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ مروجہ طریقہ تعلیم میں سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ وہ بچہ کو اخلاقی اور مذہبی معلومات کے سلسلہ میں رہبری تو ضرور کرتا تھا لیکن عمل سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

بچہ کی تمام صلاحتیں خود بخود اندر سے ابھرتی ہیں کیونکہ ان کو ابھارنے کی محرک خود نیچر ہے جو وقت مقررہ پر اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ یہ خیال کرنا کہ ہر صلاحیت ماحول کی پیداوار ہے غلطی پر مبنی ہے اس کو ہم شاہ بلوط کے پودے سے تشبیہ دے سکتے ہیں جس طرح ایک دانہ رفتہ رفتہ پودے کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کی بالیدگی نظر نہیں آتی لیکن وہ ہر وقت بڑھتا رہتا ہے اور اس کی بالیدگی کا احساس کرنا مشکل ہے یہی بات بچہ کے ساتھ بھی ہے۔ بچہ کی اس فطری بالیدگی کو مدنظر رکھ کر پیستالوزی نے اپنی پوری عمارت کی تعمیر وتشکیل کی ہے۔

(تعلیم کا اہم اور بنیادی اصول بتدریج ہے فطرت جست نہیں کرتی بلکہ آہستہ آہستہ ترقی کی طرف گامزن رہتی ہے جس میں بچہ کی عمر کا خاص حصہ ہوتا ہے اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے تعلیم بھی بتدریج ہونی چاہیئے۔ اس لئے تعلیم کو بھی بچہ کی زندگی کی طرح ادوار میں تقسیم کر دینا لازمی اور ضروری ہے نصاب تعلیم مقرر کرتے وقت بچہ کی عمر اس کا ماحول اور ذہنی صلاحیتوں کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیئے چنانچہ

ابتدا میں بچہ کو آسان اور پھر مشکل مضامین کا درس دینا چاہیئے۔

"From simple To Difficult"

پیستالوزی کہتا ہے کہ طریقہ تدریس میں اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ معلومات سالقہ پر جب بچہ عبور حاصل کرے تو اس کے علم میں اضافہ کی کوشش کرنی چاہیئے ساتھ ہی ساتھ معلومات سالقہ کو موجودہ اسباق سے مربوط بھی کر کے آگے بڑھنا چاہیئے۔

"From Past To Present"

آخر میں وہ طریقہ تدریس سے نہایت نفسیاتی اور منطقی طریقہ سے بحث کرتا ہے اس سلسلہ میں وہ روسو کا ہمنوا ہے وہ کہتا ہے کہ سب سے بہترین طریقہ تدریس فطری ہے اس لئے بچہ کی قوتوں اور صلاحیتوں کی نشوونما فطری اصولوں کے مطابق ہونی چاہیئے۔ معلم کے فرائض کے سلسلہ میں اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"It is like the art of the Gardener under whose case a thousand trees Blossom and Grow."

پیستالوزی اس بات کا متمنی تھا کہ حواس خمسہ کو بنیاد مان کر ہر ماں اپنے بچہ کو اخلاقی اور معاشرتی خوبیوں سے بہرہ ور کرے۔ اسی وجہ سے The Book for mothers کی پرزور سفارش کرتا ہے لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ اس سے بھی مطمئن نہیں تھا۔ چنانچہ وہ پھر کہتا ہے کہ طریقہ تدریس بہت میکانکی سادہ اور مکمل ہونے چاہیں تاکہ ہر ماں ان کو آسانی سے اپنا سکے۔

پیستالوزی کا نے Perception ادراک اور Conception تصور کے باہمی رشتہ کو بھی بیان کیا ہے جس کو ہم بوجہ طوالت نظر انداز کر رہے ہیں۔

پیستالوزی نے دعویٰ کیا ہے کہ اشیاء امدادی Audiovisualaids کی مدد سے اسباق پڑھانے چاہیں کیونکہ ان کی مدد سے اس کے علم میں اضافہ بہ آسانی ہو سکتا ہے چنانچہ ایسی امدادی اشیاء کا انتخاب کیا جائے جو بچہ کے مشاہدات اور تجربات سے قریب ترین ہوں۔ اسی خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے مفروضی اسباق object

Lessons کے طریقہ کو اپنایا جس کی اہمیت اور افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

پیستالوزی نے طریقہ تدریس میں اصول معلوم سے نامعلوم From Known To Unknown کو بھی اپنایا ہے۔ اس سے پیشتر طریقہ یہ تھا کہ بچہ کو وہ مضمون پڑھاؤ جن کو وہ نہیں جانتا۔ پیستالوزی نے اس کے خلاف احتجاج کیا اور کہا کہ یہ فطرت اور اصول تدریس کے منافی ہے۔ ہونا یہ چاہیئے کہ جن باتوں کو بچہ جانتا ہے ان کو بنیاد قرار دیکر ان باتوں کی طرف پیش قدمی کی جائے جن کو وہ نہیں جانتا۔ اس معلوم اور نامعلوم میں ارتباط ہونا لازمی ہے۔ اس نے A.B.C. Observation طریقے کو ایجاد کیا جس کی بہت ہی زیادہ افادیت ہے۔

پیستالوزی کے طریقہ تدریس کی ایک خوبی Concrete Preceeds Abstract ہے یعنی مادی اشیار سے ہمیشہ غیر مادی اشیار کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیئے۔ کیونکہ مادی اشیار بچہ کے خیالات مشاہدات اور تجربات سے قریب ہوتی ہیں اور ان کو آسانی سے پیش کیا جا سکتا ہے زبان یا الفاظ صرف نکات کی حیثیت کے حامل ہیں اس لئے جب تک ان کو عملی شکل میں پیش نہیں کیا جائے گا ان کی کوئی قیمت نہیں ہوگا

پیستالوزی کی سب سے عظیم دریافت نامیاتی نشوونما Organic Development ہے۔ اس خیال کے مطابق بچہ ایک پودا ہے جس کی فطری صلاحیتیں کچھ اصول و ضوابط کے مطابق جلا پاتی ہیں اگر ہم تاریخ عالم پر نظر ڈالیں تو ہم کو پتہ چلے گا کہ اس سے پیشتر بھی بہت سے مفکرین نے اس پر خیالات کا اظہار کیا تھا لیکن پیستالوزی کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس کو نہایت ہی اچھوتے پیرائے میں بیان کیا ہے اس وجہ سے اس کو اس کا بانی مبانی خیال کیا جاتا ہے اس نے اپنی تصانیف میں اس خیال کو متعدد بار دہرایا ہے کہ جس طرح ایک پودے کی نشوونما خود بخود ہوتی ہے نگراں کا کام پانی اور کھاد بہم پہونچانا ہے ساتھ ہی ساتھ اس بات پر بھی توجہ دینی ہے کہ ان چیزوں میں اعتدال برقرار رہے۔ یہی معاملہ بچہ کا ہے معلم کی حیثیت بالکل مالی جیسی ہے۔

انیسویں صدی عیسوی تاریخ عالم میں خاص افادیت اور اہمیت کی حامل ہے اسی صدی میں سائنس کی ترویج اور ترقی نے انسانی زندگی میں انقلاب عظیم برپا کر دیا سائنسی

ایجادات نے انسانی زندگی کے ہر پہلو پر اثر ڈالا۔ ساتھ ہی ساتھ مصنفین نے بھی اس ترقی میں خاطر خواہ کردار ادا کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی ممالک میں سائنس کا مطالعہ سولھویں صدی سے ہی شروع ہو چکا تھا لیکن قدامت پسندوں اور کلیسا کے علم برداروں کی مخالفت سے اس کو مناسب ترقی کے مواقع نصیب نہ ہو سکے سائنس جہالت توہم پرستی اور تعصب کے خلاف ہے نیوٹن نے مسئلہ کشش اور ڈارون نے اصول ارتقا کو دریافت کیا۔ بالفاظ دیگر سائنس کی حیرت انگیز ترقی نے بنی نوع انسان کے افکار و خیالات اور طرز معاشرت کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ جہاں تک تعلیم کا سوال ہے تو یہ بھی بدلتے ہوئے حالات سے کافی متاثر ہوئی روسو کے مقلدین پہلے ہی تین طبقوں میں منقسم ہو چکے تھے جن کی وجہ سے تین تحریکیں وجود میں آچکی تھیں۔ نفسیاتی، سائنسی اور عمرانی۔ اگرچہ ان تینوں کے مقاصد اور مخارج مشترک تھے لیکن طریقہ کار مختلف، نفسیاتی تحریک کے علم برداروں نے طریقہ تعلیم کو محور قرار دیا سائنسی تحریک کے پرستاروں نے نفس مضمون اور عمرانی تحریک والوں نے نفس مضمون اور نظام تعلیم کو مقصد حیات قرار دے کر تعلیم میں اصلاحات کا بیڑہ اٹھایا۔ ویسے تو سائنسی تحریک میں بہت سی اہم شخصیات گزری ہیں لیکن درج ذیل میں ہم اس تحریک کے سب سے اہم کارکن کے خیالات و نظریات پر مختصراً روشنی ڈال رہے ہیں۔

ہربرٹ اسپنسر اور سائنسی تحریک (1820-1903)

Herbert Spencer & Scientific Movement

ویسے تو اسپنسر نے بہت سی تصانیف کو جنم دیا ہے لیکن تعلیمی افکار و نظریات پر مشتمل اس کی مشہور زمانہ Intellctual Moral & Physical تصنیف ہے۔ سائنسی تحریک کے علم برداروں کے مطابق اس نے نصاب تعلیم کو ہی محور قرار دیکر اپنی پوری عمارت کی تعمیر و تشکیل کی ہے۔ اس سے پیشتر وہ نصاب تعلیم پر دس مقالات میں مدلل اور واضح بحث کر چکا تھا اس طرح اس نے ارسطو کے نظریات کو دوبارہ جنم دے کر ایک ایسی تحریک کو حیات نو بخشی جس نے بنی نوع انسان کی زندگی کو یکسر بدل کر رکھ دیا اسپنسر کی تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ وہ Bacon کی مشہور زمانہ تصنیف Atlanta اور روسو کی تصنیف Emile سے بہت متاثر ہوا تھا۔ چنانچہ ہم اگر اس کی مندرجہ بالا تصنیف کو ان دونوں مصنفین کے خیالات و افکار کا [illegible]

تو بے جا نہ ہوگا۔

مقاصد تعلیم : Aims of Education

اسپنسر نے تعلیم کا مقصد مکمل زندگی Complete Living قرار دیا ہے، وہ کہتا ہے کہ تعلیم وہی اہمیت اور افادیت کی حامل ہو سکتی ہے جو زندگی کے ہر پہلو کی تکمیل میں معاون و مددگار ثابت ہو ماہرین تعلیم اور مفکرین تعلیم کے سامنے یہ مسئلہ ہمیشہ سے رہا ہے کہ کون سا علم سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے Which Knowledge is of most worth ہر ایک نے اپنی استعداد اور صلاحیت کے مطابق اس کو بیان کرنے کی کوشش کی لیکن جس طرح اسپنسر نے اس کو بیان کیا کوئی بھی نہ کر سکا۔ اسپنسر کا اس سے مطلب یہ ہے کہ مضامین کو ان کی افادیت کے لحاظ سے ترتیب دیا جائے اور ان مضامین کا مقصد اعلیٰ کردار کی تشکیل ہونا چاہیئے کیونکہ کردار ہی سکون و راحت کا منبع و مخرج ہے ہمارا خیال ہے کہ اسپنسر ولیم شیکسپیر William Shakespeare کے خیالات سے بہت متاثر تھا کیونکہ :-

"If wealth is lost no thing is lost
If health is Lost Some thing is Lost
If character is Lost Ever thing is Lost"

اس لئے تعلیم کا اولین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ وہ متعلم کو ان طریقوں سے روشناس کراوے جن سے وہ اپنی زندگی کی تکمیل کر سکے۔

اسپنسر نے تعلیم کا مقصد اخلاق کی تعمیر و تشکیل بھی قرار دیا ہے کیونکہ اس کے خیال میں تمام خوبیوں کی جڑ اخلاق ہی ہے اور تعلیم کا مقصد خوبیاں پیدا کرنا ہے وہ شخص جس کی زندگی خوبیوں سے بھرپور ہے مکمل زندگی کا مالک ہے اس کے اس خیال کی وجہ سے لوگوں نے اس پر افادیت پسندی کا الزام لگایا ہے جو حقیقت پر مبنی نہیں ہے اخلاق کے معیار کے سلسلہ میں ہم اس کا مقابلہ مشہور زمانہ فلسفی Kant سے ہی کر سکتے ہیں کیونکہ کانٹ کی طرح اسپنسر نے بھی اخلاق کی وضاحت اس طرح کی ہے۔ ترجمہ۔ "وہ جو انسانی زندگی کی اصلاح میں براہ راست ممد و معاون ثابت ہو۔"

زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ سائنس مضامین منظر پر آرہے ہیں جن کے لئے مشاہدہ اور تحقیق بہت ضروری ہے۔ سول مکینیکل، کیمیکل، انجنیرنگ، ڈاکٹری وغیرہ میں سے کسی ایک کی تربیت بچہ کے لئے ضروری ہے اگر بچہ کو اس طرح تعلیم دی جائے گی تو وہ بنیادی سائنس سے آگاہ ہو جائے گا۔ جو اس کے لئے خوشیوں اور کامرانیوں کا پاسپورٹ ہوگا۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر بچہ کو تمام مضامین پر عبور حاصل ہو سکین یہ لازمی ہے کہ اس کو کم از کم ایک پر عبور حاصل ہو۔

اسپنسر دعویٰ کرتا ہے کہ سائنس کا مطالعہ ہی تعلیم کا مقصد ہونا چاہیئے کیونکہ پر مسرت زندگی کے لئے اس سے اہم اور ضروری کوئی دوسرا مضمون نہیں ہے چنانچہ ہر شخص کو عضویاتی سائنس غذا کے لئے زراعت صنعت و حرفت ریاضی، کیمیا، حیاتیات وغیرہ بچوں کی جسمانی، اخلاقی اور ذہنی نشو ونما کے لئے والدین کو نفسیات اور اخلاقیات سے واقف ہونا بھی شرط ہے اسپنسر کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ وہ پہلا مفکر ہے جس نے فرصت کے اوقات کے مصرف پر بھی دل کھول کر بحث کی ہے اس ضمن میں یہ تحریر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ اسپنسر نے سائنس کا لفظ بہت وسیع معنی میں استعمال کیا ہے چنانچہ وہ ان تمام مضامین کو نصاب میں داخل کرنے کی پر زور سفارش کرتا ہے جن سے زندگی کی تکمیل ہو سکے۔

نصاب تعلیم اور ادوار تعلیم Content of Education. & Stages of Education.

اسپنسر نے نصاب تعلیم پر بہت ہی مدلل اور واضح بحث کی ہے چنانچہ وہ کہتا ہے کہ نصاب کو تشکیل دیتے وقت اس چیز کو مد نظر رکھنا چاہیئے کہ نصاب گردوپیش زندگی کے تقاضوں سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں ہم جو مشترکہ زندگی گزارتے ہیں اس کو بہتر بنانے کے لئے نصاب میں ایسے مضامین کو جگہ دینی چاہیئے جس سے ماضی سے مستقبل بہتر ہو علاوہ بریں نصاب میں جوہری اہمیت کے مضامین کو دوسرے درجہ پر رکھنا چاہیئے وہ چیزیں جو سماجی طور پر اساسی اہمیت کی حامل ہیں یعنی جو ایسے تجربات سے تعلق رکھتی ہیں جس میں وسیع تر گروہ شرکت کرتے ہیں یہ جوہری اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ ثانوی درجہ پر ایسے مضامین ہونے چاہئیں۔ جو ماہرانہ صلاحیت رکھنے

والے گروہ کی حامیوں اور تکنیکی مشاغل سے تعلق رکھتے ہوں۔ یہ مقولہ حقیقت پر مبنی ہے کہ تعلیم انسانی اور پھر پیشہ ورانہ ہونی چاہیئے۔

اسپنسر نے تمام مضامین کو ان کی اہمیت اور افادیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پانچ درجوں میں منقسم کیا ہے وہ کہتا ہے کہ سب سے پہلے بچہ کو ایسے مضامین کا درس دیا جائے جو اس کی بقا کے لئے ضروری ہیں جیسے علم البدن، حیاتیات مابعد الطبیعات اور علم کیمیا وغیرہ یہ مضامین بچہ کی متوازن نشو ونما میں اہمیت کے حامل ہیں اگر ان میں سے کسی کو بھی نظر انداز کیا جائے گا تو بچہ کی متوازن نشو ونما ناممکن ہے دوسرے درجہ پر وہ مضامین جو بیرونی طریقوں سے بچہ کی بقا میں معاون و مددگار ثابت ہوں جن کے بغیر بچہ کی زندگی کی تکمیل ناممکن ہے اس میں کھانا، پہننا اور رہائش شامل ہے کیونکہ اسپنسر کا خیال ہے کہ بچہ کی صلاحیتیں جب ہی جلا پا سکتی ہیں جب کہ اس کو مندرجہ بالا تینوں بنیادی ضروریات سے سکون میسر ہو۔ تیسرے درجہ پر وہ مضامین ہیں جو اپنی اہمیت اور انفرادیت کی وجہ سے تعلیم کا اٹوٹ حصہ بن جاتے ہیں مثلاً ہر بچہ کو آنے والی تبدیلی کے لئے تیار کرنا یا بالفاظ دیگر بچوں کی پرورش کرنا ان کی دیکھ بھال اور ان کی فلاح و بہبود کے لئے مناسب طریقوں کو جاننا وغیرہ۔ چوتھے نمبر پر وہ مضامین جو معاشی اور سیاسی تعلقات میں معاون و مددگار ثابت ہوں ایک اچھے شہری کے لئے ان تمام تعلقات کا جاننا ضروری ہے جو اس کے اور معاشرے اور ملک کے درمیان ہوتے ہیں۔ اس کے حقوق و فرائض کیا ہیں۔ وغیرہ وغیرہ آخر میں وہ ایسے مضامین کی سفارش کرتا ہے جو بچہ کے مذہبی جذبات میں رہبری کر سکیں۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ اسپنسر نے روسو کی طرح حقیقت سے فرار اختیار کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہ زندگی کو زیادہ سے زیادہ ٹھوس بنیادوں پر استوار کرنے کا خوگر نظر آتا ہے۔

اسپنسر اس چیز پر بہت زور دیتا ہے کہ وہی مضامین پڑھائے جائیں جن کی بچہ کو ضرورت ہو کیونکہ بچہ کا ہر قدم تکمیل کی طرف بڑھ رہا ہے اور تکمیل میں تعلیم بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ لاطینی اور یونانی زبانوں کا درس بے کار ہے کیونکہ اب زندگی میں ان زبانوں کی خاص اہمیت نہیں ہے البتہ وہ فرانسیسی

اور جرمنی کو پڑھانے کی پر زور سفارش کرتا ہے. شوقین حضرات لاطینی اور یونانی کا خود مطالعہ کر سکتے ہیں۔

اسپنسر اس بات کا حامی ہے کہ انتخاب مضامین میں بچہ کو مکمل آزادی ہونی چاہیئے۔ بچہ اپنی طبیعت اور فطرت کو سمجھتا ہے اس لئے وہ اس مضمون کو منتخب کرے گا جو اس کی مرضی اور دلچسپی کے مطابق ہوگا۔ اسپنسر افسوس کرتا ہے کہ والدین بچہ کو غلط مضامین دلا دیتے ہیں جس کا نتیجہ بچہ کے لئے تباہ کن ثابت ہوتا ہے یہاں وہ نفسیاتی تحریکوں کے علمبرداروں کا ترجمان نظر آتا ہے اسی وجہ سے بہت سے مفکرین اس کو نفسیاتی تحریک کا ہی رکن خیال کرتے ہیں جو غلطی اور لاعلمی پر منحصر ہے اسپنسر نے اس بات کی بھی پر زور سفارش کی ہے کہ نصاب تعلیم کو تربیت دیتے وقت فنی اور پیشہ ورانہ مضامین کو بھی خاص اہمیت دینی چاہیئے اور پھر ان میں اتنا لعد بھی رکھنا چاہیئے کہ اگر بچہ بار بار اپنی پسند کو بدلنا چاہے تو ایسا نہ کر سکے کیونکہ یہ چیز بھی اسکے لئے نقصان دہ ہو سکتی ہے جس سے اس کو ہی نہیں بلکہ معاشرے کو بھی نقصان پہونچ سکتا ہے۔

جہاں تک ادوار تعلیم کا سوال ہے تو اس سلسلہ میں اسپنسر نے کوئی خاص نظریہ پیش نہیں کیا ہے وہ یونیورسٹی اعلیٰ ثانوی، پرائمری اور لوئر پرائمری تعلیم کا خوگر ہے جس سے ادوار کا خود بخود اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

طریقہ تعلیم Methods of Teaching

جہاں تک طریقہ ہائے تدریس کا سوال ہے تو اسپنسر نے نفسیاتی تحریک کے علمبرداروں کی ہی تقلید کی ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ سائنس کے لئے سب سے ضروری طریقہ تدریس استقرائی ہے۔ باقی اصول پیستالوزی سے ماخوذ ہیں مثلاً

آسان سے مشکل کی طرف From Simple to Difficult

معلوم سے نامعلوم From Known to Unknown

مادی سے غیر مادی From Concrete to Abstract

اس سلسلہ میں تفصیل کے لئے راقم الحروف کی تصنیف "چند عظیم مفکرین تعلیم جلد اول" ملاحظہ فرمائیے یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس تحریک سے ایک

نیا طریقہ تدریس جس کو Scientific Method کہتے ہیں وجود میں آیا۔ سائنس آزمائشی، تحقیقات اور جانچ پڑتال کے طریقہ کا نام ہے سائنس کا اختصاص صرف تنظیم معلومات ہی نہیں بلکہ ایک خاص قسم کی تنظیم جو آزمائش شدہ دریافت کے مناسب طریقے سے وجود میں آئے سائنسی موضوع کی تنظیم کامیاب طور پر انکشافات کرنے کے خاص مدعا کو پیش نظر رکھ کر ہوتی ہے۔ سائنس سے یقین کی جو قسم حاصل ہوتی ہے اس کا جائزہ لیکر اس بات کی وضاحت ہو سکتی ہے یقینی استدلالی یا منطقی ہو سکتا ہے اس کے برعکس سائنسی تنظیم کا منشا الیہ یہ ہوتا ہے کہ ہر تصور اور بیان اس نوع کا ہو کہ وہ بعض گذشتہ بیانوں سے پیدا ہو اور آئندہ باتوں کو پیدا کرنے کا باعث ہو۔ یہاں تصورات اور فضا ایک دوسرے پر دلالت کرتے ہیں ایک دوسرے کا ثبوت بنتے ہیں کس طرف رہنمائی اور کس کی توفیق کا دہرا رشتہ ہی وہ ہے جس پر منطقی اور استدلالی اصطلات پر دلالت کرتی ہیں۔

پانی کا روزمرہ استعمال میں جو مفہوم لیا جاتا ہے وہ ظاہر ہے لیکن کیمیادان کے لئے اس کا مفہوم مختلف ہے کیونکہ اس کے نزدیک H_2O ہے اور یہی تعریف تحقیقات میں اس کے استعمال اور مقام کی وجہ سے برتری رکھتی ہے جو شخص اس تعریف کو سمجھتا ہے اسے یہ تعریف اس بات کی طرف بھی راہنمائی کرتی ہے کہ یہ معلومات کس طرح حاصل ہوئیں۔ اور اشیاء کے متعلق اس کی تشکیل کے جو اور حصے ہیں ان پر ان کا کیا اثر پڑتا ہے۔

سائنس میں مشاہدہ، تفکر اور تجربہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے سائنس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ مروجہ نظام میں جو خامیاں ہیں ان کو دور کرنے کے لئے نظر ثانی اور ان کی صحت میں اضافہ کی مسلسل اور ہوشمندانہ کوشش جاری رہے اس سے بھی اہم یہ بات ہے کہ ان کلیات کو ایسی شکل دی جاتی رہے کہ مختلف حقائق کا ایک دوسرے پر انحصار زیادہ سے زیادہ واضح ہو جائے اور دوسرے اعمال کی طرح یہ بھی ایک ایسے عمل کا نتیجہ ہوتی ہے جو کہ ماحول میں تبدیلیاں پیدا کرتا ہے لیکن سائنس کے معاملے میں جو علم حاصل ہوتا ہے اس کی اپنی نوعیت ہی اس کی سب سے اہم خصوصیت ہے یہ نوعیت محض ضمنی نہیں ہوتی منطقی طور پر

یا نفسیاتی طور پر دونوں ہی طرح سائنس علم کی تکمیلی شکل ہے جو اس کی آخری منزل ہے بالفاظ دیگر ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سائنس کسی بھی علم کے منطقی مضمرات کو عمل میں لانے کا نام ہے منطقی ربط اور تسلسل کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے تحقیق شدہ چیز پر تھوپ دیا جائے وہ علم کی تکمیلی شکل کا دوسرا نام ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ موضوع کو کچھ اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ جسکو سمجھنے کی کوشش کرنے والے کے سامنے وہ حقیقت آجاتی ہے جس سے یہ بیان اور نتائج لازمی طور پر پیدا ہوتے ہیں۔

جہاں تک اعلیٰ تعلیم یعنی یونیورسٹی کا سوال ہے۔ ہم بخوبی جانتے ہیں کہ سب سے پہلے اکاڈمی کا وجود ہوا آگے چل کر یہی یونیورسٹی میں تبدیل ہوگئی اس سلسلہ میں سب سے اہم Naples کی اکاڈمی ہے کیونکہ سب سے پیشتر اس نے ہی سائنس کے مضامین کو اپنے نصاب میں شریک کیا۔ فرانس میں سائنس کی تدریس سب سے پہلے نارمل اسکولوں میں ہوئی فرانس میں جنہوں نے اس کی ترقی و ترویج کی کوششیں کیں ان میں laplace & Lagrakage بہت مشہور ہیں یہ انہیں لوگوں کی کوششوں کا ثمر ہے کہ فرانس کو سائنس کے میدان میں خاص مقام حاصل ہے۔

انگلینڈ میں سائنس کو کبھی وہ درجہ حاصل نہ ہو سکا جس کا وہ اہل ہے جس کی سب سے اہم وجہ وہاں کے باشندوں کی قدامت پسندی اور ان کی فطرت ہے کیوں کہ وہ کسی بھی نئے خیال کو فوراً ہی اپنانے کے مخالف ہیں ویسے تو وہاں پر بہت سے لوگوں نے اس سلسلہ میں کارنامے کئے ہیں لیکن نیوٹن اور لیزرگ نام بہت مشہور ہیں۔ چنانچہ سب سے پیشتر وہاں پر عضویاتی سائنس کو نصاب میں داخل کیا گیا گورنمنٹ نے سب سے پہلا کالج سائنس کی تدریس کے لئے قائم کیا وہ کالج آف مائینز ہے جو آگے چل کر کالج آف سائنس میں تبدیل ہو گیا اسی طرح لندن یونیورسٹی نے سائنس کی تعلیم کے لئے Faculty of Science ۱۸۶۰ء میں قائم کیا لیکن دیگر یونیورسٹیوں نے کافی عرصہ تک اس کو نصاب میں شامل نہیں کیا۔

امریکہ میں سائنس کو بہت جلد مقبولیت حاصل ہو گئی چنانچہ سب سے

پہلے علم فلکیات کو ہارورڈ یونیورسٹی میں داخل نصاب کیا گیا اس کے بعد دیگر یونیورسٹیوں نے بھی جلد ہی سائنس کو اپنے نصاب میں شریک کر لیا. جہاں تک ثانوی تعلیم کا سوال ہے تو سب سے پیشتر جرمنی میں اس کو نصاب میں داخل کیا گیا. جرمنی کے بعد انگلینڈ اور امریکہ میں بھی سائنس کے مضامین کو نصاب میں شامل کیا گیا. ابتدائی اور پرائمری تعلیم میں بھی سائنس کو سب سے پہلے جرمنی میں شامل کیا گیا. اس کے بعد دیگر ممالک نے اس کی نقل کی چنانچہ موجودہ زمانے میں سائنس میں دنیا کا ہر ملک سبقت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے چنانچہ آج ابتدائی تعلیم سے لیکر اعلیٰ تعلیم تک اس بات کی پوری کوشش کی جارہی ہے کہ بچہ کو زیادہ سے زیادہ تجربات کرائے جائیں یہی سائنس کی ترقی کی سب سے بڑی وجہ ہے کیونکہ بچہ کو ایسے نصاب تعلیم سے نوازا جارہا ہے کہ ایک طرف تو وہ اس کے نفسیاتی، تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے اور دوسری طرف اس کو زیادہ سے زیادہ آسانیاں فراہم کرکے اس کی خوابیدہ صلاحیتوں کو منظر عام پر لایا جاتا ہے چنانچہ اس کی ترقی کا سہرا کسی حد تک اسپنسر کے ہی سر ہے.

روسو کے افکار و نظریات سے عمرانی تحریک کی ابتدا ہوئی وہ پہلا مفکر ہے جس نے تعلیم میں اس نظریئے کو پیش کیا جس کے مطابق انسان میں انسانی جذبات کی تکمیل ہی تعلیم کا مقصد اولیٰ ہے تعلیم سے بچوں میں ایسے جذبات پیدا کئے جائیں جن سے وہ حقیقی معنی میں ہمدردی محبت و اخوت عالمی بھائی چارگی انصاف مساوات آزادی وغیرہ سے روشناس ہو سکیں ۔ روسو نے سماجی اچھائیوں کو بیان کرنے کے بعد اس پر زور دیا کہ ہر بچہ برابر ہے چاہے وہ کسی ملک کسی قوم، کسی مذہب یا کسی رنگ کا ہو چنانچہ دنیا میں کچھ ایسے دن مقرر کر دیئے گئے ہیں جس دن اس بات کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اس کے علاوہ اقوام متحدہ نے بچوں کے لئے ایسے فنڈ مقرر کئے ہیں جن سے اقوام عالم کے بچوں کو فائدے پہونچ سکیں. بچہ کے فائدے کے لئے عالمی ادارہ صحت قائم کیا گیا ہے کیونکہ دورِ جدید میں بچہ کو کسی خاص ملک کا نہیں بلکہ پورے عالم کا تصور کیا جاتا ہے عمرانی تحریک کو پروان چڑھانے میں ویسے تو لاتعداد مفکرین اور ماہرین نے کارنامے انجام دیئے ہیں ان میں سب سے مشہور ہستی جان ڈیوی کی ہے درج ذیل ہم ان کے افکار و خیالات کو مختصراً تحریر کر رہے ہیں.

جان ڈیوی اور تعلیم کا جمہوری نظریہ

John Dewey (1859 To 1952)

جان ڈیوی کا نام نامی اقلیم تعلیم میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ یہ دورِ جدید کا سب سے عظیم مفکر خیال کیا جاتا ہے ویسے تو اس نے تعلیم پر بہت سی تصانیف کو جنم دیا لیکن اس کی مشہور زمانہ تصانیف How we Think School And Society Democracy & Education. ہیں۔ ان کے فلسفہ کو عموماً "Instrumentalism" "Pragmatism." یا Experiementalism کے نام سے پکارا جاتا ہے Frderick Eby اس کے بارے میں رقم طراز ہے۔

"No Educational thinkes, since Pestalozzi Has Been So Umiversally Renowned at Home and Abroad."

ڈیوی نے تعلیم کی تعریف اس طرح کی ہے۔

Education is the, "Reorganisation, Reconstruction and Re-Orientation of Experince."

ڈیوی نے اس فرسودہ خیال کی بھی تردید کی ہے جس کے مطابق تعلیم کا مقصد زندگی کے لئے تیار کرنا تھا بلکہ وہ کہتا ہے۔

"Education is not the Preparation for Life But it is Life Itself"

اس سے پیشتر کہ ہم ڈاکٹر موصوف کے افکار و نظریات کا تذکرہ کریں بہتر یوں معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً ان کے Universit, Elementry School کے بارے میں بھی تحریر کر دیں کیونکہ یہی وہ مقام تھا جہاں پر ان کو اپنے نظریات کو عملی جامہ پہنانے کا موقع ملا۔ یہ اسکول انہوں نے شکاگو یونیورسٹی میں بحیثیت ایک تجرباتی اور تحقیقی

ادارہ قائم کیا تھا جس کا مقصد ان کے اپنے الفاظ میں

Thories and Ideas might Be Demonstrated Tested, criticised, Enforced and The Evolution of new Truth 'The School & Society' P. 116 - 119)

Aims of Education مقاصدِ تعلیم

ماہرین تعلیم کے لئے مقاصد تعلیم کا تعین ہمیشہ سے مسئلہ رہا ہے جس کے لئے انہوں نے مختلف طریقوں کو بنیاد مانا ہے مثلاً کچھ ماہرین عمر کے لحاظ سے مقاصد کا تعین کرتے ہیں. جب کہ کچھ ذہانت کے لیکن ڈیوی اس سلسلہ میں خاموش نظر آتا ہے چنانچہ وہ اپنی مشہور زمانہ تخلیق "جمہوریت اور تعلیم صفحہ ۸۹ پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتا ہے. ترجمہ

"تعلیم کا عارضی مقصد تعلیمی مشاغل اور تجربات کی اصلاح کرنا ہے یہی جذبہ کسی حد تک مقاصد حاصل کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے اس لحاظ سے بچپن، لڑکپن، سن بلوغ، تعلیمی اعتبار سے ایک ہی سطح پر ہیں کیونکہ بلحاظ عمر ہر دور میں فرد قابل قدر تجربات حاصل کرتا ہے اور ان تجربات کا اضافہ ہی مقصد تعلیم ہے"۔

ڈاکٹر موصوف کے نقطہ نظر سے تعلیم کا مقصد اس کی عملی بالیدگی میں پنہاں ہے ایسا خیال کرنا غلطی پر مبنی ہے کہ تعلیم کی کوئی خاص منزل ہوتی ہے تعلیم کی منزل صرف یہ ہے کہ وہ افراد کی توجہ کو اپنی طرف مرکوز کرے اور پھر اس توجہ سے خیالات اور عمل کو اس طرح مربوط کرکے ترقی کی طرف گامزن ہو کر وہ بچہ کو فکر و عمل کی دعوت دے یعنی تجربات نو کا نام ہی تعلیم ہے اور اسی تعمیر نو پر مقصد کی ترقی کی طرف گامزن ہو کر وہ بچہ کو فکر و عمل کی دعوت دے یعنی تجربات نو کا نام ہی تعلیم ہے جو ہر وقت جاری و ساری رہتی ہے تو اس کا کوئی وقت معین نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ سلسلہ ساری عمر جاری رہتا ہے اس بات کی وضاحت ڈیوی نے اس طرح کی ہے۔

Democracy & Education P. 61.

" Since life means Growth, a living

creature lives as truly and positively at one stage as at another with the same intrinsic fulness and the same absolute claims. Hence Education means the enterprise of supplying the conditions which insure growth, or adequacy of life, irrespective of age. the process of Education is a continuous process of Adjustment, having as its aim at every stage an added capacity of growth."

انسانی زندگی میں تجربات کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا ہے ان تجربات کے ساتھ ہی ساتھ تعلیم کی بھی نشوونما ہوتی رہتی ہے. بچہ جیسے جیسے آنیوالی تبدیلیوں سے ہمکنار ہوتا ہے اسی طرح اس کی معلومات یا تعلیم میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے چنانچہ زندگی میں کوئی بھی ایسا مقام یا منزل نہیں آتی جہاں پر تعلیم کا اختتام ہو اس سلسلہ میں یہ چیز بھی قابل غور ہے کہ جہاں تک مقاصد تعلیم کا سوال ہے تو وہ یا تو ماہرین تعلیم مقرر کرتے ہیں یا معلمین جن کا بچہ کے تجربات، مشاہدات اور مشاغل سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا اس لئے وہ سب لغو اور بیکار ہیں وہ تو بیرونی باتیں ہیں جن کا نا تو بچہ کی فطرت سے اور نہ ہی اس کے ماحول سے کوئی تعلق ہے اس لئے ان سے بچہ کا ہم آہنگ ہونا ناممکن ہے اگر واقعی تعلیم کے مقاصد کا تعین کرنا ہے تو بچہ کی فطرت اس کے ماحول اور اس کی حیات نو کے مطابق کرنا چاہیئے جو ناممکن ہے اس لئے مقاصد پر بحث و مباحثہ کرنا وقت اور طاقت کی بربادی کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے.

جیسا کہ تحریر کیا جا چکا ہے کہ تعلیم تجربات نو کا دوسرا نام ہے. یہ نظریہ اس بات کی دلیل ہے کہ تعلیم آئندہ زندگی کی تیاری نہیں بلکہ ہر لمحہ عمل عین زندگی ہے ڈاکٹر ڈیوی اس نظریہ کے سخت مخالف ہیں جو تعلیم آئندہ زندگی کی تیاری قرار

ہے تعلیم کا مقصد تعین کرنا اس وجہ سے بھی قرین عقل نہیں کہ اس میں نہ تو بچہ کے لئے حقیقت ہوتی ہے اور نہ ہی جاذبیت. اس سلسلہ میں ڈیوی رقم طراز ہیں

Democracy & Education .p.119

ترجمہ. "تعلیم کے مقاصد کا تعین کرنا مہمل اور لغو ہے کیونکہ نہ تو نتائج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور نہ ان پر غور کیا جا سکتا ہے"۔

ڈاکٹر موصوف نے تعلیم کا ایک مقصد سوشل رشتوں کو استوار کرنا بھی پیش کیا ہے اگرچہ ان سے پیشتر بہت سے مفکرین اور ماہرین نے اس نظریہ کو پیش کیا تھا. مثلاً کومنس روسو وغیرہ ہربارٹ نے اسی چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی پوری عمارت کی تعمیر و تشکیل Sympathy پر کی تھی فروبل Froebel کا مرکزی خیال Social Unity ہی تھا. یہاں پر یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ ڈیوی پر فروبل کا بہت اثر تھا کیونکہ شکاگو میں جو تجرباتی اسکول ان کو ملا تھا اس میں فروبل کا ہی نظام تعلیم رائج تھا. بہرحال ان تمام باتوں کے باوجود ڈیوی نے جو Socialization کا مفہوم پیش کیا ہے وہ ہر طرح سے انفرادی حیثیت کا حامل ہے.

Content of Education. نصاب تعلیم اور ادوار تعلیم
& Stages of Education.

جہاں تک نصاب تعلیم کا سوال ہے تو اس ضمن میں بھی ڈاکٹر موصوف نے ایک اچھوتا اور انوکھا نظریہ پیش کیا ہے وہ کسی بھی نصاب کے قائل نہیں ہیں کیونکہ بقول ان کے ایسا کرنے سے کل کو ٹکڑوں میں منقسم کرنا ہے وہ کہتے ہیں کہ علم اکائی ہے ہر بچہ کہ اس اکائی کا تھوڑا سا حصہ معلوم ہوجانا چاہیئے کیونکہ کل پر دسترس ناممکن ہے دوسری وجہ اس سلسلہ میں یہ ہے کہ نصاب تعلیم بالغوں کے دماغ کی اختراع ہے بچہ کے دماغ میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے تجربات و مشاہدات کو مختلف حصوں میں منقسم کرسکے اس سلسلہ میں وہ یوں گوہر فشانی کرتے ہیں.

My Pedagogical creed.

"We violate the child's Nature and Render

Difficult the Best Ethical Results By Introducing the child to Abruptly to a Number of Special Studies, of Reading, writing and Geography Etc."

بچہ کا دماغ مضامین کی فلسفیانہ ترتیب کو سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے مضامین کی ترتیب ان کے اصول وقواعد اور ان کی اہمیت کے مطابق مرتب کرنا بالغوں کیلئے مناسب اور موزوں ہے بچہ کے لئے ایسا کرنے کا مقصد اس کی ذہنی موت ہے بچہ کے دماغ کی تربیت کے لئے ارتباط اور اس کی دلچسپیوں اور پھر اس کے ماحول کے مسائل سے دوچار کرنا ہی اصل نصاب ہے۔ وہ بنیادی اجزار جو زندگی کو مشاغل سے مربوط کرتے ہیں ان کو بچہ کی زندگی اور اس کے مشاغل میں ہی ہونا چاہیئے جو کامیابی وکامرانی کی بنیاد ہے اگر ان کو فلسفیانہ اور منطقی ترتیب تک ہی مرکوز رکھا جائے گا تو وہ بچہ کے لئے تباہی اور بربادی کے باعث ہوں گے یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ اسکول تعلیم کی ابتدار 3R سے ہی ہوتی ہے لیکن اس میں اس بات کو مدِ نظر رکھنا چاہیئے کہ ان مشاغل کو ضرور شامل کیا جائے جن کا تعلق بچہ کی گھریلو زندگی سے ہو ان مشاغل میں بچہ کو نسلی معاشرتی اصولوں سے واقف کرانا بھی از لبکہ ضروری اور لازمی ہے اس سلسلہ میں وہ اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں۔ ترجمہ

" ابتدار ایسے مشاغل سے ہونی چاہیئے جن میں بچہ کو اپنی اندرونی کیفیات سماجی مشاغل اور ضروریات کی مدد سے اپنی صلاحیتوں کو ظاہر کرنے کا موقع ملے مثلاً گھر بنانا بڑھئی کا کام، سینا پرونا، کھانا پکانا اور ڈھلائی وغیرہ سکھانی چاہیئے"

ڈیوی نے اپنے تجرباتی اسکول میں گھریلو مشاغل نصاب میں شامل کئے تھے ان مشاغل میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ وہ بچہ کے لئے دلچسپ ہوں اور ان کی فطری تقاضوں کی ترجمانی کرتے ہوں ان سے تعمیری جبلت پیدا ہو دماغ اور عضلات میں رابطہ قائم رہے ابتدائی جماعتوں میں گنتی موسیقی آرٹ دکانداری، کھانا پکانا، کپڑے سینا سائنس جغرافیہ لکھنا پڑھنا، تاریخ اور باغبانی شامل کئے تھے جو رسمی طریقہ پر نہیں پڑھائے جاتے تھے بلکہ بچہ کو مشاغل میں ان باتوں سے آگاہ کیا جاتا تھا۔ بچہ بکرٹی کا سینڈ بیر، ملاکر بنسا

کے بکس ماچس بکس و کاغذ کاٹنے گی چھری کتاب دان وغیرہ بناتے تھے۔ غذا کی دلچسپی کے لئے کھانا پکانا، روٹی پکانا اور غذائی اشیاء کے متعلق معلومات فراہم کرنا سکھایا جاتا تھا۔ لباس سینے پرونے اور کاڑھنے کے علاوہ اون اور سوت کی پیداوار کے متعلق بھی بچوں کو سکھایا جاتا تھا ان عملی کاموں کے ذریعہ بچہ کے تجربات کا رخ دنیا کی معلومات کی طرف موڑ دیا جاتا تھا۔ زراعت نقل وحمل صنعتی مشاغل خرید و فروخت کے مسائل سے بھی روشناس کرایا جاتا تھا بچہ کو قدیم انسان کی زندگی اور اس کے مشاغل اور تاریخی حالات کے بارے میں بھی بتایا جاتا تھا جن کی وجہ سے بچہ حساب، تاریخ جغرافیہ علم نباتات کیمیا اور زبان بھی سیکھ جاتا تھا ان کے علاوہ بچہ ضروریات زندگی باہمی اشتراک اور تعاون سے تیار کرتا تھا۔ غرضیکہ اسکول کا نظام ایسا تھا کہ بچہ سماجی مقاصد سے واقف ہو کر اس کے لئے فائدہ مند ثابت ہو سکے ساتھ ہی ساتھ بچہ کو بھی اشتراک عمل اور تعاون کی تربیت مل سکے اس طرح ڈاکٹر ڈیوی نے ایک نئے خیال Need theory کو ہی اصل نصاب تعلیم قرار دیا۔

ڈاکٹر موصوف نے اپنے ادارئے میں چار سال سے لیکر چودہ سال تک کے بچوں کو داخل کیا تھا ہر جماعت آٹھ یا دس طلبہ پر مشتمل ہوتی تھی تقسیم جماعت میں کوئی خاص اصول مد نظر نہیں رکھا گیا عموماً ان معلمین کو مقرر کیا جن کو کنڈر گارٹن کا تجربہ تھا ان تمام معلمین کو ڈیوی کی ہدایت کے مطابق فرائض انجام دینے پڑتے اس نے معلمین کی مدد سے خاص لائحہ عمل مرتب کیا ادارے کا سارا کام اسی کی مدد سے کیا جاتا تھا۔

طریقہ تعلیم Methods of Teaching

ڈیوی کے خیال میں تجربات ہی تمام طریقوں کی بنیاد ہے۔ روسو کے علاوہ جدید ماہرین تعلیم میں کسی نے بھی اس اصول کو اہمیت نہیں دی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے مطابق تعلیم کی کامیابی کا دارومدار سیدھے سادے تجربات پر منحصر ہے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ طریقہ تدریس سے زیادہ ضروری مقاصد تعلیم ہیں اور ان دونوں کی کامیابی حالات کی مرہون منت۔ ہے علم عمل کے رد عمل کا نتیجہ ہوتا ہے وہ حالات جو بچہ میں سرگرمیاں پیدا کرتے ہیں وہی حالات اس کے فطری علم میں معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں ڈیوی نے اس پر طویل بحث کی ہے جس کو ہم بوجہ طوالت نظر انداز کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر ڈیوی نے فکر اور استقرائی استدلال کے سلسلہ میں ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ Thinking پانچ اقدامات کی مرہون منت ہوتی ہے ان اقدامات پر اجمالاً روشنی ڈالنا ضروری ہے سب سے پہلے فرد کسی مسئلہ یا مشکل سے دوچار ہوتا ہے اس کے بعد دماغ یا ذہن اس مسئلہ پر خاص طریقوں سے غور و خوص شروع کرتا ہے ابتدا اس کے جذبات سے ہوتی ہے ہر جز پہ بدلل طریقوں سے سوچ کر وہ اس کے کسی خاص پہلو پہ جا کر رک جاتا ہے. تیسرے مرحلے پر وہ اس کے حل کے لئے کوئی طریقہ نکالتا ہے. چوتھے درجہ پہ دماغ ان حلوں میں سے جو اس کے سامنے آتے ہیں ایک کا انتخاب کر لیتا ہے جس کو ڈاکٹر ڈیوی Experimentation کے نام سے پکارتے ہیں ان تمام عملوں سے گزر کر اب دماغ آخری مرحلے پر پہونچتا ہے جس میں وہ فرد کو مجبور کرتا ہے کہ یا تو وہ اس پر عمل کرے یا اس کو مسترد کر دے۔

ہر فرد کی زندگی میں جب بھی کوئی مسئلہ آتا ہے تو وہ مندرجہ بالا ہی طریقوں کو اپناتا ہے یہاں ایک چیز خاص طور سے قابل وضاحت ہے کہ بہت سے لوگ ڈاکٹر ڈیوی کے اصول اور ہر بارٹ Herbart کے اقدام کو ایک ہی تصور کرتے ہیں کیونکہ ظاہراً ان میں کافی حد تک مساوات پائی جاتی ہے لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے جہاں تک ڈیوی کا سوال ہے تو انہوں نے خود اسباب کی وضاحت کی ہے. Inductive Logic "Herbartian steps are a School Masters Psychology, Not the psychology of the child."

ڈاکٹر موصوف نے تعلیمی عمل کے سلسلہ میں دو بنیادی اصول تجویز کئے ہیں. ایک نفسیاتی اور دوسرا سماجی اول الذکر کے مطابق بچہ کی شخصیت فطری صلاحیتوں رجحانات اور جبلتیں دوسری جانب سماج اس کے مشاغل ارادے رواج اور اقدار میں تعلیم بچہ کے مشاغل سے شروع ہوتی ہے اگر بچہ عام مشاغل یا سرگرمیوں میں حصہ لینے سے قاصر ہے تو وہ تعلیم سے بھی محروم رہے گا. اس سلسلہ میں ڈیوی نے مفصل بحث اپنی تصنیف My Pedagogical creed میں کی ہے جس کو ہم بوجہ طوالت نظرانداز کر رہے ہیں. ڈاکٹر صاحب نے پوری تعلیم و تربیت کی بنیاد جبلت رجحان اور مشاغل کو قرار دیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس چیز پر بھی توجہ دیتے ہے کہ ان کی ترقی و بالیدگی میں ہی بچہ کی

ترقی کا راز مضمر ہے حقیقت یہ ہے کہ جبلتیں بچہ میں میکانکی شکل میں موجود نہیں ہوتیں وہ تو صرف رجحان طبع ہی ہوتے ہیں جن کا تعلق بچہ کی سرگرمیوں اور مشاغل سے ہوتا ہے اور جب ان کو سماج سے مربوط کیا جاتا ہے تو وہ بچہ کے کردار کو ایک خاص طریقہ سے ڈھالنے میں معاون و مددگار ہوتے ہیں. ان جبلتوں کی سرگرمیاں فطری اور سماجی تقاضوں کی محتاج ہوتی ہیں. ڈیوی نے اس قسم کی چار جبلتوں Instincts کا وضاحت سے تذکرہ کیا ہے جن کو اس نے بنیادی مشاغل یا دلچسپیوں کے نام سے بھی پکارا ہے اور پھر انہیں کو اس نے تعلیم کی بنیاد قرار دیا ہے.

1. Interest in Conversation or communication.
۱. گفتگو یا تبادلہ خیالات

2. Interest in Inquiry or Finding out Things.
۲. تحقیق بغرض معلومات

3. Interest in Making Things or construction.
۳. تجسس بغرض تعمیر

4. Interest in Artistic Expression
۴. جمالیاتی نمائش.

ان پر ڈیوی نے سیر حاصل بحث کی ہے شوقین حضرات School & Society میں تفصیل ملاحظہ فرما سکتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اظہار خیال کا سب سے آسان طریقہ زبان ہے اس لئے یہی سب سے زیادہ اہم تعلیمی طریقہ تدریس ہے اس سلسلہ میں وہ اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں.

"It is the simplest Form of the Social Expression of the child Hence it is a Great, Perhaps the Greatest of all Educational Resources."

ڈاکٹر موصوف نے بھی پیستالوزی کے اس خیال سے اتفاق کیا ہے کہ گھر ہی تعلیم کا مخرج ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اسکول کا ماحول اسی طرح کا ہو کہ اس میں اور گھر میں بچہ

کو کوئی فرق نظر نہ آئے اس کے لئے انہوں نے کچھ اصول وضوابط بھی مقرر کئے ہیں جن کی افادیت سے مفر نا ممکن ہے وہ آگے رقم طراز ہیں کہ تمام علم کا مخرج نسل انسانی کی حرکی قوتیں ہیں۔ یہ حرکی قوتیں انسان کو جدوجہد کے لئے مجبور کرتی ہیں جس میں اس کی بقا مضمر ہوتی ہے چنانچہ بنیادی ضروریات کی کفالت کے لئے ہی انسان سب کچھ کرتا ہے یعنی علم کی ابتدا بچہ کے مشاغل سے ہوتی ہے۔

"Direct Experience is the Best Method."

روسو کی طرح ڈاکٹر ڈیوی نے بھی اپنی پوری تعلیم کی تعمیر وتشکیل کو تجربات پہ منتقل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ تدریس کا زریں اصول یہ ہے کہ بچہ کے تجربات میں بتدریج اضافہ کیا جائے اس لئے معلمین کا کام یہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی درس دیں اس کو مشاہدات اور تجربات کی مدد حاصل ہو کیونکہ اس طرح کا علم اس کے جسم کا حصہ بن جاتا ہے الفاظ رٹا دینا کتابیں پڑھا دینا بچہ کے لئے بیکار ہیں۔ ڈیوی اساتذہ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے کہ ہر شخص اس کام کو اپنا سکے یہ تو حقیقتاً ایک معاشرتی عمل ہے جس پر سماج کی ترقی وتنزلی کا دارو مدار ہوتا ہے اس لئے پوری تعلیم کو اس طرح مرتب کیا جائے کہ اس میں بچے کے اشتراک اور تعاون کو اولیت حاصل ہو معلمین ایسے ہونے چاہئیں جن کو بچہ کی نفسیات رجحان طبع ضروریات زندگی ماحول اور اس سے ہمدردی ہو مروجہ معلمین پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو شخص کوئی دوسرا کام نہیں کر سکتا وہ معلم بن جاتا ہے جو گناہ عظیم ہے اس کام میں تو ایسے لوگوں کو شامل ہونا چاہیئے جو اپنی زندگی اس کے لئے وقف کر دیں۔

مختصراً ہم نے ڈیوی کے تعلیمی نظریات کا تذکرہ کر دیا ہے تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمایئے "چند عظیم مفکرین تعلیم"۔

باب ۶

اسلام اور تعلیم

ISLAM AND EDUCATION

تاریخ عالم شاہد ہے کہ اسلام انفرادی حثییت کا حامل ہے جو سراپا علم بن کر آیا اور تعلیمی دنیا میں ہمہ گیر انقلاب کا پیامبر ثابت ہوا۔ تاریخی نقطہ نظر سے انسان نے اپنے سفر کا آغاز تاریکی اور جہالت سے کیا تخلیق آدم کے بعد خالق نے انسان اول کو سب سے پیشتر علم سے نوازا (علّم آدم سماء کلہا) یہی وہ خصوصیت ہے جس سے انسان نے کائنیات پر اپنی فوقیت ثابت کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو پہلی وحی نازل ہوئی وہ علم کی اہمیت اور افادیت پر مکمل طور پر روشنی ڈالتی ہے اور اس میں تعلیم و تعلم کی ضرورت اور اہمیت کے ساتھ ہی ساتھ ذرائع تعلیم کی بھی وضاحت کی گئی۔

اقرا باسم ربک الذی خلق خلق الانسان من علق. اقرأ و ربک الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم ٥

"پڑھ! اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا انسان کو خون سے پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے وہ جس نے قلم سے علم سکھایا انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جسکو وہ نہ جانتا تھا۔

قرآن کریم میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو ذمہ داریاں سپرد کی گئی تھیں اور جو وظائف مقرر کئے گئے ہیں ان میں تلاوت کتاب تعلیم کتاب و حکمت احکام و آیات تزکیہ نفوس اور تبلیغ و دعوت کو مرکزی حثییت حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ آپ نے فرمایا "انما بعثت معلماً یعنی میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں" آپ کے ارشادات عالی سے تعلیم و تعلم کی اہمیت و افادیت کا اچھی طرح اندازہ ہوجاتا ہے مثلاً "تعلیم حاصل کرو" چاہے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے عالم کے قلم کی سیاہی شہید کے خون سے زیادہ متبرک ہے۔"

جنگ بدر کے قیدیوں کی رہائی کے لئے آپ نے یہ شرط عائد کی تھی کہ وہ مدینے کے لوگوں کو تعلیم دیں چنانچہ درسگاہ نبوی میں حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ عثمانؓ علیؓ جیسے فرمانروا طلحہ، زبیر، معاویہ، سعد بن معاذ اور سعد بن ربیع جیسے ارباب رائے و تدبیر، خالد، ابو عبیدہ، سعد بن ابی وقاص اور عمرو بن العاص جیسے سپہ سالار، ابو ذر سلمان جیسے خرقہ پوش علی عائشہ ابن عباس، ابن مسعود اور زید بن ثابت جیسے محدث و فقیہہ وغیرہ شریک رہتے تھے۔

اسلام وہ دین ہے جس نے تعلیم اور مذہب کو مغربی ممالک کی طرح جدا نہیں کیا ہے کیوں کہ اسلام کے مطابق فلسفہ تعلیم علم کا کوئی علیحدہ شعبہ نہیں جو آزادانہ علمی تحقیق اور استدلال کی بنا پر قائم کیا گیا ہو بلکہ حقیقتاً وہ فلسفہ اخلاق اور سیاست کی طرح ہمارے نظریہ انسان و کائنات کا عکس ہے ہر قوم یا مذہب انسان اور کائنات کا جو نظریہ قائم کرتا ہے وہ اسی لحاظ سے نظریہ تعلیم کو بھی اپناتا ہے چنانچہ مقاصد زندگی کے مطابق مقاصد تعلیم مقرر کئے گئے ہیں بالفاظ دیگر نظریہ کائنات مقصد زندگی اور مقصد تعلیم ایک ہی چیز کے نام ہیں۔ ان کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ ہم فطرت انسانی کو سمجھ لیں۔ اگر ایسا ہو جائے گا تو پھر ہم صحیح نظریہ زندگی مقصد زندگی اور مقصد تعلیم کا تعین بہ آسانی کر سکیں گے جہاں تک مغرب کا سوال ہے تو وہ خود شناکی ہیں کیونکہ فطرت انسانی کے متعلق ان کی واقفیت بہت محدود ہے اس سلسلہ میں Mcdougall کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے ترجمہ:

"انسانی فطرت کی ناواقفیت نے آج جماعتی علوم کی نشو و نما کو روک رکھا ہے، یہ علوم ہماری ایسی ضرورت کا درجہ رکھتے ہیں جس کے لئے دنیا چلا رہی ہے ان کے بغیر ہماری تہذیب روبہ زوال ہی نہیں بلکہ فنا کے شدید خطرے سے دوچار ہے۔"

یورپ کے ماہرین تعلیم نے مقاصد تعلیم کے جو نظریات قائم کئے ہیں ان سے ان کے بیشتر خیالات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں Dr. Keating سے ہم متفق ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

"تعلیم کے مقاصد کا تعین بے کار ہے کیوں کہ ہر شخص ان سے جداگانہ مطلب لیتا ہے۔ Sir Percy Nunn انگلستان کے نامور اور مشہور ماہر تعلیم اپنی

Education, its Data & First Principles تخلیق

میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ وہ تعلیم کی ایسی تعریف پیش کرسکیں جو نقائص سے پاک ہو چنانچہ تعلیم کا مقصد انسان کی انفرادیت کی آزادانہ نشوونما ہے۔"

لیکن یہ تعریف بھی خامیوں سے پر ہے ہمیں افسوس ہے کہ بوجہ طوالت ہم تنقید سے پہلو تہی کر رہے ہیں۔ مختصراً ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ حقیقت انسان کے متعلق نظریہ قائم کرنے سے ماہرین تعلیم کے لئے یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے چنانچہ خودی کی تربیت ہی اصل مقصد تعلیم ہے قدرت نے خودی کی تربیت کا سامان خودی کے فطری نفسیات رجحانات میں پوشیدہ رکھا ہے اور جب ہم خودی کی تربیت چاہتے ہیں تو ہم ان نفسیاتی رجحانات سے کام لیں ان کی تائید اور اعانت کریں انکے واسطے راہ ہموار کریں خودی کی صحت یہ ہے کہ اسے اطمینان راحت اور خوشی حاصل ہو۔ یہی نفسیاتی یا ذہنی صحت ہے اور خودی کی طاقت یہ ہے کہ وہ اپنے ارادوں کو حیوانی یا جبلتی خواہشات کی مزاحمت کے باوجود عملی جامہ پہنا سکے جس کو ہم قوت ارادی کے نام سے موسوم کرتے ہیں چنانچہ جس طرح بیماری صحت کو برباد کر دیتی ہے ہے اسی طرح بدی خودی کو یا اس طرح خودی کی صحت اور قوت کے لئے اوصاف حسن کی وہی حیثیت ہے جو اچھی غذا کے لئے حیاتین کی۔ یہاں یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ ہر تصور حسن خودی کی صحت اور طاقت کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کے لئے یہ شرط ہے کہ خودی کی تمام نفسیاتی ضروریات کو پورا کر سکے انسانی خودی کے تقاضوں حسن کو بدرجہ کمال پورا کرنے والا یہ مکمل تصور حسن اس کائنیاتی خودی کا تصور ہے جو اس کا خالق یعنی " خدا تعالےٰ ہے۔ خودی کی شدید نفسیاتی ضرورت یعنی مکمل تصور حسن کو تعلیم کے لئے خدا تعالیٰ نے جو وسیلہ پیدا کیا ہے اس کو " نبوت" کہتے ہیں اور حسن کی مکمل صورت خاتم النبین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے جن پر قرآن نازل ہوا جس کی تعلیم یہ ہے کہ مکمل تصور حسن جو خودی کی تمام فطری نفسیاتی ضروریات کو بدرجہ کمال پورا کرا سکتا ہے اور جو اس کی خوشی اور قوت ارادی کا ضامن ہے" فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا چنانچہ دین اسلام

میں انسان کی وہی فطرت ہے جس پہ خدائے تعالےٰ نے اس کو پیدا کیا اور اس میں وہ تمام اوصاف حسن موجود ہیں جو خودی کی محبت کو مطمئن کر سکتے ہیں" لہ الاسماء الحسنیٰ" تمام اوصاف حسن کا مالک اللہ ہی ہے۔ اس طرح ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ خدا کا تصور وہ مکمل تصور حسن ہے جو انسان کی زندگی کا صحیح نصب العین ہے۔ اور تعلیم کا بھی وہی مرکز ہے اسی تصور کی محبت ہے جس سے انسان کی سیرت کی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے اور جو انسان کو ایک مکمل زندگی کے لئے تیار کرتی ہے جو ایک تندرست جسم کے اندر طاقت ور روح پیدا کرتی ہے جو انسان کی بہترین مخفی صلاحیتوں کو پیدا کر کے اس کی آزادانہ انفرادیت کی نشو و نما انجام دیتی ہے زندگی میں کامیاب اور اعلیٰ ترین تعلیم یافتہ شخص وہ ہے جس نے اس تصور کی محبت کو درجہ کمال تک پہونچایا ہو اور پھر وہ اس محبت کو عملی زندگی میں پوری طرح سے ظاہر کر رہا ہو چنانچہ اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اس تصور کی محبت اور اس کے اوصاف نہ صرف طالب علم کے دل میں پوری طرح نشو و نما پائیں بلکہ اس کی عملی زندگی کے ہر پہلو میں بھی پوری طرح نمودار ہوں۔

بعض افراد کا خیال ہے کہ اسلامی نظریہ زندگی کے مطابق تعلیم کے معنی اخوت مساوات اور رواداری جیسی اقدار کو نظام تعلیم میں داخل کرنا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک نظام تعلیم میں خدا کے تصور کو علی الاعلان داخل نہ کیا جائے گا اور پھر طلبہ کے دلوں میں اس تصور کی محبت کو درجہ کمال پر نہ پہونچایا جائے گا اس وقت تک یہ ناممکن ہے کہ طلبہ ان اقدار پر عمل کر سکیں ساتھ ہی ساتھ اس بات پر بھی توجہ دینی لازمی ہے کہ خودی کے فطری نفسیاتی رجحانات کو بہم پہونچایا جائے تاکہ طلبہ میں صفات باری تعالیٰ کا عکس نمودار ہو سکے۔ اور اس سے طرز بود و باش میں حسن و جمال کے اظہار کی رہنمائی کرے اور پھر ان حقائق کی بنا پر ہم اپنا فلسفہ تعلیم یا نظریہ تعلیم کو اس طرح تشکیل دیں کہ وہ ہماری زندگی کی مناسب خدمت کر سکے اور عملی زندگی میں معبود حقیقی کے تقاضوں کی تکمیل کر سکے۔

مقاصدِ تعلیم Aims of Education

اسلام دنیا کا وہ مذہب ہے جس نے تمام انسانوں کی تعلیم کو بنیادی ضرورت قرار دیا ہے یونان اور چین نے علمی اور تمدنی میدان میں غیر معمولی ترقی کی تھی لیکن وہ بھی تمام انسانوں

کی تعلیم کے قائل نہیں تھے افلاطون جیسا ماہر تعلیم اور ریاست بھی ایک خاص طبقہ کو تعلیم سے نوازنے کی سفارش کرتا ہے اسلام وہ واحد مذہب ہے جس نے تمام مسلمانوں پر تعلیم کو فرض قرار دیا (طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ) اور اس کو معاشرے کی ذمہ داری قرار دیا یہ اصول اسلامی ہے کہ جو چیز سب کے لئے فرض ہے اس کی فراہمی کی ذمہ داری معاشرے اور ریاست پر عائد کی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ نماز، زکوٰۃ اور حج کا قیام اسلامی ریاست کے وظائف میں سے ہے یہی وجہ ہے کہ اصحاب صفہ کے اخراجات معاشرے کے متمول افراد کے عطیات کے علاوہ خود حضور اکرم بھی برداشت کرتے تھے اور جب تک ان کا انتظام نہ ہو جاتا آپ کھانا تناول نہ فرماتے۔ یہ اسی کا تقاضہ تھا کہ تعلیم کو اعلیٰ ترین مدارج تک مفت رکھا گیا۔ تاکہ ہر کس و ناکس اس سے فیضیاب ہو سکے۔

اسلام کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ اس نے اپنا مخصوص تصور علم پیش کیا ہے اور اس میں بنیادی چیز ذات باری تعالیٰ کو مانا ہے علم اشیاء اسی کا عطا کردہ ہے اور انسان کی ہدایت کا علم بھی اسی کی طرف سے ہے حواس اور عقل و تجربہ اہم ذرائع ہیں لیکن وحی سب سے اعلیٰ ذریعہ ہے۔ یہ بات بھی قابل تحریر ہے کہ علم کا تعلق محض لوازمات حیات سے ہی نہیں بلکہ مقاصد حیات سے بھی ہے اور پھر اول الذکر موخر الذکر کے تابع ہونا چاہیئے۔

تعلیم اور تربیت کا چولی دامن کا ساتھ ہے ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ نفوس دونوں کو ساتھ ساتھ انجام دینا ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے مخصوص نظام تعلیم میں تعلیم و سیرت ایک ہی حقیقت کے دو پہلو رہے ہیں جس کا اظہار فضل کی اصطلاح سے بھی ہوتا ہے جو علم اور نیکی اور اخلاق حسنہ میں اعلیٰ ہونے کے مفہوم کو ادا کرتی ہے۔

ان کے علاوہ تعلیم کا مقصد اچھا مسلمان اور داعی الی الحق بنانا ہے ساتھ ہی ساتھ ہر شخص میں اسلامی معاشرے کی ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیتوں کو بھی ابھارنا اور متعلمین کو اپنی ضروریات کی کفالت کے لئے محنت مزدوری کرنا مختلف پیشوں کو

سیکھنا اور ان سے وابستہ ہونا بھی فروری ہے۔

تعلیم کا مرکز دین اسلام اور تعلیمی سرگرمیاں اسی محور کے گرد گھومتی ہیں تعلیم کو عبادت تصور کیا گیا دنیا فانی اور لافانی ہیں عزت و آبرو سے زندگی گزارنا بھی تعلیم کا مقصد ہے اہل علم چاہے وہ کسی مدرسے سے وابستہ ہوں یا نہ ہوں علم کی اشاعت اپنا فرض منصبی خیال کرتے ہیں۔

تعلیم کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمان اپنے نظام تعلیم پر جس ذہن سے غور کرتے تھے اس میں جہاں یہ فکر دامن گیر تھی کہ ہر چیز دینی حیثیت سے ہو وہاں انہیں اس کا بھی خیال رہتا تھا کہ تعلیم اپنے زمانے کے تقاضوں کو بھی پورا کر سکے تاکہ جس کام کے لئے جس درجہ کا علم و مہارت درکار ہے وہ فراہم کی جائے۔

بہرحال تعلیم کا مقصد بندے اور معبود کے درمیان متوازن رشتہ قائم کرنا ہے تاکہ بندہ معبود کے بنائے ہوئے راستہ پر گامزن ہو کر اس مادی اور فانی دنیا میں زندگی گزار کر عاقبت میں جنت الفردوس میں جگہ پائے ساتھ ہی ساتھ اسلام نے علم اور عمل کے رشتہ کی بھی وضاحت کی ہے۔ اور دونوں کو لازم و ملزم قرار دیا ہے اس طرح طلبہ میں خوبیوں کو اجاگر کر کے ان کو عملی زندگی میں اپنانا بھی تعلیم کا ہی مقصد ہے۔

نصاب تعلیم Contet of Education

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے معلم تھے۔ آپ نے پہلی منظم درسگاہ مدینہ منورہ میں قائم فرمائی صفہ نامی چبوترہ پہلا مدرسہ تھا اصحاب صفہ اس کے متعلمین تھے اس مدرسہ میں ۷۰ یا ۸۰ طلبہ تھے حضور اکرم کے ساتھ دوسرے اصحاب کبار بھی معلم کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے تھے اس کے مالی نگراں حضرت معاذ بن جبل تھے وہی عطیات کو تقسیم کیا کرتے تھے۔ ان طلبہ میں سے مختلف افراد اسلامی حکومت کی مختلف خدمات پر مامور ہوتے رہتے تھے اپنی مالی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے یہ طلبہ خود بھی محنت مزدوری کرتے تھے اس کے علاوہ اہل ثروت بھی اس تعلیم گاہ کی مدد کرتے تھے حضور اکرم خود بھی ان کی مدد فرمایا کرتے تھے اس مدرسے نے اسلامی قلمرو میں تعلیم کی نہج قائم کی اور جو روایت اس میں پڑی وہی تعلیمی روایت بن گئی ہر جگہ حلقہ ہائے درس قرآن و حدیث قائم ہوئے ایک ایک مسجد میں کئی کئی حلقے بنے اور ایک ایک

حلقے میں سینکڑوں ہی نہیں بلکہ ہزاروں طلبہ شریک ہونے لگے جو اساتذہ متمول تھے وہ اپنی کفالت آپ کرتے لیکن جو ضرورت مند تھے ان کی کفالت بیت المال کرتا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باقاعدہ تنخواہیں اور وظیفے مقرر فرمائے ہر مسجد میں ایک مکتب اور ہر میدان تعلیم گاہ بن گیا۔ یہ نظام مستحکم اور ہمہ گیر تھا گھر گھر تعلیم پھیل رہی تھی۔ اس طرح Universal Education موجود تھی۔ قرآن اللہ پاک کا کلام اور اسلامی تعلیمات کا ماخذ ہے اس لئے اسے نصاب میں خاص اہمیت حاصل ہے قرآن کو پڑھنا سمجھنا لکھنا اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنا ہی نصاب تعلیم ہے چنانچہ حضور اکرم کا ارشاد ہے "خیارکم من تعلم القرآن وعلمہ" یعنی تم سے بہتر شخص وہ ہے جو قرآن کی تعلیم حاصل کرتا ہے اور دوسروں کو اس کی تعلیم دیتا ہے۔

گو دینی تعلیم پورے نظام کا مرکز و محور تھی لیکن دوسری ضرورتوں پر بھی پوری توجہ دی جاتی تھی صنعتی اور تجارتی تعلیم کا بھی انتظام تھا فنون سپہ گری کے لئے بے شمار ادارے تھے کتابت خطاطی طغری نویسی فن کوزہ گری فن تعمیر وغیرہ کی تعلیم کا بھی معقول انتظام تھا۔

تعلیم کے اس ہمہ گیر تصور اور انتظام کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ مدارس میں جو نصاب تعلیم رائج تھا اس میں اگر ایک طرف قرآن، فقہ منطق اور کلام کو اہمیت تھی تو دوسری طرف تاریخ طبعیات علم ہندسہ اور جغرافیہ کو بنیادی مقام حاصل تھا مولانا مناظر احسن گیلانی نے اس سلسلہ میں بالکل درست لکھا ہے کہ اس نصاب کا مقصد مسلمان کو حکومت کی سول سروس کے لئے تیار کرتا تھا تاکہ قضاء عدالت کی ضروریات کی تکمیل ہو سکے۔

طریقہ تعلیم Methods of Teaching

اسلام میں طریقہ تعلیم بھی خاص اہمیت کا حامل ہے سب سے اہم طریقہ لیکچر کا تھا معلم طلبہ کے سامنے لیکچر دیا کرتا تھا دوران لیکچر طلبہ کو حق تھا کہ وہ معلم سے سوالات کر سکیں جہاں تک اخلاق و سیرت کی تعمیر و تشکیل کا سوال تھا تو معلم بذات خود اپنا نمونہ پیش کرتا تھا۔ لوگ تیزی سے دائرہ اسلام میں داخل ہو رہے تھے چنانچہ ہر قبیلے کے تھوڑے سے لوگوں کو تعلیم دیدی جاتی تھی اور پھر وہ اپنے اپنے قبیلوں میں واپس جا کر درس و تدریس

شروع کر دیتے تھے تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہر قبیلے کے لوگوں کی ایک ایک جماعت حضور اکرم کی خدمت میں حاضر ہوتی جو ایک خاص مدت تک آپ کی خدمت میں رہتی گفتار کردار نشست و برخاست اور قول و عمل کی وابستگی کی تعلیم عملاً ہوتی جب آنے والوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تو مدینہ کے مختلف محلوں میں الگ الگ مسجدیں بن گئیں جن میں طلبہ کو بحث و مباحثہ کے مواقع دیئے جاتے تاکہ ان کو قابلیت اور ذہانت ظاہر کرنے کا موقع ملے۔ اس کے علاوہ رسمی تعلیم کا بھی سلسلہ جاری تھا۔ اور یہی درس کا مستقل طریقہ تھا اس میں عقائد شریعت اور اخلاق کے ساتھ ساتھ باقاعدہ لکھنے پڑھنے کی بھی تعلیم دی جاتی تھی قرآن پاک کو پڑھنا حفظ کرنا ثواب دارین خیال کیا جاتا تھا۔ قرآن پاک کی کتابت اور اسے باقاعدہ طور پہ جمع کرنے کا کام بھی جاری تھا جس شخص کو جتنا زیادہ قرآن پاک حفظ ہو نا وہ اتنا ہی زیادہ معزز خیال کیا جاتا تھا۔ تعلیم میں سب کو مساوی حقوق حاصل تھے دوسروں کی زبان کو سیکھنے پر خاص توجہ دی جاتی تھی تعلیم میں جنس کی تخصیص نہیں تھی مرد اور عورت دونوں پر تعلیم فرض تھی۔

حضور اقدس کے زمانہ میں تعلیمی اداروں اور معلمین کی کوئی قلت نہیں تھی مسجد نبویؐ ابتدا ہی سے تعلیم و تربیت کا مرکزی کردار ادا کر رہی تھی بلکہ اسلام کی ترویج کے ساتھ تعلیم و تربیت بھی ترقی کرتی جا رہی تھی اس زمانہ کے خاص ادارے مندرجہ ذیل اقسام کے تھے۔

ابتدائی اسکول Elementry Schools :۔ اس قسم کے ادارے مسلم ممالک کے ہر حصہ میں قائم کئے گئے جہاں مسلمان جاتے وہاں پر سب سے پہلے وہ مسجد بناتے بعض جگہ ان مساجد میں اور بعض مقامات پر مسجد سے ملحق مکتب قائم کیے جاتے ابتدائی تعلیم و تربیت بچہ کو یہی پر دی جاتی تھی بعض اوقات مساجد کے علاوہ بھی مکاتب قائم کر دیئے جاتے اکثر ایسا ہوتا کہ شوقین حضرات اپنے مکان کا کچھ حصہ مکتب کیلئے وقف کر دیتے جس میں وہ خود اور ان کے معتمد تعلیمی خدمات انجام دیتے تھے تعلیم حاصل کرنا اور تعلیم دینا دونوں ہی کار ثواب تھے۔

ان اداروں میں پڑھنا لکھنا ریاضی کے علاوہ قرآن پاک کی تعلیم پر خاص توجہ دی جاتی تھی یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ مساجد میں جو مکتب ہوتے تھے وہ زیادہ تر

مذہبی تعلیم پر ہی توجہ دیتے تھے جب کہ ان اداروں میں دیگر مضامین کا بھی درس دیا جاتا تھا حکمراں، روسا اور امراء تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا فرض منصبی سمجھتے تھے فاطمین مصر نے تو اعلیٰ خاندان کے بچوں کے لئے اپنے محلات میں اسکول قائم کر رکھے تھے۔ ابن ہیکل کے مطابق معلمین کے رہنے سہنے کا انتظام بھی ان اداروں میں ہی ہوتا تھا ان مدرسوں کا انتظام اور خرچ زیادہ تر حکومت برداشت کرتی تھی قاہرہ میں ابن زبیر نے بہت سے ادارے قائم کئے تھے۔ جہاں تک نصاب تعلیم کا سوال ہے تو یہ ملکی ضروریات کے مطابق مرتب کیا جاتا تھا مثلاً اسپین میں طلبہ کو دینیات لکھنا پڑھنا قواعد ریاضی اور ادب کی تعلیم دی جاتی تھی جبکہ دیگر ممالک میں زیادہ توجہ منطق ریاضی جغرافیہ طب اور طبیعیات پر دی جاتی تھی۔ تعلیم مفت تھی اتنا ہی نہیں بلکہ طلبہ کو وظائف بھی دیئے جاتے تھے۔ ہر مسجد اور مکتب کو حکومت کی طرف سے جاگیر ملی ہوتی تھی جس سے وہاں کا خرچ چلتا تھا بعض اوقات مخیر حضرات بھی مکتب اور مساجد کو امداد دیا کرتے تھے۔

اکاڈمی : Academies : اعلیٰ تعلیم کے لئے اکاڈمیز تھیں۔ عباسی خلیفہ المنصور نے اس قسم کی ایک اکاڈیمی قائم کی تھی۔ اسی طرح مامون نے بغداد میں جو "بیت الحکمہ" کے نام سے مشہور ہے اس اکاڈیمی میں ایک عظیم الشان رصدگاہ بھی اور اس سے ملحق ایک لیکچر ہال بھی تعمیر کیا گیا تھا اس قسم کی اکاڈیمیاں دیگر اصحاب نے بھی قائم کی جن میں علی بن یحییٰ اور جعفر بن محمد کے نام نامی بہت مشہور ہیں وزیر یعقوب نے بھی ایک اکاڈیمی تعمیر کی تھی جس میں وہ ایک ہزار دینار ماہوار اپنی جیب خاص سے خرچ کیا کرتا تھا۔ "دارالحکمہ" جس کو خلیفہ الحکم نے قائم کیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک رصدگاہ جو ضروری آلات سے مرصع تھی اور ایک لائبریری بھی تھی جس میں نادر کتب جمع کی گئیں۔

یونیورسٹیاں : Universities : اکاڈمی کے بعد یونیورسٹی کا نمبر تھا تمام ممالک اسلامیہ میں لاتعداد یونیورسٹیاں تھیں اس میں سب سے مشہور نظامیہ یونیورسٹی تھی نظام الملک جو اس کا بانی تھا وہ ایک صاحب علم شخص تھا جس کے علمی کارناموں کا تذکرہ اس مختصر سے تصنیف میں ناممکن ہے اس نے اس یونیورسٹی کو بغداد میں قائم کیا تھا جس میں امام الحرمین اور امام غزالی جیسے مدرسین تھے۔ دوسری مشہور زمانہ یونیورسٹی

مستنفریہ تھی جس کو خلیفہ المستنفر نے قائم کیا تھا۔ ان یونیورسٹیوں کے علاوہ اسپین میں قرطبہ اور غرناطہ کے دارالعلوم تھے۔ ان یونیورسٹیوں میں طلبہ کو وظائف بھی دیئے جاتے تھے چنانچہ بہت جلد اسی قسم کی یونیورسٹیوں کا تمام ممالک اسلامیہ میں جال سا پھیل گیا جس سے تعلیم کی اہمیت و افادیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

طلبہ اور اساتذہ یونیورسٹیوں میں ہی رہتے تھے جہاں پہ ان کی رہائش اور طعام کا مفت انتظام ہوتا تھا یہاں پہ علم الادب کے علاوہ قرآن پاک، شاعری وغیرہ بھی پڑھائے جاتے تھے عبدالملک نے سرکاری زبان عربی کر دی تھی اس لئے ذریعہ تعلیم عربی ہی تھی۔ جہاں تک طریقہ تدریس کا سوال ہے تو عموماً لیکچر کا طریقہ اپنایا جاتا تھا ہر پروفیسر کے کچھ مددگار ہوتے تھے جو سبق دہراتے جاتے تھے زیادہ تر توجہ یادداشت پر دی جاتی تھی معلم کے لئے ایک منبر ہوتا تھا جب کہ طلبہ اسٹول پر بیٹھتے تھے دوران تدریس معلم سے تحریری یا زبانی سوالات کئے جاتے تھے اگر کوئی معلم بچہ کو مطمئن نہیں کر پاتا تھا تو یہ باعث شرمندگی ہوتا تھا اس لئے معلمین بہت قابل ہوتے تھے۔

Monastry or Khanqah صوفیوں کی جائے رہائش بھی تعلیم و تربیت کے مراکز تھے ان میں عموماً وہ لوگ رہتے تھے جو دنیا کو چھوڑ کر یاد الہٰی میں مصروف رہنا چاہتے تھے۔ اور ساتھ ہی ساتھ دوسروں کو بھی ضبط نفس کی تعلیم دیتے تھے ان سے ملحق بڑی بڑی لائبریریاں ہوا کرتی تھیں علامہ عبداللطیف اپنے لیکچر خانقاہ میں ہی دیا کرتے تھے آٹھویں اور نویں صدی میں اس قسم کی خانقاہوں کا سارے بلاد اسلامیہ میں جال سا بچھا ہوا تھا۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ نے ایران اور عراق میں اس قسم کی خانقاہوں کا وضاحت سے تذکرہ کیا ہے۔

جہاں تک مضامین اور نصاب کا تعلق تھا تو قرآن پاک کی تعلیم کو بنیادی مقام حاصل تھا اس کے علاوہ علم کلام اور دیگر مضامین پر بھی خاطر خواہ توجہ دی جاتی تھی۔ مثلاً تاریخ فلسفہ فلکیات ریاضی اور دیگر سائنس وغیرہ ابن خلدون نے تمام مضامین کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے علوم طبیہ اور علوم نقلیہ اول الذکر کو مشاہدہ اور استقرائی طریقوں سے پڑھایا جاتا تھا جب کہ ثانی الذکر کو الہامی مضامین خیال کیا جاتا تھا اور

اس کو مختصر سات حصوں میں تقسیم کیا ہے تفصیل کو نظر انداز کر رہے ہیں۔

معلمین کا رتبہ Status of Teachers تدریس کو سب سے اعلیٰ متبرک اور ثواب کا کام تصور کیا جاتا تھا یہی وجہ تھی کہ بہت برگزیدہ ہستیوں نے اس کو اپنایا معلمین کی معاشرے میں بہت عزت کی جاتی تھی اکثر لوگ اس کو مفت اور شوقیہ انجام دیتے تھے کیونکہ وہ سنت نبویؐ کی پیروی کرتے تھے اس کے برعکس کچھ کو سرکار یا امرا و روسا وظائف بھی دیا کرتے تھے الاؤنس کے علاوہ ان کو نقد تنخواہیں بھی ملتی تھیں خاص خاص موقعوں پر ان کو خلعت بھی عطا کئے جاتے تھے بعض اوقات طلبہ کو بھی اسی طرح نوازا جاتا تھا۔

تعلیم بالغان Adult Education : اس پر خاص توجہ دی جاتی تھی کیونکہ عمر کی کوئی قید نہیں تھی۔ ان کو گلڈ یا مسجد کے حلقے میں تعلیم و تربیت دی جاتی تھی تعلیم نسواں پر بھی کافی توجہ دی جاتی تھی عورتوں کیساتھ بہتر سلوک کیا جاتا تھا معاشرے میں ان کی عزت و حشمت تھی۔ ابتدائی جماعتوں میں مخلوط تعلیم تھی۔

امتحان Examination امتحان کا نہایت منظم اور مضبوط طریقہ رائج تھا معلمین کو بھی امتحان دینے پڑتے تھے ان کے لئے مضمون پر عبور اور مہارت کو کافی سمجھا جاتا تھا ان کو مختلف تنظیموں سے سرٹیفیکٹ بھی ملتے تھے لیکچر یا تدریس کے اوقات مقرر نہیں تھے معلم کی خواہش پر منحصر تھا کہ وہ اپنے سبق کو کتنے وقت میں مکمل کرتا ہے جمعہ کے علاوہ خاص خاص تہواروں کی چھٹیاں بھی ہوا کرتی تھیں کوئی خاص نصاب اور کتب مقرر نہیں تھیں اور نہ ہی موجودہ زمانہ کی طرح کسی خاص جماعت میں مقرر مدت تک رہنا ضروری تھا۔ درج ذیل میں کچھ مثالیں قلم بند کر رہے ہیں جس سے ناظرین کو تعلیم کی اہمیت و افادیت کا مختلف ادوار میں بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

مورخ طبری نے ولید کی سیرت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ بنی مخزوم سے ایک شخص ولید کے پاس آیا اور اس نے اس سے مدد مانگی ولید نے اس سے معلوم کیا۔ کیا تمہیں قرآن پاک" پڑھنا آتا ہے اس شخص نے جواب دیا" نہیں" ولید نے اس کو پاس بلا کر اس کا عمامہ اتار لیا اور اس کو خوب مارا اور ایک شخص کو حکم دیا کہ اسے اپنے ساتھ اس وقت تک رکھے جب تک یہ قرآن پڑھنا نہ سیکھ لے (طبری ۹۸) مہدی کے بارے

میں تبصرہ کرتے ہوئے طبری رقم طراز ہے (۱۸، ۲۰) وہ بڑا صاحب علم اور علم نواز تھا۔ اس نے بغداد میں بے شمار مدارس کھولے بغداد یونیورسٹی کی بنیاد رکھی۔ دارالترجمہ قائم کیا۔ رومی اور یونانی فلاسفہ کی بہت سی کتابیں نقل کرائیں۔ رصد گاہیں قائم کیں وہ ہر سال لاکھوں اشرفیاں اس کام پر صرف کرتا وہ شعراء کا بڑا قدردان تھا شاعروں کو ایک ایک غزل پر چالیس چالیس ہزار درہم بخش دیتا۔

ہارون الرشید کے دور میں علوم و فنون نے جو ترقی کی اس پر الخطیب جیسے بزرگوں نے کئی کئی جلدیں لکھی ہیں اس کے دور کے علماء میں عبداللہ بن مبارک، قاضی ابو یوسف، قاضی محمد، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، الجاحظ، ابو نواس، ابو العتاہیہ، اسحاق موصلی، ابراہیم موصلی، ابن جامع، محمد النمازی وغیرہ جیسے عالم موجود تھے خطیب بغدادی اور مورخ الدمشقی کا بیان ہے کہ خلیفہ ہارون کے دور میں صرف بغداد میں کتابوں اور وراقوں کی بیس ہزار دکانیں تھیں دجلہ کے مشرقی پل کے ساتھ ایک پورا بازار کتابوں کی خرید و فروخت کے مخصوص تھا۔

اس دور میں بڑی اعلیٰ تصانیف ہوئیں۔ الجاحظ جیسے بڑے فلسفی حکیم اور ادیب نے لاتعداد موضوعات پر کئی کتابیں لکھیں اخوان الصفا نے اپنا فلسفہ مرتب کیا حدیث کے مجموعے تیار ہوئے تفسیریں لکھی گئیں اور حد تو یہ ہے کہ یونانی فلسفہ کو نیا جامعہ پہنایا گیا۔ یونانی فلسفہ کے تراجم کئے گئے۔

مورخ الندیم کا بیان ہے کہ مامون نے یونانی حکماء کی کتابوں کو یونان اور روما کے دفینوں سے نکلوانے کے لئے ایک سفارت بھیجی پہلے تو شاہ روم آمادہ نہ ہوا لیکن پھر آمادہ ہو گیا اور مامون نے بیت الحکمت کے بڑے علماء میں سے ایک جماعت منتخب کی جس میں حجاج بن مطر، ابن البطر بن مسلم اور ان کا عملہ شریک تھا۔ جو کتابیں وہاں سے لائی گئیں ان میں ہندسہ، موسیقی اور طب کی بھی تھیں مامون کے زمانہ میں بیت الحکمت یا ادارہ ترجمہ و تالیف اتنا بڑا تھا کہ اس پر شاہی دربار کا دھوکا ہوتا تھا اس میں ڈیڑھ سو افراد کام کرتے جن کو تنخواہ میں سونا تول کر دیا جاتا تھا۔

ابن البغدادی اور علامہ مقری کا بیان ہے کہ الحکم کو اچھی کتابیں خریدنے کا اس

قدر شوق تھا کہ اس کے سفیر ملک، ملک اور ریاست، ریاست پھرتے جہاں کہیں کسی بڑے عالم کا شہرہ سنتے اس کے پاس جاکر آرڈر بک کرا دیتے۔ الحکم نے دس ہزار خطاط اس لئے ملازم رکھے تھے کہ وہ بڑی کتاب کی نقلیں کریں اور یہ نقلیں مختلف سرکاری کتب خانوں اور مدارس میں بھیجی جاتی تھیں اس حاکم نے اندلس کے عوام کی تعلیم و تربیت پر بڑی توجہ دی اس نے قرطبہ یونیورسٹی پر دو لاکھ اکسٹھ ہزار پانچ سو ستیس اشرفیاں آج کل کے حساب سے ڈھائی کروڑ روپیہ صرف کیا ہر اندلس بچہ جس دن سے مکتب میں بیٹھتا اس دن سے لیکر قرطبہ یونیورسٹی کی ڈاکٹریٹ کی ڈگری تک اس سے کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی بیان کیا جاتا ہے کہ قرطبہ میں کتابیں فروخت کرنے والوں کی دکانیں بیس ہزار تھیں۔ ان خلدون کے مطابق الحکم کی اپنی لائبریری میں چار لاکھ کتابیں تھیں جن میں سے ہر ایک پر اس نے اپنے نوٹ بھی لکھے تھے۔

جہاں تک برصغیر ہند و پاک کا سوال ہے تو یہاں پر دعوت اسلام دورِ رسالت اور دورِ خلافت راشدہ میں پہونچ گئی تھی۔ پھر بنوامیہ کے دور میں محمد بن قاسم نے ایک بڑا علاقہ فتح کر لیا اس کے بعد محمود غزنوی اور پھر محمد غوری نے یہاں پر حملے کئے محمد غوری قطب الدین ایبک کو یہاں کا حکمراں مقرر کر کے چلا گیا۔ قطب الدین سے بہادر شاہ ظفر تک قریبًا ساڑھے چھ سو سال مسلمان حکمران رہے اور اس دور میں مسلمانوں نے اپنے نظام تعلیم کو نشوونما دینے کی ہر طرح کوشش کی اس دور کے تعلیمی نظام اور سرگرمیوں کے مطالعہ سے جو اہم باتیں سامنے آتی ہیں ان کا لب لباب مندرجہ ذیل ہے۔

۱. تعلیم کا مزاج قرن اول میں تھا وہی یہاں پر بھی رہا تعلیم کا مرکز دین اسلام رہا اور تمام تعلیمی سرگرمیاں اسی محور کے گرد گھومتی رہیں تعلیم کو عبادت تصور کیا گیا جس میں اہل علم کا طریقہ تھا کہ کسی باقاعدہ مدرسے سے وابستہ ہو جاتے یا اگر نہ بھی ہوں تو علم کی اشاعت کے ذریعہ اس کی زکوٰۃ برابر نکالتے رہتے تھے۔

۲. برصغیر میں شروع ہی سے باقاعدہ مدارس کا نظام قائم ہوا لیکن تعلیم کا ذریعہ صرف مدارس ہی نہ تھے ابتدائی تعلیم گھر پر دی جاتی تھی پھر قدیم اسلامی روایت کے مطابق مساجد تعلیم کا مرکز ہو گئیں اہل علم کے مکانات بھی مستقل تعلیمی مراکز کی حیثیت

رکھتے تھے کتب خانے محض لائبریری کی حیثیت نہ رکھتے تھے بلکہ اعلیٰ تعلیم کا اہم مرکز تھے۔ نیز بڑے پیمانے پر تعلیمی مجالس کا ذکر بھی تذکروں اور تواریخ میں ملتا ہے۔

۳۔ یہ چیز بھی قابل غور ہے کہ گو دینی تعلیم پورے نظام کا مرکز و محور تھی لیکن دوسری ضرورتوں سے کسی زمانے میں بھی اور کسی سطح پر غفلت نہیں برتی جاتی تھی۔ صنعتی تعلیم کا انتظام کارخانوں میں تجارتی تعلیم کے لئے مہاجنی اسکول تھے جہاں تجارتی ہندسہ اور تجارت کے اصولوں کی ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی۔ فنونِ سپہ گری کی تعلیم کے لئے بے شمار ادارے تھے کتابت خطاطی طغریٰ نویسی فن کوزہ گری فن تعمیر وغیرہ کی تعلیم کا بھی انتظام تھا۔ اہل فن کے گرد طالبان علم کا ہجوم رہتا تھا جو اپنے اپنے فن میں یکتائے روزگار فن کار تیار کرتے تھے ان کے لئے باقاعدہ مدارس اور اکیڈمیوں کا بھی پتہ چلتا ہے اس سے اس نظام تعلیم کی وسعت اور ہمہ گیری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ تعلیم کے اس ہمہ گیر تصور اور انتظام کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جاتا ہے کہ مدارس میں جو نصاب تعلیم رائج تھا اس میں ایک طرف قرآن فقہ منطق اور کلام کو اہمیت دی گئی تھی تو دوسری جانب تاریخ طبیعیات علم ہندسہ اور جغرافیہ کو بنیادی مقام حاصل تھا۔

تعلیم میں وقتی تقاضوں کی کفالت کا بھی خیال رکھا جاتا تھا جس کا اندازہ اورنگزیب کی اس گفتگو سے بہ آسانی کیا جا سکتا ہے جس میں مخاطب ملا صالح تھے جو شاہی خاندان کی تعلیم پر مامور تھے بحوالہ برنیر کا سفر ''کیا میرے معلم کا یہ فرض نہ تھا کہ مجھے روئے زمین کی ہر قوم کے امتیازی خصائص سے روشناس کراتا مجھے علم ہونا چاہیئے کہ ان اقوام کے وسائل اور ان کی طاقت کیا ہے ان کے آداب و اطوار، مذاہب وطرز حکومت طریق جنگ وغیرہ کیا ہیں اور وہ کون سے امور ہیں جن میں یہ دلچسپی رکھتی ہیں اور پھر یہ بھی ضروری ہے کہ باقاعدہ تعلیمی کورس کے ذریعہ بتایا جاتا ہے کہ ریاست کا آغاز کیسے ہوا؟ قوموں کے عروج وزوال کے اسباب کیا ہیں؟ اور وہ کون کون سے اسباب وعوامل اور حوادث ہیں جن کی بنا پر عظیم تبدیلیاں اور عظیم بالشان انقلاب رونما ہوتے رہتے ہیں''۔ یہ ہے وہ وسیع تصور جو مسلمانوں کے پیش نظر رہا۔

۴. اس دور میں جس پیمانے پر تعلیم تھی آج اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے ابھی مسلمانوں کو ہندوستان میں آئے ہوئے ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ اس ملک میں جہاں تعلیم صرف برہمنوں اور پنڈتوں کی اجارہ داری خیال کی جاتی تھی اور جہاں شودر کے کان میں مذہبی کتب کے الفاظ پڑجانے پر اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالدیا جاتا تھا ہر طرف تعلیم و تعلیم کا زور ہوگیا اور اس طرح پورا ملک علوم و فنون کا گہوارہ بن گیا سلطان محمد بن تغلق کے بارے میں مقریزی رقم طراز ہے۔

" سلطان محمد تغلق کے عہد میں دہلی کے اندر ایک ہزار اسلامی مدارس قائم تھے جن میں شوافع کا بھی ایک مدرسہ تھا مدرسین کے لئے شاہی خزانے سے تنخواہیں مقرر تھیں تعلیم اس قدر عام تھی کہ کنیزیں تک حافظِ قرآن اور عالم ہوتی تھیں مدارس میں علوم دینیہ کے ساتھ معقولات اور ریاضی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی"

صبح الاعشیٰ کا مصنف بھی اس کی شہادت دیتا ہے کہ یہ مدارس معمولی قسم کے نہیں تھے بلکہ ان میں ایسے ایسے مدارس بھی تھے جو آج کی یونیورسٹیوں سے بھی بالاتر تھے مدرسہ فیروز شاہی کے بارے میں مشہور مورخ ضیاء الدین برنی رقم طراز ہے۔

" دہلی کا یہ مدرسہ اپنی شان و شوکت، خوبی عمارت، محل وقوع حسن انتظام اور تعلیم کی عمدگی کے لحاظ سے بے نظیر ہے مصارف کے لئے شاہی وظائف مقرر ہیں پایہ تخت دہلی کی کوئی عمارت حسن تعمیر اور مواقع و محل کے لحاظ سے مدرسہ فیروز شاہی کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ مدرسہ کی عمارت بہت وسیع ہے اور ایک بہت بڑے باغ کے اندر تالاب کے کنارے واقع ہے ہر وقت سینکڑوں طلبہ اور علماء فضلاء یہاں موجود رہتے ہیں طلباء و اساتذہ کے مکانات بنے ہوئے ہیں جو باغ کے کنجوں میں سنگ مرمر کے فرش پر نہایت آزادی کے ساتھ علمی مشاغل میں منہمک نظر آتے ہیں"۔

capt. Alexender Hamilton)

عہد اورنگ زیب کا مشہور سیاح کپتان الیگزنڈر ہملٹن اپنے سفرنامہ سندھ میں صرف ایک شہر ٹھٹھہ کے بارے میں لکھتا ہے "۔ وہاں مختلف علوم و فنون کے چار سو مدرسے ہیں۔

یہ کیفیت ایک شہر کی نہیں بلکہ ہر شہر کی تھی ایک دور کی نہیں بلکہ مسلمانوں

کے پورے دور حکمرانی کی تھی مسلمانوں کے پورے دور حکومت میں خواندگی ہی نہیں تعلیم کا معیار بھی بہت بلند تھا. اس کی سہولتیں شہر شہر قصبہ قصبہ دیہات دیہات محلہ محلہ گھر گھر پہونچی ہوئی تھیں اور وہ حالت تھی جسے آج کے ماہرین تعلیم Universal Education کے نام نامی سے پکارتے ہیں۔

۵۔ مسلمانوں کے نظام تعلیم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ خالص عوامی تھی حکومتیں تعلیم کے فروغ کے لئے بے پناہ روپیہ خرچ کیا کرتی تھیں لیکن کسی زمانہ میں بھی نظام تعلیم حکومت کے تابع نہیں تھا کوئی ایک محکمہ ایسا نہ تھا جو تعلیمی اداروں پر حکومت کی طرف سے کنٹرول رکھتا ہو۔ سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کے دور میں صدر الصدور کے ایک عہدے کا تذکرہ ضرور ملتا ہے جس کا کام تعلیمی اور اخلاقی امور کی نگرانی تھا۔ لیکن صرف اس حد تک کہ تعلیمی ضروریات پوری ہوں مدرسوں کی آزاد فضا پر اس کا کوئی اثر نہ تھا اور نہ ہی یہ نصاب تعلیم کو کنٹرول کرتا تھا. اس شعبہ کا ایک کام یہ بھی تھا کہ جو اچھے باصلاحیت نوجوان نظر آئیں ان کو فتاوی اور قضاۃ کی ذمہ داریوں کے لئے منتخب کرے مسلمانوں نے پورے دور حکومت میں کبھی بھی نصاب تعلیم کو کنٹرول نہیں کیا. ہر مدرسہ اپنا نظام خود ہی چلاتا تھا حتیٰ کہ مدارس جو سرکاری خزانے سے قائم ہوتے تھے وہاں بھی اساتذہ آزاد تھے اگر کسی بڑے عالم نے نصاب میں کوئی تبدیلی کی اسے اپنی صحت اور علمی برتری کی بنا پر تو قبول عام حاصل ہوتا لیکن ریاست کی قوت قاہرہ کے ذریعہ اسے مسلط نہیں کیا گیا تعجب یہ ہے کہ اس کے بغیر بھی پورے نظام میں غیر معمولی ہم آہنگی اور مطابقت پائی جاتی تھی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ہماری ثقافتی قوتوں کی گرفت معاشرے پر اتنی مضبوط تھی کہ فطری انداز میں تعلیم میں یگانگت اور یک رنگی پیدا ہوئی اس آزادی کے باوجود بھی دور جدید میں کسی بھی ملک میں اس کی مثال مشکل ہی سے نظر آئے گی۔

اہل یونان تعلیم میں آزادی کے قائل تھے جو ایک مخصوص طبقے کو حاصل تھی اور جس نے تعلیم کو ذہنی ورزش بنا لیا تھا چین میں بھی تعلیم پر خاندان اور حکومت دونوں کی مضبوط گرفت تھی ہندوستان میں آزادانہ تعلیم کا تصور ہی ناممکن تھا. لیکن جب مسلمانوں نے ریاست کی طرف سے تعلیم کی حوصلہ افزائی کی اور

غیر معمولی امداد کے باوجود ایک آزادانہ تعلیمی نظام قائم کیا جس میں تعلیم کا محور صرف استاد تھا اور نظم وضبط کو قائم رکھنے والی قوت اخلاق تھی جو ایک عجیب وغریب تجربہ تھا جس کی نظیر تاریخ میں ملنی محال ہے جس کی بنیادی وجہ اسلام کا مخصوص مزاج اور اس کی قائم کردہ معاشرتی جمہوریت ہے جس سے دنیا کے دوسرے نظام آج تک ناآشنا ہیں۔

۶۔ ایک طرف یہ آزادی تھی اور دوسری طرف حکومت کی سرپرستی کا عالم یہ تھا کہ وہ تعلیم کو اپنے تمام فرائض سے زیادہ اہم خیال کرتی تھی اس کا اندازہ اس جملے سے بخوبی ہو سکتا ہے جو نظام الملک طوسی نے ملک شاہ سلجوقی کے جواب میں کہا تھا وجہ یہ تھی کہ ملک شاہ کو ایک بار تعلیم کے غیر معمولی اخراجات پر کچھ تشویش ہوئی اور اس نے کہا کہ اگر یہی رقم فوج پر خرچ کی جاتی تو ایک لشکر جرار تیار ہو سکتا ہے نظام الملک نے جواب دیا۔

"اے بادشاہ! تیری فوج کے تیر تو فقط چند قدم پر کام دے سکتے ہیں لیکن میں جو فوج تیار کر رہا ہوں اس کے تیر زمین کے سارے طول وعرض میں موثر ہیں اور اس کی دعائیں اور حسنات کے تیر زمین کی سپر سے بھی نہیں رک سکتے"

حکومت اس زمانہ میں تعلیم کو تجارت خیال نہیں کرتی تھی اور نہ ہی خزانے پر بار تصور کیا جاتا تھا بلکہ دنیا وآخرت دونوں کو سنوارنے کا ذریعہ اسی کو تصور کیا جاتا تھا۔ قطب الدین ایبک سے بلبن تک جو سلطان گزرے ہیں انہوں نے بڑے پیمانے پر مدارس قائم کیے اور مساجد بھی بنوائیں فیروز شاہ تغلق کے بجٹ میں ۱۳۶ لاکھ تنکہ وظائف وغیرہ کے لئے مخصوص تھا لیکن اس کا زیادہ تر حصہ تعلیم کے فروغ کے لئے استعمال ہوتا تھا اس نے ۳۰ کالج اور ایک یونیورسٹی دہلی میں قائم کی جس کا سارا خرچ سرکاری خزانے سے پورا کیا جاتا تھا۔

بہمنی اور دکن کی حکومتیں بھی تعلیم پر زر کثیر خرچ کرتی تھیں مغل بادشاہوں میں علم کی سرپرستی میں ایک سے ایک بڑھا ہوا تھا جہانگیر کے بارے میں تاریخ جہان جہاں کا مصنف رقم طراز ہے۔

"اس نے (جہانگیر) مدارس کو از سر نو تعمیر کروایا ان مدارس کو جو تیس تیس

سال سے بند پڑے تھے اور جن میں چرند و پرند کا بسیرا تھا اس نے ان کو کھول کر ایک بار پھر طلبہ اور اساتذہ سے بھر دیا "۔

اورنگ زیب نے تعلیم پر بہت خرچ کیا اس ضمن میں H. G. Keane یوں گوہر فشانی کرتا ہے "اس نے لاتعداد اسکول اور کالج قائم کئے "۔

(" The Fall of Moghal Empire P. 23.)

" محمد شاہ جو تاریخ میں رنگیلا کے نام سے مشہور و معروف ہے تعلیم پر بے دریغ روپیہ صرف کرتا تھا حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا مشہور دارالسلام اس کی علمی فیاضیوں کا جیتا جاگتا مرقع ہے۔ یہ تھا مسلمان حکومتوں کا حال اس روش پر مسلمان امرار اعیان حکومت زمیندار جاگیردار اور دوسرے اہل ثروت عمل کرتے تھے اس سلسلہ میں مولانا غلام علی آزاد بلگرامی اپنے صوبہ اودھ کا حال اس طرح تحریر کرتے ہیں۔ " پورے صوبے اودھ اور صوبہ الہ آباد کے بڑے حصے میں پانچ پانچ کوس زیادہ سے زیادہ دس دس کوس کے فاصلہ پر شرفا اور عالی خاندان لوگوں کی آبادی ہے جن کو سلاطین و حکام کی طرف سے تنخواہ و جاگیریں ملتی ہیں انہوں نے مساجد مدارس اور خانقاہیں تعمیر کر رکھی ہیں اور اساتذہ و مدرسین ہر جگہ علمی فیض رسانی میں مشغول ہیں۔ انہوں نے طالب علم کا ایک جذبہ و ولولہ پیدا کر رکھا ہے طلبہ گروہ در گروہ اور فوج در فوج ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل ہوتے رہتے ہیں اور جہاں موقع دیکھتے ہیں۔ اور اس جماعت کی خدمت کو سعادت عظمیٰ شمار کرتے ہیں شاہجہاں کا قول تھا کہ پورب شیراز مملکت ماست "

ایک اور قابل غور چیز یہ ہے کہ تعلیم ہمیشہ Free Education مفت رہی مسلمانوں نے اپنے تاریخ کے کسی دور میں بھی اس تصور کو قبول نہیں کیا کہ علم ایک قابل خرید و فروخت چیز ہے اور اس کی بھی اسی طرح منڈیاں ہونی چاہیں جس طرح آٹے چاول کی ہوتی ہیں۔ یہ تصور تو خالص مغرب کی پیداوار ہے جو مادہ پرستانہ تہذیب کا عطیہ ہے۔

ہند و پاک کے نظام تعلیم میں نہ صرف یہ کہ تعلیم مفت اور عام تھی بلکہ طلبہ کے بود و باش اور خورد و نوش کا بھی پورا انتظام کیا جاتا تھا اور جیب خرچ کے لئے غریب

طلبہ کو سرکاری ذرائع اور امراء کی طرف سے بھی وظائف دیئے جاتے تھے کچھ مدرسے ایسے تھے جو نہایت شان و شوکت کے ساتھ یہ ضروریات پوری کرتے مدرسوں اور مساجد میں بڑی تعداد میں حجرے ہوتے تھے جو ہوسٹل کا کام دیتے تھے۔

۸۔ اس نظام کی ایک اور خصوصیت استاد اور شاگرد کا قلبی تعلق تھا تعلیم کا محور استاد تھا جس کی حیثیت معلم اور مربی کی تھی اساتذہ کا کردار شاہی ہوتا تھا۔ ان کی ایثار و قربانی اور اخلاص اور تعلیمی انہماک کا حال دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ اسلام کیسے کیسے نمونے تیار کر سکتا ہے اور کس تعداد میں اساتذہ کا تعلق اپنے شاگردوں سے کیا تھا اس کا اندازہ مشہور مدرس حکیم علی گیلانی کے بارے میں "تذکرہ علمائے ہند" کے اس جملہ سے لگایا جا سکتا ہے۔

"ہمیشہ طلبہ را درس گفتے بے ایشاں طعام نہ خوردے"۔

(منتخب التواریخ فرشتہ ۱۵) ترجمہ ہمیشہ طلبہ کو درس دیتے اور ان کے بغیر کھانا نہ کھاتے۔

اپنے طلبہ کا ان کو کتنا خیال تھا اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ جب ملک العلماء مولانا عبدالعلی بحر العلوم کو منشی حیدرالدین نے بہار (بڑوان) آنے کی دعوت دی تو مولانا نے عذر فرمایا کہ ان کے ساتھ سو طلبا ہیں اور جب تک ان کے قیام و طعام کا انتظام نہ ہو وہ نہیں آ سکتے۔

(ہندوستانی مسلمان از مولانا ابوالحسن)

۹۔ پھر اس نظام میں صرف استاد اور شاگرد میں قلبی تعلق ہی نہ تھا بلکہ استاد طلبہ کے تزکیہ نفس اور اصلاح باطن کی فکر بھی کرتے تھے اور انہیں ہر وقت یہ خیال دامن گیر رہتا تھا کہ طلبہ کا معیار علم ہی بلند نہ ہو ان کا معیار اخلاق بھی بلند ہو اور وہ اچھے انسان اور اچھے مسلمان بن کر نکلیں اگر اس معاشرے میں تقویٰ ایفائے عہد، عصمت و عفت ایثار و قربانی صلہ رحمی، اخلاق و مروت، ہمدردی و اخوت کا دور دورا تھا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ تعلیم ایک اخلاق ساز قوت کا رول ادا کرتی تھی۔

۱۰۔ اس دور کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم میں جمود نہیں تھا یہ نظام

نئی نئی پیدا ہونے والی ضرورتوں کو پورا کر رہا تھا اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نظام کے تیار کردہ افراد محض مجروں کی زینت نہ تھے بلکہ نظام حکومت کو بھی چلا رہے تھے اور حکمت و دانشمندی کے ساتھ چلا رہے تھے اگر درخت کو اس کے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے تو اس نظام کو ان شخصیات سے پرکھا جا سکتا ہے جن کو اس نے تیار کیا اور جنہوں نے زندگی کے ہر شعبے میں نام پیدا کیا۔

اس سے پیشتر کہ ہم کچھ مسلم ماہرین تعلیم کا تذکرہ کریں بہتر یوں معلوم ہوتا ہے کہ مختلف علوم پر مسلمانوں کے کارناموں پر بھی اجمالاً نظر ڈالتے چلیں تاکہ وہ لوگ جو تاریخ اسلام کو قتل و غارت گری کی داستان سے موسوم کرتے ہیں ان کو اپنی لاعلمی کا اندازہ ہو سکے۔

تاریخ نویسی:۔ عربوں کو تاریخ نویسی کا ہمیشہ شوق رہا ہے قرآن پاک میں خود بہت سے ایسے قصص ملتے ہیں جن کا گزشتہ پیغمبران کی امتوں اور قوموں کی تاریخ سے گہرا ربط و تعلق ہے مثلاً بنی اسرائیل کا قصہ ہاروت و ماروت کا واقعہ حضرت ابراہیم اور نمرود کا ذکر، اصحاب فیل کی کعبہ پہ چڑھائی کا واقعہ وغیرہ وغیرہ ان میں سے اکثر واقعات احادیث نبوی میں موجود ہیں اس طرح عہد نبوی سے سیر و مغازی کی بنیاد پڑ گئی تھی لیکن چونکہ عہد رسالت اور خلافت راشدہ کے زمانے میں تبلیغ اسلام اور جنگی مہموں کی وجہ سے تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دینے کی مہلت نہ مل سکی لہٰذا بنی امیہ کے دور سے ابتدا ہوئی امیر معاویہ کو تاریخ سے بڑی دلچسپی تھی مسعودی نے اس کا وضاحت سے تذکرہ کیا ہے چنانچہ ان کے عہد میں عبید بن شریہ ان کے دربار سے منسلک تھا۔ چنانچہ اس نے کتاب المثال اور" کتاب الملوک واخبار المعاصین تالیف کی تھیں دوسرا مورخ" عوانہ بن کلبی تھا جس نے کتاب التاریخ لکھی لیکن اس فن کو عروج بنو عباس میں نصیب ہوا اس دور کے مشہور مورخین علامہ ابن اسحٰق" جس نے سیرۃ النبوی تصنیف کی موسیٰ بن عقبہ نے آنحضرت کے مغازی پر ایک کتاب لکھی چنانچہ ابو محنف کلبی واقدی محمد بن حارث نصر بن مزاحم کوفی، عبداللہ بن سعد زہری عبدالرحمٰن بن عبدہ طبری محمد بن سعد احمد یحییٰ بلاذری نے فتوح البلدان

نساب الاشرف ابن قتبیہ کی کتاب المعارف اور احمد بن داودی کی اخبار الطوال احمد بن داوُد دینوی نے اپنی کتاب اخبار الطوال تاریخ یعقوبی، طبری کی مایہ ناز تصنیف تاریخ اخبار الرسل و الملوک ابوالحسن علی المسعودی ۳۰ جلدوں میں لکھی۔ علامہ ابن اثیر، ابن خلکان، ابن مسکویہ، ابوالفدا، علامہ ابن جوزی ابن قوتیہ، ابن حیان، ابن الخطیب عبدالرحمٰن ابن خلدون جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے تو یہاں کے مشہور ومعروف مورخین البوریحان محمد بن البیرونی ابن بطوطہ قاضی منہاج الدین سراج جوزجانی، ضیاءالدین برنی سراج الدین عفیف، حسن نظامی امیر خسرو بابر نے خود سوانح عمری ترکی زبان میں لکھی ہمایوں نامہ جس کو جوہر نے لکھا ابوالفضل کا اکبر نامہ آئین اکبری، نظام الدین نے طبقات اکبری عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ تاریخ الفی اور عباس خاں کی تاریخ شیر شاہی جہانگیر نے سوانح عمری لکھی جو تزک جہانگیری کے نام سے مشہور ہے تاریخ خاں جہانی عبدالحمید لاہوری، محمد صدیق خاں عالمگیر کے زمانہ میں عالمگیر نامہ ماثری عالمگیر منتخب الباب واقعات عالمگیری ان کے علاوہ لاتعداد تاریخی کتب لکھی گئیں جن کا ذکر کرنا مشکل ہے۔

جغرافیہ: مسلمانوں کو تجارت اور سیاحت کا شوق تھا اس لئے انہوں نے اس فن میں بھی لاتعداد کارنامے انجام دیئے ان سفرناموں میں سب سے مشہور سفرنامہ سلیمان السیرافی کا ہے لیکن جغرافیہ پر سب سے پہلی تصنیف صورت الارض کے نام سے الخوارزمی کی ہے اس میں ایک نقشہ بھی ہے اس شخص کا جغرافیہ میں بڑا کارنامہ ہے لیکن ہم تفصیل سے گریز کر رہے ہیں اس کے بعد ابن خرادزبہ، الیغوبی، ہمدانی، ابن رستہ، ابن واضح الیعقوبی ہے کتاب البلدان فقیہ ہمدانی ابوزید بلخی، اصطخری، ابن حوقل المقدسی، مسعودی، ابن فضلائی ہمدانی۔ البیرونی، ادریسی ابن جبیر، ابن بطوطہ، یاقوت وغیرہ خاص گزرے ہیں۔

ہیئت اور نجوم عربوں کو شروع ہی سے علم نجوم اور علم ہیئت سے دلچسپی تھی وہ کواکب کے طلوع وغروب اور ان کی حرکات وسکنات سے بڑی حد تک واقف تھے اسلام علم نجوم کے خلاف ہے چنانچہ نجوم اور ہیئت کو عہد رسالت اور خلافت راشدہ میں ترقی کا موقع نہ مل سکا لیکن عباسیوں کے دور میں علم ہیئت اور نجوم کو فروغ ہوا منصور

کو اس کا بہت شوق تھا چنانچہ اس کے دربار میں نوبخت نام مشہور منجم تھا اس کے بعد ابو لہل، ابراہیم فرازی محمد بن فرازی، اس میں مشہور کتب کتاب العقیدہ فی النجوم کتاب الحمل بالاصطرلات کتاب المقیاس النزول کتاب الحمل بالاصطرلات طرح ہندوستانی کتاب سدھانت کا بھی ترجمہ کیا گیا منصور کے بعد ہارون کے عہد میں ابن بطریق اور ماشاء اللہ نے بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ عمر بن فرخان اور حجاج بن یوسف نے بھی خاطر خواہ کام انجام دیئے مامون کے عہد میں اس کو عروج حاصل ہوا۔ اس نے ایک رصدگاہ تیار کرائی جس کے مہتمم سید بن علی اور یحیٰ بن منصور تھے اس سے آفتاب اور دوسرے سیارے اور ثوابت کے حالات معلوم کیئے جاتے تھے پھر اسی طرح کی دوسری رصدگاہ دمشق میں اجرام فلکی کے مطالعہ کے لئے بنائی گئی اس عہد کا منجم و ریاضی داں محمد بن موسیٰ الخوارزمی۔ اس کے علاوہ احمد فرغانی جس نے کتاب المدخل الی علم ہیئت الافلاک نویں صدی کے مشہور ہیئت داں موسیٰ بن شاکر کے تین لڑکے محمد، احمد اور حسن انہوں نے کرہ ارض کی پیمائش کی جس کے مطابق زمین کا محیط ۲۴ ہزار میل ہے ابو المعشر نے ستاروں کی گردش کا سائنسی انداز میں مطالعہ کیا اور ایک جدول تیار کیا جو آج تک لاثانی خیال کیا جاتا ہے ثابت بن قرہ، البتانی، ابو الوفا، فارابی البیرونی، عمر خیام نصیر الدین طوسی وغیرہ ہیئت اور نجوم میں کسی تعریف کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ بھی لاتعداد گزرے ہیں جن کا تذکرہ ناممکن ہے۔

طب اور جراحی کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی انسان کی دور قدیم میں دو طریقے ۱۔ ٹوٹکے، جھاڑ، پھونک اور دعائیں وغیرہ ۲۔ جڑی بوٹیوں سے علاج۔ اسلام کے ظہور کے وقت یہی طریقے تھے دورِ رسالت اور خلافت راشدہ میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی قرآن و حدیث میں علاج اور صحت کے متعلق ہدایات اور مشورے موجود ہیں حضور کا فرمان " صفائی نصف ایمان ہے " وغیرہ مسلمانوں نے طب کی اہمیت کو ابتدا میں ہی محسوس کر لیا تھا دور امیہ میں لوگ اس تعلیم کے لئے ایران گئے جن میں حارث بن کلادہ، نضر، ابن اثال، ماسرجویہ مشہور ہیں۔

عہد عباسی میں اس پہ بھی توجہ خاص دی گئی اس میں جورجیس بن بختیشوع جو رجیس طبی درسگاہ کا افسر اعلیٰ تھا یوحنا بن ماویہ ان لوگوں نے طب کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ

کیا۔ اس کی اپنی تصنیف "کتاب العین ہے جو آنکھوں کے علاج پر مایہ ناز شاہکار ہے "دخل العین" یہ بھی امراض چشم پر ہے ابن ماسویہ نے بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا یحیٰی برکلی نے ہندوستان طبیب منکہ کی کتاب کا ترجمہ کیا اور ایک طبیب بغداد سے منکہ کے پاس بھیجا تاکہ صحت کتاب ہوسکے ہندوستان سے کنکہ شایان جودر وغیرہ اطبا کو بلایا گیا اور شفاخانے کھولے گئے حسنین بن اسحاق بڑا طبیب تھا جس نے جالینوس کی ایک سو اکیس کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا اس نے خود بھی کئی کتابیں لکھی ہیں حسنین کے بیٹے اسحاق نے یونانی کتابوں کا ترجمہ کیا اب تراجم کا زمانہ ختم ہوگیا اور مسلمانوں نے خود طب پر کتابیں لکھنی شروع کیں جن میں مشہور علی البطری اس کی تصنیف فردوس الحکمت طب میں مستند کتاب ہے کتاب ابوبکر زاری جو طب اور کیمیا کا ماہر تھا اس کی تین کتابیں بہت مشہور ہیں۔ ۱۔ کتاب المنصوری ۲۔ الجدری والجبہ ۳۔ کتاب الحادی

کتاب المنصور دس جلدوں میں لکھی گئی ہے جس میں حفظان صحت، جراحی، حمیات، معالجات اور امراض عامہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ عباسی عہد کا دوسرا طبیب علی بن العباس۔ اس نے کتاب الملکی تصنیف کی جس میں اس نے بچہ کے رحم مادر میں نشوونما اور تولد کے طریقوں پر بھی فاضلانہ تبصرہ کیا ہے۔ بوعلی سینا جس نے مختلف موضوع پر ۹۹ کتب تحریر کیں جن میں "کتاب الشفا القانون فی الطب" بہت مشہور ہیں علی بن علیٰ امراض چشم کا ماہر تھا جس میں اس کی مشہور کتاب "تذکرہ الکحالین" ہے۔

اسپین کے اطبا نے بھی اس میں خاطر خواہ کارنامے انجام دیئے چنانچہ الوالقاسم زہراوی ابن زہر، ابن رشد اور ابن خطیب کے نام کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں فاطمی دور میں مشہور اطبا اسحٰق جوڈلیس ابن ہشم عمار بن موصلی قاہرہ میں علی بن رضوان، ابن میمون اور عبداللطیف اس سلسلہ میں گنا دلی بان کے الفاظ کو پیش کرنا ضروری ہے۔

"عربوں کی طبی ترقیاں زیادہ تر فن جراحی علامات امراض، قرابادین اور علم الادویہ میں ہیں انہوں نے علاج کے بہت سے طریقے ایجاد کئے۔ مثلاً میعادی بخار Typhus میں پانی کا استعمال کہ یہ سلسلہ تک متروک ہو جانے کے بعد اب دوبارہ جاری ہوا قرابادین میں انہوں نے بہت سی دوائیں بڑھائی ہیں جنار شنبہ، ریوند چینی، تمر ہندی، کچلہ حب الفرز، کالنور، الکحل وغیرہ اور یہ مرکبہ کے وہ گویا موجد ہیں اور اکثر مرکبات جو اس وقت مستعمل

ہیں شربت لیپ دنبیات، روغن، عرقیات انہی سے ہم کو پہونچے ہیں فن جراحی کی بھی ابتدائی ترقی عربوں سے ہوئی اور زمانہ حال تک ان کی ہی تصنیفات پر یورپ کے طبی مدارس کا دارومدار رہا ہے۔ (تمدن عرب صفحہ ۴۵۵)

اگرچہ مسلمانوں نے زندگی کے ہر پہلو پر قابل قدر اضافے ہی نہیں بلکہ بہت سی چیزوں کو رائج بھی کیا ہے جن کا تذکرہ کرنا ناممکن ہے۔ شوقین حضرات خود مطالعہ کر سکتے ہیں ہم نے صرف نمونے کے طور پر مندرجہ بالا مختصراً تذکرہ کر دیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت کا کیا حال ہوگا آج جبکہ ہم اتنے ترقی یافتہ دور میں رہ رہے ہیں جبکہ بقول مغربی مفکرین کے ہم نے فطرت تک پر قبضہ حاصل کر لیا ہے کوئی شخص ہم کو بتا سکتا ہے کہ اس نے اس ترقی سے کیا حاصل کیا انسان انسان کا دشمن ہے) ہر شخص پر عورت اور شراب کا بھوت سوار ہے۔ انگریزی تعلیم جس نے ہماری تہذیب و تمدن کو برباد کر دیا ہے، ہم نے اس میں کیا اضافے کئے کیا سکھا کیا پایا اور کیا کھویا، کاش کہ مسلمانوں میں ان سوالات کو سوچنے کی طاقت پھر سے پیدا ہو سکے تو پھر ہم دیکھیں گے کہ کون ہے جو ہماری تذلیل کر سکتا ہے کاش کہ یہ جذبات پیدا ہو سکیں۔

عربوں کی علمی سرگرمیوں کے سلسلہ میں امریکہ کے مشہور مورخ کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

" عربوں کی علمی سرگرمیوں کے چشمے پہلے شام میں پھوٹے، جن کا سب سے بڑا مرکز دمشق تھا یہاں ابن سینا جیسے عالم اور حکیم پیدا ہوئے جنہوں نے ریاضی فلسفہ اور طب پر مایہ ناز کتابیں تصنیف کیں جو آج تک اپنی اہمیت اور افادیت کی حامل ہیں اسپین کے مسلمانوں نے بھی یہی کیا انہوں نے ارسطو کی تصانیف کے ترجمے کئے قرطبہ، غرناطہ طلیطلہ میں یونیورسٹیاں قائم کیں جن میں ریاضی، حیاتیات، طب، جراحی، فلسفہ قانون، منطق اور مابعد الطبیعات کی تعلیم دی جاتی تھی رومن اعداد و شمار کی عربی اعداد و شمار نے جگہ لے لی۔ یونانی ادب عربوں کی وساطت سے یورپ پہونچا جس کے نتیجہ میں یورپ میں چودھویں اور پندرہویں صدیوں میں احیائے علوم کی تحریک شروع ہوئی جس نے اہل یورپ کو خواب غفلت سے جگا کر مذہبی سیاسی علمی اور اقتصادی اصلاحات کا دروازہ کھول دیا جو آج تک جاری ہے۔"

عربوں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے A. D. G. OOD اس طرح خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔

"مغربی ممالک میں ثقافت اور تہذیب کی توسیع اور اشاعت میں عربوں کا موثر حصہ ہے یہ خیال غلط ہے کہ عربوں نے یونان اور رومی افکار کی اشاعت کی بلکہ انہوں نے زراعت فنون لطیفہ، سائنس طب اور فلسفہ میں قابل قدر اضافے کئے دور وسطی میں عرب دنیا کی سب سے متمدن قوم تھی جس نے مشرق و مغرب کے سوئے ہوئے باشندوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا عربی زبان علمی زبان ہو گی یونانی اور مشرقی علوم عربی کے ذریعہ یورپ میں پہونچے جن کے ترجمے لاطینی زبان میں کیے گئے جن سے عیسائیوں نے فائدہ اٹھایا۔ عربوں کی ثقافتی سرگرمیوں کو دو حصوں میں منقسیم کیا جا سکتا ہے۔ دورِ اول میں عربوں نے ہندی ایرانی اور یونانی علوم پر عبور حاصل کیا اور دورِ دوم میں اسپین میں کارہائے نمایاں انجام دیئے یورپ میں جا بجا ان کے نمونے کو مشعل راہ بنایا گیا اور آج یورپ کی ترقی انہیں کی مرہونِ منت ہے۔"



باب ۷

مسلم ماہرِ تعلیم

Muslim Educationist

اسلام نے یوں تو لاتعداد ماہرین تعلیم پیدا کئے ہیں لیکن جو رتبہ حضرت امام الغزالی کو حاصل ہے وہ کسی کو نہیں۔ امام صاحب اپنے دور کے ہی نہیں بلکہ ملتِ اسلامیہ کے زبردست ماہرِ تعلیم تھے امام صاحب نے صرف پچپن سال کی قلیل عمر پائی لیکن اس دور میں تمام علوم متداول مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ اصول، علم الکلام، تعلیم وعظ ومناظرہ وغیرہ پر کتب تصنیف کیں فلسفہ میں تو وہ ایک مستقل مکتب خیال کے بانی مبانی سمجھے جاتے ہیں۔ درس وتدریس مجاہدہ وریاضیت میں، سفر وسیاحت حج و زیارت میں مشغول رہنے کے باوجود انہوں نے قریباً اسی کتب تصنیف کیں "یاقوت التاویل فی تفسیر التنزل" کے نام سے علم تفسیر پر ایک جامع کتاب لکھی جس کی چالیس جلدیں ہیں۔ مدرسہ نظامیہ جو آپ کے زمانہ کا سب سے عظیم دارالعلوم تھا اس کے چار سال تک صدر رہے" احیائے علوم اور کیمیائے سعادت" میں آپ نے اپنے دور کی تعلیم وتربیت پر مفصل بحث کی ہے۔

روسو کی طرح امام موصوف نے بھی ایک خیالی بچہ کو اپنا کر اس کی تعلیم وتربیت کا نہایت جامع نقشہ کھینچا ہے جیسا کہ ہم پیشتر تحریر کر چکے ہیں کہ اسلام نے علم پڑھنا زور دیا ہے دنیا کے کسی مذہب نے نہیں دیا حضور اکرمؐ کی لاتعداد احادیث اور قرآنِ پاک کی بہت سی آیات سے اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے اسلام میں علم کا مقصد مختصراً رضائے خداوندی معلوم کر کے اس کے مطابق زندگی گزارنا ہے۔

حضرت امام غزالی

Imam Ghazali (1059 - 1111)

امام صاحب دس سال کی گہری تحقیقات کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے کہ حسی تجربات

ناقابلِ عمل ہیں جن سے خطا اور غلطی کا احتمال ہے۔ افلاطون کے نظریات کے مطابق امام صاحب بھی اس بات کے قائل ہیں کہ عقل کے آگے ادراک کا ایک طور ہے جس سے اللہ کے منتخب اور چیدہ بندے دوچار ہوتے ہیں اس طرح علم و معرفت کی ایک بالکل ہی نئی حس پیدا ہوتی ہے جس کے ذریعہ انسان غیب سے آگاہ ہوتا ہے اور مستقبل میں ہونے والے واقعات کا پہلے سے پتہ لگا لیتا ہے اس کو وہ وحی کے نام سے پکارتے ہیں اس طرح افلاطون اور امام صاحب کے نظریات میں تطابق پایا جاتا ہے۔ افلاطون بھی یہی کہتا ہے کہ تمام انسان حقیقت کو نہیں پہچان سکتے۔ یہ قوت کچھ مخصوص لوگوں کو حاصل ہے۔ جن کو وہ فلسفی کے نام سے پکارتا ہے جبکہ امام صاحب ایسے لوگوں کو پیغمبران کا نام دیتے ہیں۔ اس لیے ہر شخص کے لئے ضروری ہے کہ پہلے وہ قرآن پاک اور پیغمبر پر ایمان لائے اور اس کے بعد علم و عرفان حاصل کر کے رضائے خداوندی کا طالب ہو بالفاظ دیگر پہلے ایمان اور یقین اور پھر حقیقت اور سچائی کی تلاش۔

امام صاحب نے ارسطو کی طرح روح کی بھی دو قسمیں بتائی ہیں ایک فعالی اور دوسری انفعالی اول الذکر کی صفات خواہشات نفسیاتی ہیں عقل فعالی کو نشو و نما دینے کے لئے عقیدے کی پختگی اور ایمان شرط اول ہے اس لئے بچہ کو ابتدا ہی سے ایمان کی پختگی اور عمل صالح کی تربیت دینی چاہیئے تاکہ وہ نیکی کی طرف راغب ہو اور بدی سے بچے۔ امام صاحب نے بھی دماغ کو ایک صاف تختی سے تشبیہ دی ہے اس کو جیسا کہ ماحول ملے گا ویسا ہی اس تختی پر اثر ہوگا۔

مقاصدِ تعلیم Aims of Education

امام صاحب نے مقصدِ تعلیم اخلاق کی تشکیل و تعمیر قرار دیا ہے بچہ میں اتنی عقل و فہم نہیں ہوتی کہ وہ اچھے برے میں تمیز کر سکے اخلاقی صفات بچہ میں تعلیم کے ذریعہ ہی اجاگر کی جا سکتی ہیں۔ یہ بات ضرور ہے کہ ایک ناخواندہ شخص بھی نیک ہو سکتا ہے کیونکہ وہ بھی ماحول کی پیداوار ہوتا ہے لیکن ذہنی طور سے وہ کبھی بھی ایک خواندہ شخص کا مقابلہ نہیں کر سکتا کیونکہ تعلیم ہی وہ آلہ ہے جو ذہن کی نشو و نما مناسب طریقہ سے کر سکتا ہے چنانچہ امام صاحب کہتے ہیں کہ بچہ کو زیورِ تعلیم سے اس طرح آراستہ کیا جائے کہ وہ اچھے اور برے میں تفریق کر سکے بچہ فطرتاً نیک ہے اس لئے اس کی تمنا یہی ہوتی ہے کہ وہ نیک

راستہ پر گامزن ہو تعلیم سے اس میں اچھے برے کی تفریق کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی تو پھر وہ خدا کے بتائے ہوئے راستہ پر آسانی سے گامزن ہو سکے گا اگر ہم بنظر غائر امام صاحب کے مقصد تعلیم کا مطالعہ کریں تو ہم کو ان کی حقیقت نوازی کا با آسانی اندازہ ہو سکتا ہے امام صاحب نے عقیدے کی پختگی اور عقل فعالی کی نشو و نما کبھی مقاصد تعلیم متعین کئے ہیں۔

"اٹھارہویں صدی کا مشہور و معروف مفکر تعلیم Herbart بھی مقصد تعلیم اعلیٰ اخلاق کی تعمیر و تشکیل قرار دیتا ہے جس کو کافی شہرت حاصل ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ مسلمان اپنوں کو چھوڑ کر دوسروں کے گرویدہ نظر آتے ہیں۔ ہم تو یہ کہنے پر مجبور رہیں کہ ہربارٹ نے نظریات و خیالات کی پوری عمارت امام صاحب کے ہی افکار پر رکھی ہے۔

نصاب تعلیم : Content of Education

امام صاحب مسلمان تھے اس لئے وہ کہتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم مذہبی ہونی چاہیئے جو گھر پر دی جائے گی اور بچہ کے والدین بحیثیت معلمین کام کریں گے اس کو کلام الٰہی نماز اور روزے کی تربیت دیں گے تاکہ وہ ابتدا ہی سے مذہبی باتوں کو جان سکے آگے چل کر امام صاحب نے تمام علوم کی دو قسمیں کی ہیں۔

۱۔ فرض عین Compulsory Subjects.

۲۔ فرض کنایہ Optional Subjects.

فرض عین میں دینی علوم اور ارکان اسلام شامل ہیں اور فرض کنایہ میں دنیاوی علوم مثلاً طب زراعت اور ریاضی وغیرہ اس کے بعد امام صاحب نے فرض کنایہ کو پھر دو اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ اول علوم شرعیہ جس میں تفسیر حدیث فقہ اور کلام دوسرے نمبر پہ دنیاوی علوم جن کی انسان کو زندگی میں ضرورت پڑتی ہے مثلاً صنعتی علوم پارچہ بافی زراعت، خیاطی بال تراشی فلسفہ اور منطق وغیرہ۔

امام صاحب سے پیشتر نصاب میں صرف علوم شرعیہ اور دینی تعلیم شامل تھی لیکن آپ نے دین کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم پر بھی توجہ دی آپ کے خیالات بالکل اسلامی ہیں اسلام اعتدال پسند ہے وسطی عہد میں جب عیسائیت کو فروغ حاصل ہوا تو تعلیم کو محدود کر کے دینی آلہ بنا لیا گیا جس کی وجہ سے انفرادیت کی تکمیل کی راہیں بند ہو گئیں۔ یورپ

میں جمود طاری ہو گیا امام صاحب نے نصاب میں دینی اور دنیاوی تعلیم کو شامل کر کے دور جدید کے لئے رہنمائی فرمائی۔ آپ نے احیاء العلوم میں اس بات پر نہایت مفصل بحث کی ہے امام صاحب کا اس ضمن میں سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ تعلیم کے نصاب میں فقہ و کلام کے ساتھ منطق اور فلسفہ بھی داخل ہو گیا دنیوی تعلیم کے لئے اتنا کافی وقت نکل آیا کہ فقہا اور محدثین بھی ریاضی داں اور حساب داں ہونے لگے فقہ میں سے علم اخلاقیات کا حصہ بالکل خارج ہو گیا۔ جہاں تک ادوار تعلیم کا سوال ہے تو اسلام کے مطابق عہد سے لحد تک کا نظریہ ہے اس لئے اس سلسلہ میں کچھ لکھنا بیکار ہے۔

طریقہ تعلیم Methods of Teaching.

امام صاحب کے طریقہ ہائے تدریس کو پڑھ کر تعجب ہوتا ہے آپ نے جن طریقوں کی سفارش کی ہے۔ وہ یورپ کے ماہرین تعلیم نے قریباً ایک ہزار سال بعد پیش کئے ہیں اصل یوں ہے کہ ان یورپ کے لوگوں نے مسلمانوں کے تمام ادبی کارناموں کو اپنا کر اپنے ناموں سے شائع کیا ہے امام صاحب کہتے ہیں کہ تدریس کا زریں اصول یہ ہے کہ بچوں کی معلومات سابقہ Previous Knowledge کی مدد سے نیا سبق پڑھایا جائے دورِ جدید کا ماہر Herbart بھی اس چیز کی پرزور سفارش کرتا ہے۔ سبق کو دلچسپ بنانے کے لئے قصوں اور کہانیوں کی مدد لی جا سکتی ہے۔ پھر امام صاحب کہتے ہیں کہ سبق میں آسان سے مشکل From Simple To Difficult کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیئے۔

Pestalozzi بھی تدریس کی کامیابی کے لئے اس کو ضروری قرار دیتا ہے۔

امام صاحب کہتے ہیں کہ اسباق کو طلبہ کی قابلیت کے لحاظ سے ترتیب دینا چاہیئے دورِ جدید میں تمام ماہرین تعلیم اسی بات کی سفارش کرتے ہیں کہ اسباق Understandable, Easy, Interesting ہونے چاہیں جس کو وہ نفسیات کا نام دیتے ہیں۔ اسی چیز کو امام صاحب قریباً آٹھ سو سال بیشتر کہا تھا۔

امام صاحب اساتذہ کو مشورہ دیتے ہیں کہ سبق کو پڑھانے سے بیشتر اس کی تیاری لازمی ہے جس کو دور جدید میں Lesson Planning کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے دورِ جدید کے تمام ماہرین تعلیم اور مفکرین تعلیم اسی کی سفارش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام تعلیمی اداروں میں زیرِ تربیت اساتذہ کو باقاعدہ اشارات سبق کی تیاری کی مشق کرائی جاتی ہے

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام صاحب دورِ جدید کے اصولوں سے واقف ہی نہیں بلکہ ان کی اہمیت سے بھی آگاہ تھے امام صاحب اساتذہ کو نصیحت کرتے ہیں وہ طلبہ کے ساتھ محبت اور ہمدردی کا برتاؤ کریں دورِ جدید کے تمام ماہرین تعلیم مثلاً روسو، پیسٹالوزی، ہربارٹ اور ڈیوی وغیرہ ان کے اس نظریہ سے کلی اتفاق کرتے ہیں۔ طریقہ تعلیم میں لیکچر کے طریقہ کو اولیت حاصل تھی امام صاحب بھی اسی طریقہ پر طلبہ کو تعلیم دیا کرتے تھے اس کے علاوہ بحث و مباحثہ اور طریقہ نقل بھی جاری تھا۔

تعلیم نسواں Female Education

دین اسلام نے تعلیم مرد اور عورت دونوں کے لئے فرض قرار دی ہے جیساکہ آیات قرآنی اور احادیث نبوی سے ظاہر ہے لیکن امام صاحب اس کے برعکس ارسطو اور روسو کے ہمنوا نظر آتے ہیں کیونکہ وہ عورتوں کے لئے ابتدائی تعلیم کی ہی سفارش کرتے ہیں یہ ابتدائی تعلیم معاشرتی ضروریات کے مطابق ہونی چاہیئے عورتوں کا تعلق گھریلو زندگی سے ہے اس لئے ان کو امور خانہ داری زیادہ تر ماں پر ہوتی ہے اس لئے اس میں ایسی خوبیاں پیدا کی جائیں کہ وہ بچہ میں اعلیٰ کردار اور اخلاق کی تکمیل و تشکیل کر سکے۔

امام صاحب سن بلوغ کی اہمیت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ دور بچہ کی عمر کا خاص حصہ ہے موجودہ زمانہ کے تمام ماہرین نفسیات کا بھی یہی خیال ہے چنانچہ روسو بھی امام صاحب کے خیال سے اتفاق کرتا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اس دور میں بچہ کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دینی چاہیئے جسمانی اور ذہنی قوتوں کو بھی بروئے کار لانا چاہیئے اس لئے بچہ کو زیادہ سے زیادہ مشغول رکھنا چاہیئے۔

امام صاحب اسپارٹا اور ایتھنز کے نظریات تعلیم کے مطابق بچہ کی جسمانی نشوونما پر بھی زور دیتے ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ بچہ کو ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنانے چاہئیں تاکہ اس کا جسم اچھی طرح سے نشوونما حاصل کر سکے اس کو کھلی ہوا میں رکھا جائے بھاگنے دوڑنے اور کھیل کود کے لئے ہر قسم کے سہولتیں ہونی چاہئیں۔

امام صاحب نے تشنگان علوم کو چار حصوں میں منقسم کیا ہے۔

۱۔ عالم دین Thealogians.

۲۔ فلسفی Philosophers.

۳. Authoritanians

۴. عارفانہ Mystics

ہم بوجہ طوالت تشریح سے گریز کر رہے ہیں۔

امام صاحب نے تعلیم میں لاثانی کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ان کی تصانیف سے ہر دور کے لئے مختلف نصاب کا پتہ چلتا ہے جس سے ان کی ذہانت اور نفسیات سے واقفیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے امام صاحب خود بھی اعلیٰ پایہ کے معلم تھے۔

امام صاحب نے احیائے علوم کو ابتدا میں دو حصوں میں منقسم کیا ہے اور اس کے بعد ہر حصہ کو پھر دو حصوں میں تقسیم کیا ہے یہ تمام حصے اپنی انفرادیت کے حامل ہیں ان میں انہوں نے تعلیم و تربیت پر سیر حاصل بحث کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ طلبہ کی ذہنی نشوونما کو تعلیم کی بنیاد قرار دے کر بچہ میں مذہبی جذبات مذہب سے محبت اور اللہ تعالےٰ کے بتائے ہوئے راستہ پر چل کر اس مادی دنیا سے چھٹکارے کے سلسلہ میں تلقین فرمائی ہے۔

امام صاحب کے کارناموں کو اس مختصر سے بحث میں بیان کرنا مشکل ہے آپ کے سلسلہ میں ماہر مورخ P. K. Hitti رقمطراز ہے۔

"The work of Ghazali, Made Philosophy Palatable To The Orthodox school of Theologions.

امام صاحب کے خیالات کا یورپ میں بہت اثر ہوا جن ماہرین نے ان کے فلسفہ کو بنیاد مان کر اپنے افکار و نظریات کی عمارت کی تعمیر و تشکیل کی ان میں قابل ذکر Pascal, Thomas Acquinas ہیں۔ Mac-Donald کے الفاظ کو Nicholson اس طرح بیان کرتا ہے۔

"غزالی نے اپنی تصانیف میں کوئی نئی راہ تلاش نہیں کی تاہم وہ اتنی عظیم شخصیت کے مالک تھے کہ روندے ہوئے راستہ پر اس طرح چلے کہ اسے شاہراہ عام بنا کر چھوڑا۔"

مسلم مفکرِ تعلیم Muslim Educational Thinker

دنیائے علم و ادب میں علامہ ابن خلدون کے نام نامی سے کون واقف نہیں۔

آپ نہ صرف اپنے دور بلکہ تمام عالم اسلامی کے علمی و ادبی حلقوں میں بہت ہی اعلیٰ وارفع مقام کے مالک ہیں آپ نے زندگی کے ہر پہلو اور علوم کی تمام اصناف پر اچھوتے اور حقیقت پسندانہ زاویوں سے روشنی ڈال کر تمام عالم انسانیت سے خراج تحسین حاصل کیا ہے آپ کی عظمت و شہرت تین حیثیتوں سے لاثانی ہے۔

۱. مورخ ۲. فلسفہ تاریخ کے بانی ۳. عمرانیات کے امام و پیشرو۔

لیکن ہم ان کو بحیثیت ایک مفکر تعلیم پیش کر رہے ہیں۔

علامہ ابن خلدون

Allama Ibne Khaldun 1332 - 1406

علم سے علامہ موصوف کی مراد علم حقیقت یا علم معرفت ہے کیونکہ یہی وہ خوبی ہے جو انسان کو حقیقت سے روشناس کراتی ہے انسان حواس خمسہ کے ذریعہ علم حاصل کرتا ہے اور ان کے ذریعہ ہی گرد و نواح کا علم حاصل کر کے اپنی زندگی کے لئے نئے نئے راستے نکالتا ہے جو اس خمسہ کے ذریعہ حقیقت یا علم معرفت حاصل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ حواس خمسہ تو سطحی علم کی بنیاد ہیں علم معرفت حاصل کرنے کیلئے ایک اور اعلیٰ حس جس کو عقل یا الہام کہتے ہیں۔ یہ حس قدرت نے ہر شخص کو عطا نہیں کی ہے یہ صرف چند اشخاص کو ہی ملتی ہے جن کو پیغمبر کہتے ہیں لہٰذا علم حقیقت یا معرفت سے وہی لوگ آشنا ہیں عام انسانوں کو قدرت نے محدود عقل عطا کی ہے۔ اس لئے وہ حقیقت کو پہچاننے سے قاصر ہیں اس لئے ہر شخص کے لئے لازم ہے کہ وہ ان احکامات پر ایمان لائے جو پیغمبروں نے اس تک پہونچائے ہیں۔

مقاصد تعلیم: Aims of Education

عرب مفکرین یونانی مفکرین سے بہت زیادہ متاثر تھے چنانچہ انہوں نے یونانی مفکرین افلاطون Plato اور ارسطاطالیس Aristotle کے خیالات کو بنیادی مان کر اس میں گراں قدر اضافہ کئے افلاطون کا بھی یہی خیال ہے کہ حقیقت کو صرف چند افراد ہی پہچان سکتے ہیں جن کو وہ فلاسفر کے نام سے پکارتا ہے افلاطون جن کو فلاسفر کہتا ہے عرب مفکرین ان کو پیغمبر کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور ان کے احکام پر ایمان لانا علم

معرفت کی پہلی شرط ہے حضرت امام غزالی نے بھی علم معرفت حاصل کرنے کے لئے ایمان کو بنیاد قرار دیا ہے ایمان کے بعد علم حاصل کرے اور پھر حقیقت کو دریافت کرنے کی کوشش کرے۔

اس مختصر بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ تعلیم کا مقصد علم معرفت حاصل کرنا ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے ایمان اور عقیدہ ضروری اور لازمی ہے جب انسان میں صفات ایمانیہ پیدا ہو جاتی ہیں تو وہ علم و عمل کا جامہ پہن لیتا ہے۔ سقراط Socrates کا نظریہ علم افلاطون Plato کے نظریہ فلاسفہ کی جھلک عرب مفکرین میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ سقراط کہتا ہے کہ تعلیم کا مقصد علم حاصل کرنا ہے۔ اور علم ہر فرد بذریعہ استدلال حاصل کر سکتا ہے افلاطون علم معرفت کا اہل چند افراد کو قرار دیتا ہے سقراط اور افلاطون کا نظریہ یہ ہے کہ علم معرفت عمل کا ضامن ہے اگر انسان حقیقت سے روشناس ہو جائے گا تو وہ نیک اور اچھے کردار کا مالک بن جائے گا۔ ابن خلدون بھی عمل صالح کی بنیاد ایمان پر رکھتے ہیں۔ ان کے نظریہ کے مطابق علم کی شرط ایمان ہے اور ایمان کا نتیجہ علم یونانی مفکرین کے مطابق عمل کا نتیجہ عمل صالح ہے یہی وہ نظریات ہیں جن پر آگے چل کر Herbart اور Herbert Spencer نے بھی اپنے افکار و نظریات پیش کئے ہیں فکر انسانی خدا کی مصنوعات میں سے ایک ہے باری تعالیٰ نے اس کو بعینہ اسی طرح پیدا کیا ہے جس طرح اس نے دیگر مخلوقات کو یہ فکر اسی وقت ظہور میں آتی ہے جب کہ نفس کی حرکت دماغ کے درمیانی حصے میں ہوتی ہے جب فکر انسانی کی یہ حرکت عدم سے وجود میں آتی ہے تو افعال انسانی کی ایک خاص ترتیب و نظام کے تحت صادر ہونے کے منبع بنتی ہے اور کبھی کبھی ایسے علم کے حصول کا منبع و ذریعہ بنتی ہے جس سے انسان واقف ہوتا ہے اس وقت انسان مطلوب کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس علم مطلوب کے فوائد اور نقصانات دونوں کو پیش نظر رکھ کر اس کے حاصل کرنے یا نہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے اثنائے غور و خوض میں اس پر وہ طریقہ چشم زدن میں منکشف ہوتا ہے جو اس علم مطلوب کے دونوں شعبوں میں اتحاد پیدا کر دیتا ہے اگر وہ علم واحد ہے یعنی دوسرے علوم و فنون کے مسائل بھی اس میں مخلوط نہیں ہیں تو وہ انکشاف کے بعد اس کے دوسرے مبادی کی تحصیل شروع کرتا ہے یہاں تک کہ وہ کامیاب

ہو جاتا ہے اور یہ فکر انسانی کا ہی کرشمہ ہے جو دیگر حیوانات سے اس کو ممتاز کرتی ہے یہی خیال Herbart نے بھی پیش کیا ہے۔

علامہ موصوف نے مقاصد تعلیم پر بحث کرتے ہوئے ایک نئے خیال کا اضافہ کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ تعلیم فطری تقاضہ ہے ضروریات زندگی کے حصول کیلئے انسان غور و فکر سے کام لے کر عمرانی زندگی اختیار کرتا ہے یہاں پر یہ بیان کرنا بے محل نہ ہوگا کہ موجودہ زمانے کے ماہرین تعلیم بھی تعلیم کا یہی مقصد تعین کرتے ہیں ان میں جان ڈیوی Dewey نے اپنے پوری فلسفہ تعلیم کا یہی مقصد قرار دیا ہے پھر علامہ خلدون کہتے ہیں کہ مقاصد تعلیم کی بنیاد تین حقائق پر منحصر ہے۔ ۱۔ غور و فکر ۲۔ بقائے نسل ۳۔ عمرانی زندگی۔

غور و فکر ہی دراصل وہ خصوصیت ہے جو انسان کو حیوان سے ممتاز و بالا کرتی ہے اور اسی کی بدولت انسان بقائے نسل کے انتظامات کرتا ہے۔ اپنی زندگی کو خوش و خرم بنانے کے لئے وہ بہتر سے بہتر طریقوں کو دریافت کرتا رہتا ہے۔ ارسطو Aristotle نے بھی تعلیم کا مقصد یہی مقرر کیا ہے لہذا تعلیم کا سب سے اہم مقصد غور و فکر کو کام میں لاکر انسان کو حقائق سے روشناس کراتا ہے یہاں پر ابن خلدون افلاطون Plato کا نظریہ پیش کر رہے ہیں تاکہ فرد حقیقت سے آگاہ ہو کر علم کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرے اور پھر اپنی زندگی کو زیادہ سے زیادہ آرام و سکون سے گزار سکے۔

نصاب تعلیم : Content of Education

علامہ نے علوم کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے اول وہ جن میں انسان اپنی فکر کھپاتا یعنی جن کو وہ اپنی غور و فکر کی بنا پر حاصل کرتا ہے ان کو وہ علوم طبعی کے نام سے پکارتے ہیں دوسرے علوم نقلید جو کسی ذریعہ سے انسان تک پہونچتے ہیں طبعی علوم مثلاً حکمیہ فلسفہ کی واقفیت انسان کے غور و فکر کا نتیجہ ہے انسان خود اپنی فکر سے کام لیتا ہے مسائل و دلائل وجود تعلیم کی معلومات میں اپنے قوائے عقیلہ سے کام لیتا ہے ان علوم میں مہارت اور صحیح اور غلط کی تمیز اپنی ذہنی قوتوں کی بنا پر کرتا ہے علوم نقلید کا انحصار واضع شرعی سے نقل و روایت پر ہوتا ہے اس میں

انسانی عقل کو کوئی دخل نہیں ہوتا یہاں صرف اصول شرعیہ سے فروع کا انبساط کرتا ہے اور اصول کے حکم میں شامل کرتا ہے کیونکہ وہ واقعات جو وقتاً فوقتاً وقوع پذیر ہوتے ہیں وہ نقل کلی کے تحت نہیں آسکتے تا وقتیکہ ان کو جامع کی رو سے ان سے ملحق نہ کیا جائے لیکن اس قیاس کا انحصار بھی نقل پر ہی ہوتا ہے کیونکہ یہ موقوف ہے کہ اصل میں حکم کا ثبوت ہم تک خبر کے ذریعے پہونچے تو گویا قیاس بھی ایک حیثیت سے نقلی ہوا۔

علم تقلید کا سرچشمہ کتاب اللہ اور سنت رسول ہیں جن سے ہماری شرع بنتی ہے اور مذہب وجود میں آتا ہے جو علوم بھی کتاب اللہ اور سنت رسول کی فہمائش میں مدد دیں وہ انہیں علوم تقلید میں شمار ہوتے ہیں حتیٰ کہ عربی علم و ادب جو قوم عرب کی زبان ہے اور قرآن پاک بھی جو اسی زبان میں ہے جب علوم تقلید کا دائرہ اس قدر وسیع ہو تو ان کے ماتحت بہت سے علوم آجاتے ہیں کیونکہ ہر مکلف پر واجب ہے کہ وہ ان احکام الٰہی کو جانے جو اس پر اور بنی نوع انسان پر فرض ہیں اور جو کتاب اللہ اور سنت رسول سے ماخوذ ہیں خواہ برائے نص و اجماع خواہ بصورت الحاق و قیاس اس لئے ضروری ہے کہ کتاب اللہ کے الفاظ و معانی کو اچھی طرح سمجھا جائے اور ان کی صحیح حیثیت کو ذہن نشین کر لیا جائے اور ایسے علم کو جو اس قسم کی معرفت بخشے علم تفسیر کہتے ہیں اس کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ کتاب اللہ کی قرأت کے بارے میں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو روایات اور نقول ہم تک پہونچی ہیں ان کی بھی معرفت سند و اختلاف سند حاصل کریں جو علم اس قسم کی معرفت بہم پہونچائے اس کو علم قرأت کہتے ہیں۔

اس ضمن میں یہ بھی ضروری ہے کہ احادیث نبوی کی اسناد کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پتہ لگایا جائے اور بیچ میں جو راویان حدیث ہیں ان کے حالات کی بھی چھان بین کی جائے اور ان کی عدالت اور غیر عدالت کی خوب دیکھ بھال کی جائے تاکہ ان اخبار و روایات کے ذریعہ جو حکم شرعی ملت ہے اس کے صحت پر وثوق کلی حاصل کر سکے جس علم میں اس قسم کی تحقیق ہو وہ علم حدیث ہے پھر یہ لابدی ہے کہ احکام الٰہی سے خاص خاص قانون اور اصول کلی مستنبط کئے جائیں تاکہ پھر ان کی مدد سے اور ان کی

روشنی میں مختلف گوناگوں جزئیات و واقعات کے لئے احکام تلاش کئے جائیں جس علم میں اس قسم کی بحث و تحقیق ہوتی ہے وہ اصول فقہ کہلاتا ہے پھر احکام کے واسطے جو تکالیف بندے کو اٹھانی پڑتی ہیں وہ دو قسم کی ہیں بدنی اور قلبی جن کا تعلق ایمان سے ہے یعنی عقائد ایمانیہ ذات و صفات باری تعالیٰ کے متعلق حشر نشر کے بارے میں یا نعیم جنت و عذاب و دوزخ اور قدر وغیرہ کے متعلق جس علم میں ان عقائد مذکورہ پر مدلل بحث کی جاتی ہے اس کو علم کلام کہتے ہیں ساتھ ہی ساتھ قرآن و حدیث کو سمجھنے کے لئے علوم لسانیہ سے واقفیت حاصل کئے بغیر بھی چارہ نہیں ان علوم لسانیہ کی بھی بہت سی قسمیں ہیں علم لغت، علم نحو، علم بیان اور علم آداب وغیرہ۔

مندرجہ بالا نقلیہ ملت اسلامی اور مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہیں گو دوسری ملتوں میں بھی ان کا وجود ہے اور وہ ان علوم نقلیہ اور اسلامیہ کے ساتھ اس خیال کے تحت شریک صفت ہیں کہ وہ بھی صاحب شریعت مبلغ پر نازل ہوئے ہیں اور یہ بھی اس لحاظ سے ہر دو میں فرق و امتیاز یہ ہے کہ یہ ان کے ناسخ ہیں اور وہ منسوخ اور اب مسلمانوں کو اس میں غور و خوض کرنا منع ہے اس لئے شارع علیہ السلام نے قرآن مجید کے علاوہ دیگر کتب منزلہ کے مطالعہ سے روکا اور باز رکھا آپ نے فرمایا کہ اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب بلکہ یوں کہو "ہم ایمان لائے اس چیز پر جو ہم پر اتری اور اس پر بھی جو تم پر اتری ہمارا تمہارا خدا ایک ہے"۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ آنحضورؐ نے حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں توریت کا کچھ حصہ دیکھا۔ آپ سخت خفا ہوئے چہرہ مبارک سے غصہ نمودار ہونے لگا اور فرمایا "میں تمہارے لئے صاف کھلا ہوا، واضح قرآن پاک یا دین نہیں لایا ہوں۔ بخدا اگر موسیٰ بھی آج میرے زمانے میں زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری اتباع کے بغیر چارہ نہ تھا۔"

علامہ ابن خلدون ہی نہیں بلکہ ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ تعلیم کی ابتدا قرآن پاک سے کرنی چاہیے۔ چنانچہ پورا نصاب تعلیم ہی اس عظیم کتاب الٰہی پر منحصر ہونا چاہیے یہاں یہ بیان کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ مختلف اسلامی ممالک میں قرآن پاک کا مطالعہ مختلف طریقوں سے کیا جاتا ہے مغربی اور شمالی افریقہ میں صرف قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنے

کو کافی سمجھتے ہیں اور دیگر سلسلوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں چنانچہ نہ تو وہ حدیث و فقہ کو درس و تدریس میں شامل کرتے ہیں اور نہ ہی شاعری اور فلسفہ کو جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان مقامات کے لوگ قرآن پاک اس کے معانی اور مطالب میں دنیائے اسلام میں سب سے آگے نظر آتے ہیں۔ اس کے برعکس اندلس میں مسلمانوں نے اپنی تعلیم میں ادبی رنگ بھی شامل کر لیا تھا۔ یہ بات ضرور تھی کہ اساس تعلیم قرآن پاک ہی تھا لیکن علم کے دائرے کو کافی وسیع کر لیا گیا اور اس طرح ان تمام علوم کو داخل نصاب کیا گیا جن پر فرد کی دینی اور دنیاوی ترقی کا دارومدار ہے ان کے ساتھ ہی ساتھ وہاں پر آرٹ، تاریخ فلسفہ جغرافیہ سائنس طب جراحی وغیرہ بھی نصاب میں شامل تھے بغداد اور دمشق میں بھی قرآن پاک کے ساتھ ساتھ دیگر مضامین کو بھی نصاب تعلیم میں شریک کیا گیا ہے ان کے یہاں پر خوش نویسی آرٹ اور خطاطی کو بھی اولین مقام حاصل تھا جن کو وہ حاصل کرتے تھے۔

طریقہ تعلیم: Methods of Education

نصاب تعلیم کے بعد علامہ موصوف نے مختلف طریقہ ہائے تدریس پر بھی بحث کی ہے انہوں نے مروجہ طریقوں کو ناقص اور مضر قرار دیا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ پہلے طریقہ میں ذہنی تعلیم نہیں دی جاتی البتہ دوسرے اور تیسرے طریقے سے بہتر ہیں لیکن ان دونوں میں بھی نقائص ہیں چنانچہ قرآن پاک کو اگر ابتدا میں پڑھایا جاتا ہے تو اس میں بچہ کا بہت سا وقت صرف ہو جاتا ہے اس زمانہ میں بچہ میں اتنی عقل نہیں ہوتی کہ وہ قرآن پاک کے معانی اور مطالب سمجھ سکے اور نہ ہی اس میں اتنی استعداد ہوتی ہے کہ وہ کتاب الہٰی سے ادبی یا مذہبی فیضان حاصل کر سکے اور اس کے تدارک کی صورت صرف یہ ہے کہ بچہ کو پہلے عربی زبان سے روشناس کرایا جائے اس کے بعد ریاضی علم ہندسہ وغیرہ کا درس دیا جائے ان کے بعد قرآن پاک پڑھانا چاہیئے تاکہ بچہ کلام الہٰی کو آسانی سے سمجھ کر اس کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ لگا سکے کیوں کہ اس زمانے میں قرآن پاک کی تعلیم بچہ کے ذہن اور کردار پر اچھا اثر ڈال سکے گی اور پھر دیگر دینی علوم پر توجہ دینی چاہیئے۔

ابن خلدون نے تدریس کے فطری طریقوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان کا کہنا ہے

ہے کہ تدریس بہت مشکل کام ہے اس پر معلمین کو خاص توجہ دینی چاہیئے اس خیال کو روسو Rousseau ہربارٹ Herbart اور پیٹالوزی Pestalozzi نے بھی علامہ موصوف سے ہی اخذ کیا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ ہم مغربی مفکرین کو ہی ان خیالات و نظریات کا بانی مبانی خیال کرتے ہیں جبکہ ان کی عمارت کی تعمیر و تشکیل مشرقی مفکرین کی مرہون منت ہے علامہ کہتے ہیں کہ دوران تدریس معلمین تین طرح کی غلطیاں کیا کرتے ہیں۔

دوران تدریس فطری اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے اس طرف بالکل توجہ نہیں دیتے کہ متعلم کی صلاحیتیں کس درجہ کی ہیں اور اس کا ذہن علوم وفنون کی کتنی مقدار کا متحمل ہو سکتا ہے یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ اس اصول پر آگے چل کر Rousseau, Herbart, Herbert Spencer, Dewey, نے بھی عمل کیا ہے۔

کچھ اساتذہ جو طریقہ تعلیم سے ناواقف ہوتے ہیں وہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ طلبہ کے دماغ میں پہلے ہی دن سب کچھ ٹھونس دیا جائے اور علم و فن کی وہ تفصیلات جو بچہ کی سمجھ سے بالا تر ہیں ان کو بھی ابتدا میں ہی بیان کر دینا شروع کر دیتے ہیں تاکہ طلبہ ان کی قابلیت اور اہلیت سے متاثر ہو سکیں اس طریقہ کار سے نہ صرف یہ کہ وہ ملکہ علمیہ ابھرتا ہے جو حصول علم کے لئے ضروری ہے بلکہ ذہن بھی کند ہو جاتا ہے طبیعت اچاٹ ہو جاتی ہے اور پھر بچہ علم و فن سے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ یہ وہی اصول ہے جس پر آگے چل کر Rousseau, Herbart, Pestalozzi, Dewey, وغیرہ نے دل کھول کر بحث کی ہے اس سے اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ علامہ کے خیالات کتنے حقیقت پرستانہ ہیں۔

تعلیم اور تعلم کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اولاً جو فن یا علم پڑھانا مقصود ہو اس کی موٹی موٹی سرخیوں کو اجمالاً ذہن نشین کرایا جائے جس میں بچہ کی ذہنی استعداد کا خاص طور پر خیال رکھا جائے اور پھر آہستہ آہستہ پیش قدمی کی جائے جس کو معلومات سابقہ سے مربوط رکھا جائے مشہور و معروف ماہر تعلیم پیستالوزی Pestalozzi نے اپنی پوری تعلیمی اسکیم اسی پر مرکوز کی ہے۔

ابن خلدون کہتے ہیں کہ معلم کو چاہیئے کہ وہ گردو پیش کی اشیاء کو بطور امثال پیش کرے کیوں کہ بغیر حسی ادراک کے بچہ خیالات یا الفاظ کو نہیں سمجھ سکتا اور اس کے ذہن میں صحیح اور واضح خیالات قائم نہیں ہو سکتے۔ روسو Rousseau پیستالوزی Pestalozzi اور فروبل Froebel نے ان کی تائید کی ہے۔

جب ایک حد تک علم یا فن سے مناسبت یا ارتباط COR-Relation پیدا ہو جائے تو پھر نسبتاً اس سے اعلیٰ سطح کے مسائل سے واقف کرایا جائے اور شرح وضاحت میں کوئی کسر باقی نہ رکھی جائے تاکہ آئندہ کوئی الجھاؤ یا پیچیدگی باقی نہ رہے۔ "From simple to Difficult" اس اصول کی اہمیت سے بھی کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام عظیم مفکرین تعلیم نے اس اصول کو تدریس کی کامیابی کا زریں اصول تسلیم کیا ہے۔

اس کے بعد تعلیم کا تیسرا اور آخری درجہ آتا ہے اس میں دل کھول کر علم و فن کی مشکلات و غایات سے بحث کی جائے اور ہر مسئلہ کا حل بچہ کے سامنے پیش کیا جائے اس فطری تعلیم کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بچہ علم و فن پر کامل عبور حاصل کر سکے گا۔ تدریس کے سلسلہ میں ایک اور غلطی یہ کی جاتی ہے کہ ایک وقت میں بجائے ایک مضمون کے بچہ کو کئی کئی غیر متعلقہ مضامین پڑھائے جاتے ہیں جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ کو رارہ جاتا ہے کیوں کہ فطری تقاضہ یہ ہے کہ ایک وقت میں بچہ ایک ہی مضمون پر توجہ دے سکتا ہے اس اصول کو دور جدید کے سب سے بڑے ماہر تعلیم جان ڈیوی John Dewey نے اپنایا ہے Herbert Spencer بھی اس کا ہمنوا ہے

اس کے بعد ابن خلدون فرماتے ہیں کہ دوران تدریس اس بات کا بھی لحاظ رکھنا چاہیئے کہ ایک ہی مضمون کو مختلف مجلسوں میں نہیں بانٹنا چاہیئے اور درمیان میں فاصلہ بھی نہیں ہونا چاہیئے کیوں کہ اس طرح تسلسل ٹوٹ جاتا ہے جس سے بھول چوک کا احتمال ہے اور پھر تعلیم میں ارتباط اور اتصال کا لحاظ نہ رکھنے سے ذہن حاصل کئے ہوئے علم کو بھی خارج کر دیتا ہے اسی صورت میں علم کا حصول دشوار اور مشکل ہو جاتا ہے اور اگر متواتر صحبتوں میں نفس مضمون پڑھایا جائے تو اس پر ملکہ آسانی سے حاصل ہو سکتا ہے اسکے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ دو مضامین بیک وقت نہ پڑھائیں ورنہ کسی میں بھی خاطر خواہ

کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی بچہ کی توجہ اور اس کا ذہن تقسیم ہوجائے گا وہ ایک کو چھوڑ کر دوسرے کی طرف بھاگے گا اس طرح دونوں کی تحصیل سے محروم رہ جائے گا اور آخر میں مایوسی کا شکار ہوکر تعلیم سے فرار کی کوشش کرے گا اس کے برعکس اگر ایک ہی مضمون ہوگا تو اس میں مہارت حاصل کرسکے گا اس کی اہمیت روز روشن کی طرح عیاں ہے اس لئے کچھ کہنا فضول ہے۔ بیکن Bacon کہتا ہے کہ سفر تعلیم کا حصہ ہے اگر ہم اس پر غور کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ اس نے اس خیال کو علامہ ابن خلدون سے حاصل کیا ہے کیوں کہ علامہ موصوف نے اس سلسلہ میں حقیقت پر مبنی خیال پیش کیا ہے ان کے مطابق اس سے انسان کی زندگی کے حقائق سے دوچار ہونے کا موقع ملتا ہے مہمان نوازی، فراخ دلی اور بلند حوصلگی کی صفات میں اضافہ ہوتا ہے اس سے اساتذہ اور طلبہ میں باہمی ربط و محبت بڑھتی ہے اور طلبہ کو کتابوں سے زیادہ انسانوں کے خیالات سے بہرہ ور ہونے کا موقع ملتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اساتذہ سے مضمون کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل ہوتی ہیں اس خیال کی اہمیت کا اندازہ موجودہ دور میں کالج اور یونیورسٹیوں میں تعلیمی سفر Tours اور Educational Excursions کا عام دستور ہے جس کو ہمارے ناسمجھ بھائی مغربی ممالک کی دین تصور کرتے ہیں آرٹ سائنس، کامرس وغیرہ کے طلبہ مختلف اہم مقامات پر جاتے ہیں تاکہ کتابی تعلیم کے عملی پہلو سے بھی روشناس ہوسکیں اس سلسلہ میں علامہ رقم طراز ہیں۔

"طالب علم کے لئے سفر کرنا ضروری ہے علوم و معارف و فضائل کبھی تعلیم و تعلم سے حاصل ہوتے ہیں کبھی مشاہدہ اور باہمی ربط وضبط سے لیکن مشاہدے اور تجربے سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ پختہ ہوتا ہے۔"

ابن خلدون تعلیم کے اس مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں جو حفظ کرنے کی بجائے قوت ادراک، غور و فکر اور ذہنی نشو و نما کو بنیاد قرار دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ مروجہ تعلیم کے خلاف احتجاج کرتے نظر آتے ہیں جس کی رو سے بچہ نفس مضمون کو سمجھنے سے بیشتر خلاصوں اور شرحوں پر اکتفا کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"تونس اور افریقہ میں علم اور اصول فقہ سیکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ طلبہ اپنی عمر کا بیشتر حصہ شرحوں اور تعبیروں کے مطالعہ پر صرف کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ بچہ کی صلاحیتوں

کو تباہ و برباد کرتا ہے کیوں کہ مختلف شارحین ایک ہی مطلب کو مختلف الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔" (مقدمہ)

علم اللغتہ پر عبور حاصل کرنا کسی بھی بچہ کے بس کا روگ نہیں یہ تو صرف ان کا حصہ ہے جو اس علم کے بانی مبانی اور عالم تھے۔ یہ ایک ستون ہے جس پر دیگر علوم کی بنیاد قائم کی جا سکتی ہے لاتعداد شرحوں سے ان کا علم حاصل کرنا بالکل بے سود اور بیکار ہے۔" (مقدمہ)

مندرجہ بالا امثال سے علامہ موصوف مسلمانوں کے فن تعلیم کی کمزور پہلوؤں کو منظر عام پر لاتے ہیں متاخرین کی شرح و حواشی کے خبط نے مسلمانوں کی قوت ایجاد و اختراع کو بالکل مفلوج کر دیا تھا علماء و فقہا تفسیروں اور تاویلوں میں پڑنے کی ہمت ذکرتے تھے اجتہاد کی روح فنا ہو چکی تھی جس کی اصلاح کے لئے ابن خلدون نے قدم اٹھایا انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ اختلافی مسلوں پر مناظرے کئے جائیں اور ساتھ ہی ساتھ دار المباحثے قائم کئے جائیں۔ جہاں پر بچوں کی قوت استدلال اور قوت گویائی کی نشوونما پر توجہ دی جائے تاکہ وہ آزادانہ غور و فکر کے عادی بن سکیں

علا ابن خلدون نے کتب پر تنقید کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ درسی کتب بہت قلیل تعداد میں ہیں طلبہ نئے موضوع کے خلاصہ کو حفظ کر لینا کافی سمجھتے ہیں جس کے بعد وہ اس کی تشریح پر توجہ دیتے ہیں متن کو اس طرح ازبر کر لیا جاتا ہے کہ شرحوں کو پڑھتے وقت تمام باتیں بآسانی سمجھ میں آسکیں۔ ان کا اثر یہ ہوتا ہے کہ طلبہ لسانیات سے بے بہرہ رہ جاتے ہیں کیوں کہ ان کو ثقیل، غیر مانوس، الفاظ و محاورات ازبر کرنے پڑتے ہیں جن کا مقصد اختصار اور اجمال ہوتا ہے متن کو رٹ لینے کی وجہ سے لاتعداد خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

ابن خلدون نے فرسودہ طریقہ ہائے تدریس کے خلاف آواز ہی بلند نہیں کی بلکہ ان کے متبادل حل بھی پیش کئے انہوں نے کہا کہ ہر موضوع کو کم از کم تین مرتبہ دُھرانا چاہیے ان کے اس خیال کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ جدید ماہرین نے اس کو تعلیم و تعلم کی کامیابی و کامرانی کی کلید کہا ہے چنانچہ سب سے پیشتر نفس مضمون کا ابتدائی خاکہ بچہ کے سامنے پیش کرنا دوسری بار اس کے جزئیات اشکال اور تصاویر پر مدلل بحث

کرنا آخر میں اس کو دہرانا آج ہم اس عمل کو Recapitulation کے نام سے پکارتے ہیں۔ Herbart نے اس پر تفصیل سے بحث کی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علامہ کے خیال سے کتنا متاثر ہے۔

علامہ اس چیز سے اتفاق کلی کرتے ہیں کہ علم بغیر بحث بیکار ہے مولانا سعدیؒ نے بھی اس پر بہت زور دیا ہے چنانچہ اس بات کو مدنظر رکھ کر علامہ موصوف نے طلبہ کے بحث و مباحثہ کو تدریس کا لازمی جز قرار دیا ہے یہ وہی طریقہ ہے جس کو دور جدید میں Tutorial system کے نام سے پکارا جاتا ہے دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک میں اس کو بنیادی مقام حاصل ہے اس میں اول انفرادی طور پر بحث کی جاتی ہے اور طلبہ سے ان کو سپرد قلم کرنے کو کہا جاتا ہے اس طرح طلبہ مضمون کے مفہوم کی تہ تک پہونچ جاتے ہیں ابن خلدون کہتے ہیں کہ جو طلبہ اساتذہ سے بحث و مباحثہ نہیں کر سکتے وہ مضمون پر دسترس حاصل کرنے سے قاصر ہیں اور ان کی معلومات بھی محدود رہ جاتی ہے کیوں کہ ان میں رٹنے کی عادت پڑ جاتی ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ مفہوم ادا کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں اور ان کی قوت بیانیہ ترقی نہیں کر سکتی اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ علامہ موصوف دور جدید کی سب سے اہم تکنیک سے اس زمانہ میں واقف تھے جبکہ مغربی ممالک کے لوگ تعلیم و تعلم کے مفہوم سے بھی ناآشنا تھے اور انجیل مقدس کو رٹ لینا ہی تعلیم سمجھتے تھے ہم نے اپنے دور قیام مانچسٹر آکسفورڈ لندن برمنگھم لیورپول اور سالفرڈ یونیورسٹیوں کے طریقہ تدریس کو دیکھا اور وہاں پر اس طریقہ کو دیکھ کر تعجب ہوا آکسفورڈ یونیورسٹی میں تو طلبہ کو لیکچر بھی سننے کے لئے مجبور نہیں کیا جاتا بلکہ وہ ٹیوٹر سے ہی انفرادی ملاقات کے دوران مضمون پر گفتگو کے ذریعہ دسترس حاصل کر لیتے ہیں۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ جو ہمارا تھا اس کو دوسرے آنکھوں سے لگا رہے ہیں اور جو غیروں کا تھا اس کو آج ہم اپنے نظام تعلیم میں اپنا کر ملک کی دولت کو برباد کر رہے ہیں کاش کہ کوئی اس طرف توجہ دے سکتا۔

علامہ نے سزا اور جزا کے مسئلہ پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے وہ کہتے ہیں کہ سزا کا اثر طلبہ کے دماغ پر برا پڑتا ہے جن قوموں میں سزا دینے کا رواج ہے ان کا اخلاق پست ہوتا ہے سزا بچہ کے فطری جذبات قوت فکر اور اختراع کو ختم کر دیتی ہے اس سلسلہ

میں وہ یوں گوہر فشانی کرتے ہیں۔

"کیا سزا دے کر تم بچوں کی شرارتوں کا تدارک کر سکو گے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اس کا اثر یہ ہوگا کہ بچہ اپنے افعال و کردار میں دھوکا دینے کی کوشش کرے گا۔ اور وہ بداخلاق بزدل دھوکہ باز ہو جائے گا۔ کچھ عرصہ بعد یہ افعال اس کی عادت ثانیہ بن جائیں گے اور وہ اخلاق کے پست درجہ پر پہونچ جائے گا جس کا اثر قوم و فرد دونوں پر ہوگا۔"

دور جدید کا ماہر تعلیم جان ڈیوی John Dewey بھی علامہ کا ہم خیال ہے چنانچہ لکھتا ہے۔

"جب انسان کو اخلاق، مذہب اور معاشرہ راہ راست پر نہیں لا سکتا تو سزا سے اس کو بہتر انسان کیسے بنایا جا سکتا ہے" چنانچہ پھر وہ کہتا ہے۔

"تعلیم ایک معاشرتی فرض ہے اور معاشرتی تادیب ہی تعلیم کا اہم پہلو ہے کردار سازی بچوں سے اچھی شخصیت اور خود اعتمادی کے ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔"

(تعلیم اور جمہوریت)

جان ڈیوی ہی نہیں بلکہ اس کے پیشرو بھی روسو، پیستالوزی، ہربارٹ اور فروبل وغیرہ نے بھی سزا کی سخت مخالفت کی ہے۔

ابن خلدون معلمین کے علاوہ والدین کو بھی تلقین کرتے ہیں کہ وہ بچوں پر سختی نہ کریں اور پھر انہوں نے پیشہ ورانہ تعلیم پر بھی خوب بحث کی ہے ان کے خیال میں زندگی کی بقا کیلئے کسی نہ کسی پیشہ کو اپنانا ضروری ہے انہوں نے تعلیم نسواں معلمین کے اوصاف حمیدہ وغیرہ پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے جس کو ہم بوجہ طوالت نظر انداز کر رہے ہیں جہاں تک امام صاحب کے کارنامول کا سوال ہے تو دور جدید کا مشہور مورخ toynbee اس طرح انکو خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

"While Thucydides, Machivelli And Clarenoon Are All Brilliant Repreesentation of Brilliant Time, Ibne Khaldun is The sole point of Light in His Quarter of The Firmament."

باب ۸

ہندوستان، شاہانِ مغل اور تعلیم

Moghal Rulers in India & Education

اس سے پیشتر اجمالاً ہندوستان کی تعلیم و تربیت کے بارے میں تحریر کر آئے ہیں اب اس کی ترقی و ترویج کا مغلیہ دور میں تذکرہ کر رہے ہیں۔ مغلیہ دور میں قریباً ہر حکمراں نے اس سلسلہ میں حتیٰ المقدور کوشش کی ان کے ساتھ ہی ساتھ اولیا اور مشائخ کے کارنامے بھی ناقابلِ فراموش ہیں ہندوستان یا پاکستان کا کوئی شہر قصبہ یا دیہات شاید ہی ایسا ملے جہاں پر کسی بزرگ کا مقبرہ موجود نہ ہو یہ بزرگان دین عوام کو مذہبی تعلیم دینا فرض منصبی خیال کرتے تھے۔ یہ علماء تعلیم مسجد، مکتب اور مدرسہ کے علاوہ اپنے مکانوں پر بھی بہم پہونچایا کرتے تھے۔ تاریخ ظاہری کے مصنف نے اپنے پیر و مرشد مولانا اسحاق کے مکان پر تعلیم حاصل کی اور سعدی خاقانی ملا جامی اور انوری کے کلام کا درس لیا اس قسم کے انتظام قریباً سارے برصغیر میں موجود تھے جہاں پر تشنگانِ علوم حاضر ہو کر تسلی و تسکین حاصل کرتے تھے۔

دور مغلیہ میں بھی تعلیمی اداروں کی وہی اقسام تھیں جن کے بارے میں ہم پیشتر تحریر کر چکے ہیں یعنی مسجد جہاں پر ابتدائی مذہبی تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ دیگر علوم پر بھی توجہ دی جاتی تھی مساجد کے بعد مکاتب تھے جن کو ہم دور جدید کا ابتدائی یا پرائمری اسکول Elementary Schools کہہ سکتے ہیں جہاں پر بھی تعلیم تو شرط تھی لیکن اس کے علاوہ دیگر مضامین پر خاص توجہ کی جاتی تھی۔ عموماً مخلوط تعلیم کا رواج تھا۔ مکتب کے بعد مدرسہ کا نمبر تھا دور اسلامیہ میں یہ لفظ بہت ہی وسیع معنی میں استعمال ہوتا تھا مثلاً مدرسہ نظامیہ جو اپنے وقت کی زبردست یونیورسٹی تھی۔ بہرحال مغلیہ دور میں بھی اس کا مفہوم یہی تھا لیکن موجودہ دور میں ہم اس سے ہائی اسکول کا مطلب لیتے ہیں ان کے علاوہ گلڈ اور دارالعلوم بھی ہوتے تھے ان مقامات پر شوقین طلبہ اپنی عمر تحقیق و تجربات میں گذارتے تھے۔ ہندوؤں کی تعلیم گاہیں

پاٹ شالائیں اور مندر تھے مسلمانوں میں تعلیم دینا اور اس کے لیے انتظام کرنا کار ثواب ہے اس لیے مغلیہ دور میں اس میں ناقابل بیان ترقی ہوئی کیونکہ قریباً ہر حکمراں تعلیم یافتہ تھا اور وہ اپنی رعایا کو زیور تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتا تھا۔

مقاصد تعلیم Aims of Education

تعلیم کا مقصد دینی اور دنیاوی افادیت پر مبنی تھا یعنی وہی مقصد تھا جو حضور اکرمؐ کے زمانہ سے بدستور چلا آرہا ہے اور آج بھی اسلامی نقطہ نظر سے یہی مقصد ہے چنانچہ مغل عہد میں تعلیم کا مقصد اس دنیا اور عاقبت کے لئے تیاری کا نام تھا فرد کو اپنی قدرتی صلاحیتوں کے مطابق ترقی کرنے کے پورے مواقع حاصل تھے مغلوں نے بدلتے ہوتے حالات کا اندازہ نہیں کیا ورنہ ان کے لئے لازمی تھا کہ وہ ان مقاصد میں تبدیلی کرتے وقت بدل چکا تھا حالات بدلے ہوئے تھے لیکن تعلیم اسی نہج پر رواں دواں تھی نتیجہ یہ ہوا کہ اندرونی خلفشار اور بیرونی حملوں سے حکومت پارہ پارہ ہوگئی

نصاب تعلیم Content of Education

نصاب تعلیم ہمیشہ مقاصد تعلیم کا رہین منت ہوا کرتا ہے یہی وجہ تھی کہ نصاب دینی اور دنیاوی دونوں اقسام کے مضامین کے انتخاب میں آزادی حاصل تھی علمی اور ذہنی تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ فنی اور دستکاری کی تربیت کے بھی معقول انتظامات تھے طلبہ دور دور سے تحصیل علوم کے لئے آتے جن کی رہائش اور خورد و نوش کا معقول انتظام ہوتا. مغل حکمراں مدرسوں کے اندرونی انتظامات میں دخل اندازی نہیں کرتے تھے غرضیکہ حکومت جبر نہیں کرتی تھی معیار تعلیم بلند اور اعلیٰ تھا مدرسوں میں دینوی علوم مثلاً فقہ، تفسیر، قرآن پاک کلام حدیث کے علاوہ دنیاوی علوم مثلاً فلسفہ منطق خطابت ادب ریاضی، تاریخ، طب فلکیات وغیرہ پر توجہ دی جاتی تھی فرد اور معاشرے کی ضروریات کا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔

طریقہ تعلیم Methods of Education

تدریس کے وہی روایتی طریقے تھے جن کا دارو مدار حافظہ پہ تھا لیکن استاد اور شاگردوں میں رابطہ اس زمانہ کی خصوصیت تھی اساتذہ شاگردوں کے لئے قابلِ

قدر نمونہ تھے جن کی شخصیت کا طلبہ کے اخلاق و کردار پر گہرا اثر پڑتا تھا۔ تعلیم محض کتابی نہیں تھی بلکہ علم با عمل کا نظریہ تھا۔ اخلاقی و دینی اصولوں پر نہ صرف شاگرد بلکہ اساتذہ بھی عمل کرتے تھے اس طرح ابتدا ہی سے بچہ میں عملی صلاحیت اور ذہنی تربیت کے ساتھ اس اعلیٰ کردار کی بھی کوشش کی جاتی تھی۔

نئی تعلیم اور دستکاری کا وہی پرانا طریقہ رائج تھا جو ملکی ضروریات کی کفالت کرتا تھا لیکن اس کے علاوہ مغل شاہنشاہوں نے اپنی خانگی ضرورت اور مملکت کی ضرورت کے پیش نظر بڑے بڑے کارخانہ قائم کر رکھے تھے یہ کارخانہ عموماً ایسے مقامات پر قائم کئے گئے تھے جہاں مصنوعات کے لئے ضروری خام مال عمدہ اور آسانی سے فراہم ہو سکتا تھا دہلی لاہور کشمیر آگرہ بنگال گجرات وغیرہ میں شاہی کارخانے بنائے گئے تھے شاہی ضروریات کے علاوہ مملکت کی ضروریات بھی یہی کارخانے تیار کرتے تھے ان کی نگرانی ماہرین کے سپرد تھی ان کے علاوہ سرکاری ٹیکنیکل اسکول بھی تھے صوبوں میں گورنروں نے بھی اس قسم کے لاتعداد کارخانے قائم کر رکھے تھے۔ ان میں ماہرین کی زیرِ نگرانی طلبہ کو تربیت فراہم کی جاتی تھی مصنوعات کے لحاظ سے مغلوں کے عہد میں ہند مغربی ممالک سے کہیں زیادہ آگے تھا۔ اس کی مصنوعات مثلاً ڈھاکہ کی ململ لکڑی اور ہاتھی دانت کی اشیاء عطر و روغنیات کی یورپ میں بڑی مانگ تھی۔ دوشالے ریشمی اور زربفت کے کپڑے دھاتوں کے خوبصورت برتن شیشے کا سامان، کتابیں، تصاویر، جوتے، اسلحہ جات، شامیانے خیمے کشتیاں غرضیکہ ہر قسم کا سامان نہایت اعلیٰ پیمانے پر تیار ہوتا تھا جس سے تعلیم و تربیت کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔

مدرسے اعلیٰ تعلیمی مراکز تھے شاہانِ مغلیہ امراء و روساء نے بے شمار مدرسے قائم کئے ان کے اخراجات کے لئے دل کھول کر جاگیریں وقف کیں۔ مدارس میں قابل معلمین ہوتے تھے جو طلبہ کی درس و تدریس پر نظر خاص رکھتے تھے بعض بعض مدارس میں ہزاروں طلبہ ہوتے تھے۔

اب ہم چند مغلیہ حکمرانوں کے ادبی اور ثقافتی کارناموں پر اجمالاً روشنی ڈالنا ضروری خیال کرتے ہیں تاکہ ناظرین ان کی تعلیمی خدمات کا اندازہ ہو سکے۔

بابر: Babar 1540-1545 : بابر کی قابلیت اور اہلیت سے کون ایسا ہے جو واقف نہیں یہ شخص اپنے زمانہ کا ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی تاریخ میں لاثانی حیثیت کا حامل ہے جس کے تذکروں سے لاتعداد کتب پُر ہیں. جہاں تک اس کی ادبی علمی اور ثقافتی کارناموں کا سوال ہے تو اس مختصر سی کتاب میں ناممکن ہے کہ اس کے کسی بھی پہلو پر سیر حاصل بحث کی جا سکے. بہرحال بابر عربی فارسی اور ترکی زبانوں کا ماہر تھا. اس کا مطالعہ وسیع اور نظر عمیق تھی۔ ابتدا ہی سے شاعری کا شوق تھا. ترکی زبان کا تو وہ مستند شاعر تھا جس کا اندازہ اس کی تزک بابری سے بآسانی کیا جا سکتا ہے ابوالفضل نے ایک فارسی مثنوی بھی بابر کے نام سے موسوم کی ہے اس کو علم بلاغت و فصاحت پر بھی عبور تھا" تزک بابری" اس کا نادر نمونہ ہے بقول ارسکن بابر نے خواجہ احرار کی کتاب کو منظوم کیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ نظم و نثر دونوں میں اعلیٰ قابلیت کا مالک تھا. علم موسیقی کا دلدادہ تھا جس پر ایک رسالہ بھی تصنیف کیا اصول فقہ اور ماغت پر بھی رسائل لکھے محمد علی خاں انصاری نے تاریخ مظفری میں لکھا ہے کہ اس نے مذہب پر بھی ایک رسالہ لکھا تھا جس کا نام مفصل ہے اس کی قابلیت اور اہلیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے ایک رسم الخط ایجاد کیا جو "خط بابری" کے نام سے مشہور ہے. اس خط میں اس نے کلام پاک لکھ کر مکہ معظمہ روانہ کیا تھا۔

بابر کی زندگی مشکلات و مصائب کا جیتا جاگتا مرقع ہے بقول اس کے اسے کبھی بھی سکون نصیب نہیں ہوا لیکن اس کے باوجود وہ اپنے علمی ذوق و شوق کی تکمیل کے لئے وقت ضرور نکال لیتا تھا وہ شاعر تھا مشاعروں کا بے حد شوقین تھا. لین پول رقم طراز ہے کہ ایک بار اس نے ایک مشاعرے کو کشتی پر منعقد کیا وہ ترکی اور فارسی میں فی البدیہ اشعار کہہ لیتا تھا. بابر کو عمدہ کتابیں جمع کرنے کا بھی شوق تھا. جب اس کو معلوم ہوا کہ غازی خاں کے پاس عمدہ کتب خانہ ہے تو اس نے اس کو غداری کے الزام میں قید کر لیا لیکن کتب خانہ میں اس کو عمدہ کتب نہیں ملیں جس کا تذکرہ اس نے خود کیا ہے۔

"جس قدر کتابیں حاصل کرنے کی اُمید تھی وہ پوری نہیں ہوئی"

کتابوں میں قلمی تصاویر کا ہندوستان میں رواج نہیں تھا لیکن ایران اور وسط ایشیا میں یہ طریقہ موجود تھا چونکہ مصوری اسلام میں ممنوع ہے بابر اس فن کو اپنے ساتھ لایا

کیونکہ تزک بابری کے بعض نسخے تصاویر سے مزین ہیں سید معمر علی جو بابر کا ایک وزیر تھا اور جس نے ایک کتاب تواریخ کے نام سے لکھی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ بابر نے سیاسی مصروفیات کے باوجود مدارس اور دارالعلوم کی طرف توجہ دی تھی جس کا اندازہ اس کے علمی اور ادبی کارناموں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

ہمایوں Humayun 1530-1556 ہمایوں کی ساری عمر مصیبتوں میں گزری لیکن پھر بھی چونکہ وہ خود اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اس لئے اس نے اس کی ترقی و ترویج کے لئے ہر ممکن کوشش کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اپنی مصروفیات کے باوجود اتنا وقت ضرور نکال لیتا تھا کہ وہ علوم وفنون کی طرف توجہ دے سکے۔ ہمایوں خود علم نجوم اور جغرافیہ کا ماہر تھا اس نے اربع عناصر کے وجود اور ماہیت پر چھوٹے چھوٹے رسائل لکھے ہیں۔ اس نے کرہ ارض اور نظام شمسی کے نقشے تیار کروائے تھے اس کی صحبت میں ہمیشہ علماء شعرا اور فلسفی رہتے تھے اس کا ذوق نجوم خبط کی حد تک پہونچ گیا تھا اسی سلسلہ میں اس نے کافی کارنامے انجام دیئے اس کے دربار میں خوندمیر مورخ، جوہر آفتاب چی وغیرہ موجود رہتے تھے جو تاریخ میں مشہور ہیں۔ ہمایوں کے علمی شوق کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب وہ واپس ہندوستان آیا اور اس نے دہلی پر قبضہ کیا تو اس کو شیر شاہ کی عمارت "شیر منڈل" ملی جس کو اس نے کتب خانہ میں تبدیل کر دیا۔ یہ وہی کتب خانہ ہے جس کی سیڑھی سے گر کر اس کی موت واقع ہوئی تھی۔ آئین اکبری سے پتہ چلتا ہے کہ ہمایوں نے ایک مدرسہ دہلی میں تعمیر کروایا جسکے مشہور مدرس شیخ حسین تھے شیخ زین الدین خواضی نے خیار کے قریب ایک مدرسہ قائم کیا ہمایوں کو کتب بینی کا بہت شوق تھا چنانچہ جب کبھی وہ مہمات پر روانہ ہوتا تو ایک منتخب کتب خانہ لے کر جاتا۔ فان ٹائیر جس نے جرمنی زبان میں اکبر کی سوانح عمری لکھی ہے رقم طراز ہے کہ شیر شاہ سے شکست کے بعد جب ہمایوں ہندوستان چھوڑ رہا تھا اس وقت بھی اس کے ساتھ ایک کتب خانہ معہ مہتمم تھا۔ اسٹیفین نے اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہے

" مقبرے (ہمایوں) کی چھت پر ایک مدرسہ تھا جو مشہور تھا مسند عالم اسکے مہتمم ہوا کرتے تھے یہ مدرسہ اب بند ہے اور قریباً ڈیڑھ سو سال سے اس میں تعلیم

نہیں دی جاتی"۔

ایک اور محقق تعمیرات اپنی کتاب "دہلی قدیم وجدید" میں رقم طراز ہے۔

"اس عمارت (مقبرہ ہمایوں) کی چھت پر گنبد کے نیچے کچھ کمرے ایسے ہیں جن سے ظاہر ہوتا کہ کسی زمانہ میں یہاں پر درس و تدریس کا کام ہوتا تھا"

شیر شاہ سوری؛ SHER - SHAH 1540 - 1545 انتظامی قابلیت اور کارناموں کی وجہ سے قرون وسطی کے بڑے حکمرانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کو صرف پانچ سال کا قلیل عرصہ میسر ہوا لیکن اس دور میں جو کارنامے اس نے انجام دیئے اس کو حیات جاوید حاصل ہے عباس خاں نے تاریخ شیر شاہی میں اس کی ادب نوازی کی بہت سی مثالیں لکھی ہیں چونکہ خود صاحب علم تھا اس لئے علما کی بڑی قدرومنزلت کرتا تھا اس نے ایک مدرسہ نارنول میں تعمیر کرایا تھا جو حصار اور جے پور کے درمیان ایک قصبہ ہے اس کی ابتدائی زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے جون پور جو اس زمانہ میں تعلیم کا مرکز تھا تعلیم حاصل کی تھی شیر شاہ کا زمانہ زیادہ تر رعایا کے فلاح و بہبود کے کاموں اور لڑائیوں میں گزرا اس لئے اس کے تعلیمی کارناموں کا پتہ نہیں چلتا۔

جلال الدین محمد اکبر (1556 - 1605) AKBAR اکبر کے سلسلہ میں ابوالفضل آئین اکبری میں رقم طراز ہے کہ وہ ہمیشہ کتابیں پڑھوا کر سنا کرتا تھا پڑھنے والے سرکاری ملازم تھے جن کو معاوضہ ورقوں کے حساب سے ادا کیا جاتا تھا (BLACK MAN ج 103) بہرحال یہ متنازعہ فی مسئلہ ہے لیکن یہ بات ضرور ہے کہ اکبر کو بھی علم وادب سے کافی رغبت تھی۔ ابوالفضل کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"بمشکل کوئی ایسی اعلیٰ کتاب ہوگی جو اعلیٰ حضرت نے نہ سنی ہو وہ اس کام سے کبھی نہیں تھکتے تھے اور نہ ہی دہرانے کو ناپسند کرتے تھے ہر مضمون کو بہت شوق، غور و خوض سے سنتے تھے۔" (آئین اکبری ترجمہ بلاکمین)

اگرچہ اکبر کا ابتدائی زمانہ مشکلات اور شورشوں میں گزرا پھر بھی وہ فلسفیوں صوفیوں اور مورخوں سے تبادلہ خیال کرنے کے لئے تھوڑا بہت وقت ضرور نکال لیتا تھا اس کو مباحثوں میں بہت لطف آتا تھا چنانچہ اس کام کے لئے اس نے فتح پور سیکری

میں ایک بڑا الیوان شاہی محل کے باغ میں تعمیر کرایا تھا اس میں چار کمرے تھے مغربی کمرہ اہل سادات جنوبی کمرہ علمار شمالی کمرہ شیوخ اور صوفیائے کرام اور مشرقی کمرہ امرار و ارباب دربار کے لئے تھا جمرات و اتوار کو صوفی حکیم مبلغ فقیہ اہل سنت شیعہ برہمن جین بدھ عیسائی یہودی زرتشت غرضیکہ ہر مذہب کے لوگ شاہی اجتماع میں مدعو کئے جاتے تھے ہر شخص کو آزادی تھی کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کر سکے ۔

اکبر نے ہر زبان کے علم وادب کو بہت فروغ دیا کلاسیکی کتب کا ترجمہ کرایا گیا مہابھارت کا ترجمہ فارسی میں کیا گیا جس کا نام رزم نامہ رکھا گیا اس میں حسب حال تصاویر بھی چھاپی گئیں رامائن کا ترجمہ عبدالقادر نے چار سال میں کیا اتھروید کا ترجمہ حاجی ابراہیم نے کیا ۔لیلاوتی کا ترجمہ ابوالفضل نے کیا اور مکمل خاں گجراتی نے علم نجوم کی کتاب تاجک کا ترجمہ کیا تاریخ کاشمیر جو سنسکرت میں تھی مولانا شاہ محمد شاہ آبادی نے فارسی میں کیا عبدالرحیم خانخاناں نے بابر کی کتاب جو ترکی میں تھی اس کا فارسی میں ترجمہ کیا جامع الرشید کا ترجمہ بھی ملا عبدالقادر نے کیا مجمع البلدان عربی زبان میں جغرافیہ کی کتاب تھی ۔ اس کا ترجمہ ملا احمد نے کیا ان کے علاوہ پرہنس پنچ تنتر کا بھی فارسی زبان میں ترجمہ کیا گیا شاہ نامہ فردوسی کو نثر میں لکھا گیا ۔اس کے علاوہ حیات الحیوان کا ترجمہ بھی کیا گیا ۔ ابوالفضل کو انجیل مقدس کے ترجمہ پر مامور کیا گیا ۔اکبر کے ساتھ علماٗ کا گروہ چلا کرتا تھا اسی دوران میں تاریخ الفی لکھی گئی ۔

اکبر کو کتب جمع کرنے کا شوق تھا اس کے کتب خانہ میں لاتعداد کتب تھیں فارسی کی کتابوں میں مصوروں نے خوب جوہر دکھائے ہیں قصہ امیر حمزہ کی بارہ جلدیں ہیں جس میں چودہ سو تصاویر ہیں اس کے علاوہ چنگیز نامہ ظفر نامہ اقبال نامہ رزم نامہ رامائن قصہ نل ودمن قصہ کلیلہ ودمنہ اور عیار دانش وغیرہ کو بھی تصاویر و بیل بوٹوں سے سجایا گیا ہے ۔فنون لطیفہ میں اکبر نے ایک نگار خانہ قائم کیا تھا جہاں مصور جمع ہو کر اپنا کمال دکھاتے تھے ان میں خاص خاص کے نام یہ ہیں ۔میر سید علی تبریزی خواجہ عبدالصمد شیریں قلم وسونت پسر پالکی بردار، بساون، کیشو، لال، مکند، شکیں، فرخ قلمقی مادھو جگن مہیش کھیم کرن تارا، سنولا، ہری بنس اور رام ۔موسیقی میں بھی بہت سے باکمال لوگ تھے جن میں تان سین، ہری داس وغیرہ

خاص ہیں: ابوالفضل نے ان کی ایک لمبی فہرست لکھی ہے یہی حال صوبوں کا بھی تھا۔

خوش خطی مسلمانانِ عالم کی مایہ ناز خصوصیت رہی ہے چنانچہ وہ اس فن کو ہندوستان بھی لائے اکبر کے دور میں مندرجہ ذیل طریقے رائج تھے ثلث، توقیع، محقق، نسخ، ریحان رقاع، غبار۔

اکبر کو اپنے لڑکوں کی تعلیم کا بہت خیال تھا شاہزادوں کی تعلیم کا مسئلہ ہمیشہ نازک رہا ہے اس لئے ان کے معلمین کے انتخاب کا بہت اہم اور پیچیدہ مسئلہ تھا کیونکہ زیادہ تر ولی عہد اپنے باپ کے خلاف بغاوت کرتے رہتے تھے اس لئے ایسے معلم کی ضرورت ہوتی تھی جس کی وفاداری مسلّم ہو اکبر کے دور کی خاص بات یہ تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعلیم یکجا ہونے لگی۔ اکبر پہلا بادشاہ تھا جس نے تعلیمات کا محکمہ قائم کیا۔ بچوں کو ابتدا میں فارسی حروفِ تہجی کی تعلیم دی جاتی تھی اس کے بعد حروف کے حرکات یعنی اعراب سکھائے جاتے تھے یہ تعلیم دو دن میں ختم ہو جاتی تھی اس کے بعد دو حروف کا ملانا جو قریباً ایک ہفتہ جاری رہتا تھا۔ پھر نثر یا نظمیں پڑھائی جاتی تھیں جن میں دو حرفی الفاظ زیادہ ہوں سبق کو پڑھوا کر تلفظ ٹھیک کیا جاتا تھا اس کے بعد استاد چھوٹے چھوٹے مصرعے پڑھتا یا پڑھواتا تھا جو مذہبی یا اخلاقی ہوتے تھے استاد روزانہ طلبا کو چار مشقیں دیا کرتا تھا۔

۱۔ حروفِ تہجی کا صحیح تلفظ

۲۔ حروف کو ملانا

۳۔ مصرع یا شعر پڑھوانا۔

۴۔ آموختہ سبق دھرانا۔

یہ طریقہ تعلیم کامیاب ثابت ہوا جس تعلیم میں کئی سال صرف ہوتے تھے وہ مہینوں میں ختم ہو جاتی تھی مندرجہ ذیل علوم اسی طریقہ سے پڑھائے جاتے تھے علم اخلاق علم ہندسہ حساب زراعت مساعت نجوم جغرافیہ، اقتصادیات سیاست، طبیعیات، منطق فلسفہ ریاضی دینیات اور تاریخ۔ اہلِ ہنود ویاکرن (قواعد) ویدانتک فلسفہ اور پاتنجلی پڑھتے تھے ہر بچہ کو اس کے رجحانِ طبع کے مطابق تعلیم دی جاتی تھی آئینِ اکبری میں ابوالفضل رقم طراز ہے کہ ان اصلاحوں نے تعلیم گاہوں میں نئی روح پھونک دی تھی اور ان کو منبعِ تعلیم

بنا دیا تھا۔

اکبر کا خراجِ تحسین کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے طریقہ تعلیم کے علاوہ بڑی تعداد میں تعلیم گاہیں قائم کیں جو حکومت کے ہر حصے میں تھیں سیل چند نے اپنی کتاب "تفریح اسمارات" میں تحریر کیا ہے کہ اکبر نے فتح پور سیکری میں خاص طرز کا کالج قائم کیا تھا آگرہ دہلی فتح پور سیکری میں اس نے بہت سے مدارس قائم کئے تھے۔ شیخ عبدالحق جو اس زمانہ کے جید عالم تھے لکھتے ہیں کہ دہلی اور آگرے میں تمام مدرسے رہائشی تھے عبدالحق کا بیان ملاحظہ فرمایئے۔

"میں اپنے مدرسے میں دن میں دو وقت جایا کرتا تھا۔ یہ مدرسہ دہلی میں تھا اس میں موسم کا سوال نہیں تھا گرمی اور سردی میں دونوں میں جایا کرتا تھا یہ مدرسہ گھر سے دو میل کے فاصلے پر تھا۔"

ایسے علوم جن کی تکمیل مدرسوں اور تعلیم گاہوں میں نہیں ہوتی تھی۔ وہ قابل استادوں کے مکانوں پر پڑھنے جاتے تھے۔ عہد اکبری میں تعلیم کو بہت فروغ ہوا جس میں بادشاہ اور اس کے درباریوں کا خاص حصہ تھا۔ ماہم انگا نے ایک مدرسہ قائم کیا دوسرا مدرسہ خواجہ معین نے قائم کیا اس طرح تمام ملک میں مدارس کا جال پھیلا ہوا تھا طبقات اکبری ان علمائے کرام کی فہرست جو ان مدارس سے منسلک تھے عبدالرحیم خانخاناں فارسی ترکی عربی اور سندھی کے بھی شاعر تھے اس شخص کی زبردست لائبریری تھی ماثر رحیمی کی مصور جلد میں جو ان کے کتب خانے کی تصویر ہے جس سے تعمیر کتب خانہ ترتیب کتب اور طریقہ کتب بینی و استعمال کتب کو دکھایا گیا ہے اسی کتاب میں ۹۵ آدمیوں کی فہرست دی گئی ہے جن کی پرورش عبدالرحیم خاں کیا کرتا تھا۔ اکبر کے دور کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ ہندو مسلم کے اختلاط سے ایک نئی تہذیب اور ثقافت نمودار ہوئی اور ایک خاص زبان نے جنم لیا جو آج کل اردو کہلاتی ہے۔

جہانگیر: JEHANGIR (1605-1627) : جہانگیر کی تعلیم و تربیت کا اکبر نے بہتر ین انتظام کیا تھا اس کے استادوں میں مولانا میر کلاں محدث، عبدالرحیم خانخاں قطب الدین محمد خاں وغیرہ خاص تھے جہانگیر کو فارسی اور ترکی زبانوں پر عبور حاصل تھا اس کو تاریخ سے بھی دلچسپی تھی اور اس کی تمنا تھی کہ وہ اپنے عہد کی مستند تاریخ چھوڑے

لیکن بوجہ عدیم الفرصتی وہ ایسا نہ کر سکا اس نے محمد ہادی اور معتمد خاں کو جو تاریخ پر عبور رکھتے تھے ملازم رکھا تاکہ وہ اس کی "تزک جہانگیری" کی تدوین میں مدد کریں۔ خافی خاں منتخب اللباب میں رقم طراز ہے کہ جہانگیر نے ایک خاص اعلان جاری کیا کہ اگر کوئی شخص یا مسافر انتقال کر جائے اور وہ لاوارث ہو تو یہ تمام دولت مدرسوں اور خانقاہوں کی تعمیر پر خرچ کی جائے۔ تاریخ جان جہاں" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جہانگیر نے تخت نشینی کے بعد ان مدارس کی مرمت کروائی جو بند تھے اور ان کو دوبارہ سے آباد کیا۔ محمد صافی نے صوبہ گجرات میں کئی ادارے قائم کئے جہانگیر اپنی تزک میں رقم طراز ہے"۔ اکبر آباد (آگرہ) کے باشندے تعلیم اور دستکاری میں فوقیت رکھتے ہیں کیونکہ ان کو تحصیل علوم کا شوق ہے اس شہر میں لاتعداد علما مختلف مذہب و ملت آباد ہیں۔

جب جہانگیر سفر گجرات پر گیا تو وہ اپنے ساتھ کتب خانہ لے گیا۔ اور گجرات کے شیوخ کو اس نے مندرجہ ذیل کتب عنایت کیں۔ تفسیر حسینی، تفسیر کشاف روضۃ الاحباب ہر کتاب کے صفحہ پر اس نے اپنی گجرات میں آمد دن اور تاریخ بھی لکھی جہانگیر کو فن مصوری کا شوق تھا اس کے دربار میں دنیا کے مشہور و معروف مصور موجود تھے جن میں ابوالحسن، منصور لاثانی" بے مثال تھے فن موسیقی بھی عروج پر تھی۔ جہانگیر نے ان کا تذکرہ اپنی تزک میں تفصیل سے کیا ہے۔

جہانگیر کے عہد میں علماء میں مرزا غیاث بیگ، نقیب خاں معتمد خاں، نعمت اللہ خاں، شیخ عبدالحق وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اقبال نامہ میں علما شعرا اور مصوروں کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔

شاہ جہاں: Shahjehan (1628 - 1658) شاہ جہاں کا دور عمارات کی وجہ سے بے مثال ہے جہاں تک تعلیم کا سوال ہے تو وہ پرانی نہج پر چلتی رہی فرانس کے مشہور سیاح برنیر نے تعلیمی حالت بیان کرتے ہوئے ایک نہایت تاریک تصویر پیش کی ہے جو تعصب اور لاعلمی پر مبنی ہے جامع مسجد کے قریب اس نے ایک شاندار تعلیم گاہ قائم کی جس کے متعلق اسٹفین لکھتا ہے۔

وہ جامع مسجد کے شمال میں شاہی شفا خانہ تھا جس کے جنوب میں شاہی مدرسہ

یہ دونوں عمارتیں غدر سے پہلے ویران ہو چکی تھیں یہ دونوں ساتھ ہی ساتھ تعمیر ہوئی تھیں "۔

سرسید نے اس مدرسے کا تذکرہ "آثار الصنادید" میں بھی کیا ہے شاہ جہاں نے "دارالبقا" نام کے مدرسہ کی مرمت کروائی اور مولانا محمد صدر الدین کو اس کا معلم مقرر کیا۔ عبدالحمید لاہوری رقم طراز ہے کہ شاہ جہاں رات کو کتب بینی کیا کرتا تھا جس سے اس کے ذوق و شوق کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کو علم موسیقی اور فن مصوری کا بھی بہت شوق تھا دارا شکوہ عربی اور فارسی کا زبردست عالم تھا اس کو سنسکرت زبان پر بھی عبور تھا اس نے سنسکرت کی کچھ کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا مثلاً انپشند، بھگوت گیتا وغیرہ اس کے علاوہ اس نے اور بھی بہت سی تصانیف کیں۔

المختصر شاہجہاں کا دور بھی کسی طرح دوسرے حکمرانوں سے کم نہیں تھا۔ ہم نے اختصار کو مدنظر رکھ کر صرف اشارات پر ہی اکتفا کیا ہے۔

اورنگ زیب Aurang Zeb (1658 - 1707)

عالمگیر کا عہد انقلابی دور تھا وہ پکا مسلمان تھا اس لئے وہ ان بدعتوں کو بند کرنا چاہتا تھا جو اکبر کے زمانے سے رائج تھیں اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ خالص اسلامی حکومت قائم کرے لیکن وقت کا تقاضہ یہ نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی ساری عمر مصیبتوں اور مشکلوں میں گذری۔ اورنگ زیب نے تعلیم کو فروغ دیا اور اسلامی تعلیم کی اشاعت کی۔ پروفیسر کین جو اورنگ زیب کے مخالفین میں سے ایک ہے رقمطراز ہے۔

"اورنگ زیب نے سزائے موت منسوخ کر دی، زراعت کو ترقی دی اور بے شمار دارالعلوم اور مدارس قائم کئے سڑکیں اور پل بھی بنوائے "۔

لکھنؤ کے ایک محلہ میں آج تک ایک مدرسہ موجود ہے جو فرنگی محل کے نام سے مشہور ہے۔ تاریخ مراۃ احمدی کا مصنف لکھتا ہے کہ اورنگ زیب نے مکرمت خاں دیوان گجرات کو حکم دیا کہ وہ تمام طلبہ کو وظیفہ و مشاہیرہ خزانہ شاہی سے عطا کیا کرے قاضی رفیع الدین خاں نے بیانہ میں مدرسہ قائم کیا۔ سیالکوٹ بھی تعلیمی مرکز تھا وہاں پر ایک مدرسہ مولوی عبدالحکیم نے قائم کیا تھا سیالکوٹ میں کاغذ بنتا تھا اس وجہ سے یہاں بہت سے کارخانے تھے اورنگ زیب نے جو الفاظ اپنے استاد ملا صالح سے کہے تھے ہم ان کو نقل

کرتے ہیں اورنگ زیب کا سب سے عظیم کارنامہ شرح محمدی پر ایک مبسوط کتاب فتوائے عالمگیری ہے جس کی تدوین وتالیف کے لئے پوری سلطنت کے فقہا جمع ہوئے تھے اس عہد کا مشہور زمانہ مدرسہ احمدیہ بھی تھا بوجہ طوالت ہم تفصیل کو نظر انداز کر رہے ہیں۔

اورنگ زیب کے زمانہ سے ہی خاندان مغلیہ زوال پذیر تھا۔ یہ بات ضرور ہے کہ اس کی وفات ۱۷۰۷ء سے لیکر اس کے وارثین نے ۱۸۵۸ء تک حکومت کی لیکن اس دور میں طوائف الملوکی کا دور دورا رہا۔ اس لئے ہم اس کو بیان کرنا ضروری خیال نہیں کرتے۔

تعلیم نسواں (Female Education)

اسلام نے تعلیم عورت اور مرد دونوں کے لئے ضروری قرار دی ہے۔ ہندوستان میں کیونکہ پردے کی رسم تھی اس لئے تعلیمی حالت کی تفصیل معلوم نہیں ہوتی بہرحال مذہبی تعلیم لڑکیوں کے لئے ضروری تھی جعفر شریف نے اپنی کتاب "قانون اسلام" میں تحریر کیا ہے کہ لڑکیاں مدرسوں میں تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ ہماری ناچیز رائے میں جعفر شریف کا مطلب مدرسہ سے مکتب ہے۔ سلطان التمش کی لڑکی رضیہ تعلیم یافتہ تھی تاریخ فرشتہ گلشن ابراہیمی میں مالوہ کا تذکرہ کیا ہے جہاں پر اس نے پندرہ ہزار عورتوں کی تعلیم وتربیت کے تقرر کا ذکر کیا ہے۔

عہد مغلیہ میں چند معزز خواتین کے حالات ملتے ہیں جس سے پتہ ملتا ہے کہ ان کو جو تعلیم دی جاتی تھی وہ مذہبی نہیں تھی گلبدن بانو بیگم ہمشیرہ ہمایوں نے تو باقاعدہ "ہمایوں نامہ" نام کی تاریخ لکھی اسی طرح ہمایوں کی بھانجی گلرخ جو شاعرہ بھی تھی۔

ڈاکٹر اسمتھ نے فتح پور سیکری میں لڑکیوں کے مدرسے کا باقاعدہ نقشہ پیش کیا ہے ہیوں نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ جہانگیر کی ملکہ نورجہاں عربی وفارسی میں ماہر تھی اس کے متعلق جسٹس امیر علی نے ایک مضمون لکھا ہے جس میں اس کی خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔ شاہ جہاں کی ملکہ ممتاز محل بھی شاعرہ تھی اسی طرح شاہجہاں کی لڑکی جہاں آرا تعلیم یافتہ تھی اور علماء کی کفالت کیا کرتی تھی اورنگ زیب کی لڑکی

زیب النساٴ تھی جس کو اورنگ زیب نے خود تعلیم دی تھی۔ زیب النسا کا دیوان بھی مخفی کے نام سے بازار میں موجود ہے۔

مندرجہ بالا امثال سے سوالات پیدا ہوتے ہیں (۱) اگر تعلیم نسواں کا انتظام نہیں تھا تو یہ خواتین کیسے تعلیم یافتہ ہو گئیں۔ (۲) اگر انتظام تھا تو کس طرح کا تھا۔؟ (۳) تعلیم کہاں پر دی جاتی تھی ؟ (۴) کون دیتا تھا ؟ بہرحال یہ سوالات تشریح طلب ہیں جن کے لئے تحقیق کی ضرورت ہے یہ امر مسلمہ ہے کہ تعلیم نسواں کا انتظام تھا۔

ہم نے اختصار سے مندرجہ بالا سطور میں شاہان مغل کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ کر دیا ہے اس تذکرے سے ہمارا مقصد خاص ناظرین کے سامنے ان حکمرانوں کی کاوش کو پیش کرنا تھا جو انہوں نے اس ضمن میں انجام دیں تھیں افسوس یہ ہے کہ ہم کو ان لوگوں کے کارناموں سے مکمل واقفیت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص انگریزوں کی تعریف و توصیف میں سرگرداں نظر آتا ہے اس زمانہ کا ہمارا ثقافتی سرمایہ فارسی زبان میں ہے۔ فارسی زبان کی دور جدید میں مالی نقطہ نظر سے کوئی افادیت نہیں اس لئے ہمارے نوجوان اس سے گریز کرتے ہیں ہم کو فارسی اور عربی کی تدریس پر توجہ خاص دینی چاہیئے کیونکہ اسی سے ہماری نسلیں اپنے ماضی کے کارناموں سے واقفیت حاصل کر سکتی ہیں۔
آج تاریخ کی جو کچھ بھی معلومات ہے وہ یا تو انگریزی مورخین کی وجہ سے ہے یا ہندوؤں کی وجہ سے لیکن یہ دونوں ہی تعصب سے بھرپور ہیں ان دونوں کی کوششیں ہمیشہ سے مسلمانوں کے خلاف رہی ہیں۔ مثال کے طور پر ہم سر جادو ناتھ سرکار کو پیش کرتے ہیں ان کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے اورنگ زیب پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن جب اس پر تبصرہ کرتے ہیں تو وہ اس کو آسمان سے تحت الثریٰ پہونچا دیتے ہیں یہی حال انگریز مورخین کا بھی ہے۔

جو لوگ ہندوستان میں مسلمانوں کی جبر ظلم و ستم کی کہانیاں گڑھتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں کہ دنیا اندھی نہیں ہے آج مسلمانوں کا اثاثہ جس صورت میں بھی موجود ہے وہ ان کی فراغ دلی، وسعت القلبی، تعلیم و تمدن سے دلچسپی فنون لطیفہ کی ماہرانہ صلاحیت شوق و ذوق کی زندہ تصاویر ہیں کون ہے جو ان حقیقتوں سے راہ فرار اختیار کر سکتا ہے اگر مسلمانوں نے

اپنے دورانِ حکومت تعلیم و تربیت پر توجہ نہیں دی تھی تو پھر یہ نادر نمونے کہاں سے آگئے۔ چنگیز خاں یا ہلاکو خاں جنہوں نے دنیا کو تباہ و برباد کیا انہوں نے اس قسم کی کوئی نشانی چھوڑی یہ ہیں وہ مسائل جن پر لوگوں کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے پاکستان کو وجود میں آئے ۴۰ سال ہو چکے ہیں ہمارا فرض ہے کہ ہم ان عائد کردہ الزامات کا جواب دیں جو ہندو اور انگریز ہمارے آباو اجداد پر لگا چکے ہیں اور لگا رہے ہیں لیکن افسوس تو یہ ہے کہ اس طرف کوئی بھی توجہ نہیں دیتا۔



باب ۹

انگریزی دور میں پاک و ہند میں تعلیمی ترقی

Education Under the British Rule in Indo-Pak (1750 To 1947)

ملکہ ایلزبتھ کے دورِ حکومت میں ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی گئی جس کا مقصد مشرقی ممالک سے تجارت کرنا تھا اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ حکومت تیزی سے زوال پذیر تھی رفتہ رفتہ کمپنی نے ہندوستان پر حکمرانی شروع کر دی جس کی داستان بہت طویل ہے۔

مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں ہندوستان میں مختلف قسم اور نوعیتوں کے لاتعداد ادارے تھے جن کا اندازہ ہم کو یورپین لوگوں کی مختلف رپورٹوں سے بآسانی ہو سکتا ہے ان میں سب سے پہلی رپورٹ آدم Adams کی ہے جو تین حصوں پر مشتمل ہے اس کی پہلی شق میں ان باتوں کا تذکرہ ہے جو دیگر اصحاب نے جمع کی تھیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنگال میں ایک لاکھ ابتدائی اسکول تھے اور بہار میں ایسا انتظام تھا کہ ۳۲ طلبہ کے لئے ایک اسکول موجود تھا اس رپورٹ کا دوسرا حصہ ۱۸۳۶ء میں شائع ہوا جس میں آبادی اور تعلیم کا وضاحت سے تذکرہ کیا گیا ہے اس میں اس نے خواندگی اور ناخواندگی کا باقاعدہ گوشوارہ پیش کیا ہے مدارس کو امرا مل جل کر چلاتے تھے بچوں کو پند نامہ گلستان، بوستان اور آمدنامہ کا درس دیا کرتے تھے ان کو خطاطی انشا پردازی وغیرہ کی بھی تربیت دی جاتی تھی۔ ان مدارس میں چھ گھنٹے یومیہ کام ہوتا تھا امیر لوگوں میں گھریلو تعلیم کا بندوبست تھا جس میں بچے کو پڑھنا لکھنا اور حساب بھی سمجھایا جاتا تھا عورتوں کی تعلیم پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی تھی اس کی رپورٹ کا تیسرا حصہ ۱۸۳۹ء میں شائع ہوا جس میں اس نے مختلف اضلاع کی آبادی اور اسکولوں کی تعداد بھی دی تھی۔ مرشد آباد کے

بارے میں رقم طراز ہے کہ وہاں پر ۱۱۳۳، اسکول ہیں اور وہاں کی آبادی ۱۸۶۰۸۴۱ ہے ۱۳۹۶ معلمین ہیں جن میں ۲۸ لڑکیاں ہیں۔

اس سلسلہ میں دوسرا شخص Max Muller میکس ملر ہے جس نے بنگال کی تعلیمی حالت کا نقشہ کھینچا ہے وارڈ Ward نے بھی ان دونوں کی رائے سے اتفاق کیا ہے وہ لکھتا ہے۔

"Almost All the Village Rossessed Schools For Teaching Reading, Writing And Elemenlary Arthematic."

اداروں کی اقسام: Types of Schools

مندرجہ ذیل قسم کے تھے۔

۱۔ تعلیمی ادارے: Schools of Learning اس قسم کے ادارے حکمراں امرا اور روسا نے قائم کر رکھے تھے ان میں قابل معلمین کا تقرر کیا جاتا تھا ان کا ذریعہ تعلیم عربی فارسی اور سنسکرت تھا خرچ وظائف اور جاگیروں سے چلتا تھا معلمین کو مقررہ مشاہیرہ نہیں ملتا تھا بلکہ وہ مفت تعلیم دیا کرتے تھے بچہ اس میں بارہ سال تعلیم حاصل کرتا تھا ان میں ہندو طلبہ بھی فارسی کی تعلیم حاصل کرتے تھے ویسے ان کے ادارے الگ تھے جن میں پنڈت تعلیم دیا کرتے تھے۔

۲۔ ابتدائی اسکول Elementary Schools

یہ خاص درس گاہیں تھیں جن میں 3Rs ہی نصاب تعلیم تھا یہ بہت سادہ ہوتے تھے جو ملکی ضروریات پورا کرنے کے لئے بچوں کو تیار کرتے تھے معلمین کی تنخواہیں معمولی ہوتی تھیں ان میں مخلوط تعلیم کا رواج تھا طلبہ کی تعداد معلمین کے مطابق ہوتی تھی۔ ذہین طلبہ دوسروں کو تعلیم بھی دیتے تھے۔ اگرچہ مقررہ فیس نہیں تھی پھر بھی سرپرستوں کو بطور نذرانہ معلمین کو کچھ دینا پڑتا تھا۔

آدم کی سفارشات Adam's Suggestions

انہوں نے کافی غور و خوض کے بعد مندرجہ ذیل سفارشات کی تھیں۔

۱۔ ایک یا دو ضلعوں کو بطور تجربہ منتخب کیا جائے (۲) ان کا سروے کر کے ضروریات

کا پتہ لگایا جائے (۳) طلبہ اور معلمین کے سے سب فراہم کی جائیں (۴) ممتحن کا تقرر کیا جائے اور امتحان لینے کے لئے ایک ادارہ قائم کیا جائے (۵) معلمین کی قابلیت کی جانچ کی جائے اگر وہ قابل نہ ہوں تو ان کو تربیت کے لئے نارمل اسکول بھیجا جائے (۶) جو معلم جس جگہ رہتا ہے وہی پر کام کرے (۷) معلمین کی ہمت افزائی کی جائے۔

تعلیم کی ماہیت اور خصوصیات : Nature & Character of Education.

اس دور میں تعلیم خاندانی اور پرانے اصولوں پر دی جاتی تھی۔

"Personal Disciplinship of the Pupil to the Teacher and Religion."

اصول پر مبنی تھی یہی وہ خوبی تھی جس نے انگلینڈ میں Monitorialsystem. کو جنم دیا ڈاکٹر بیل Dr. Bell نے اس تعلیم اور طرز تعلیم کو پسند کر کے انگلستان میں اس کو جاری کرنے کی کوشش کی نور اللہ اور نایک اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں۔

"This System Ultimately Secured the Rapid Expansion of Primary Education in England, it is Irony of Fate That the Indigeneous Schools of India Should Thus contribute To the Spread of Education-in England and Be of No Avail in Spreading Mass Education in India Herself."

کمپنی کے ابتدائی تجربات اور مشنریوں کے کام

Early Experiments in Education By The company & the Missionaries

ابتدائی دور میں کمپنی نے تعلیم کی طرف مطلق توجہ نہیں دی۔ ہندوستان میں عیسائی پادری مغلیہ دور سے ہی تبلیغ اور اشاعت کا کام کر رہے تھے۔ چنانچہ ان مشنریوں کی کوششوں سے ۱۷۸۰ء میں وارن ہسٹنگز کے زمانہ میں کلکتہ میں عربی اور فارسی کا مدرسہ قائم کیا گیا اور پھر

دوسرا ۱۷۹۱ء میں سنسکرت کا بنارس میں کیونکہ ان مشنریوں نے اندازہ لگایا کہ وہ مقامی لوگوں کی مدد سے اشاعت مذہب زیادہ آسانی سے کر سکتے ہیں کچھ عرصہ بعد کمپنی کو اپنے نقطہ نظر میں تبدیلی کرنی پڑی جس کے لاتعداد اسباب تھے ۱۷۹۳ء سے لیکر ۱۸۱۳ء تک کمپنی نے پادریوں کی اجازت منسوخ کر دی جس کی وجہ یورپ میں مذہبی تحریکات تھیں۔ ہندوستان میں یہ لوگ اس قابل نہیں تھے کہ کمپنی کے خلاف کچھ کر سکتے اس لئے انہوں نے انگلستان میں کمپنی کے رویہ کے خلاف احتجاج کیا ان لوگوں میں چارلس گرانٹ Charles Grant بہت مشہور ہیں۔

گرانٹ نے بڑی محنت سے ہندوستان کی تعلیم و تربیت پر تحقیقی مقالہ لکھا جس میں اس نے یہاں کی معاشرتی اور تعلیمی برائیوں کو اجاگر کیا اس من گھڑت کہانیوں سے انگلستان والوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس نے کہا کہ ہندوستان کی اصلاح کا واحد طریقہ انگریزی ذریعہ تعلیم اور مغربی علوم کی تدریس ہے اس نے کہا کہ صنعت و حرفت اور زراعت میں مشینوں کا استعمال کیا جائے۔ تعلیم اس قسم کی ہو جسکے ذریعہ ہندوستان میں روشن خیالی پیدا ہو سکے اور حکمراں اور رعایا کے درمیان بہتر تعلقات قائم ہو سکیں مذہبی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے لیکن تعلیم کو دور جدید کے مطابق ہندوستان تک پہونچانا کمپنی کا کام ہے۔

۱۸۱۳ء کا ایکٹ: (Charter of 1813)

Forms of Turning Point in the History of Education " کیوں کہ اس نے گرانٹ کی تحریک کو ختم کر کے کچھ بنیادی باتوں کو جاری رکھا مثلاً کمپنی کی ذمہ داری قرار دی گئی کہ وہ تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کرے جس کے لئے اس نے ایک لاکھ روپیہ منظور کیا۔ مشنریوں نے ہندو پاک میں لاتعداد انگریزی مشنری اسکول قائم کئے اس کی رو سے مشنریوں کو تبلیغ کی اجازت مل گئی علوم شرقیہ کو نوازا گیا ساتھ ہی ساتھ مغربی سائنس کی ترویج و ترقی کی بھی کوشش کی گئی اس چارٹر نے مستقبل کے لئے لائحہ عمل تیار کیا اسی وجہ سے اس کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

کمپنی اور تعلیم ۱۸۱۳ء سے ۱۸۵۳ء تک:

The company's Experiment in Education
(1813ء - 1853ء)

یہ دور بہت اہم ہے کیونکہ اس دور میں تعلیم کو مختلف مراحل سے گزرنا پڑا جس کی خاص خاص باتیں مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ یہ دور سیاسی کش مکش کا رہا اس لئے تعلیم پر قابل ذکر توجہ نہیں دی گئی۔ کمپنی کا روپیہ بھی لڑائیوں میں صرف ہو رہا تھا اس لئے رفتار بہت سست رہی۔

۲۔ تعلیمی مسائل کو کمپنی کے اعلیٰ افسران نے حل کرنے کی کوشش کی جن کو کوئی تجربہ نہیں تھا۔

۳۔ ہندو پاکستان کے نمائندوں کو اس میں شریک نہیں کیا گیا اور جو لوگ مثلاً راجہ رام موہن رائے اور ایشور چند ودھیا ساگر تھے ان کی سفارشات پر مطلق توجہ نہیں کی گئی۔

۴۔ یہ دور زیادہ تر اختلاف الرائے کا رہا۔ انگلستان میں بھی محکمہ تعلیم نہیں تھا جس سے مدد مل سکتی ان کے علاوہ ۱۸۱۳ء کے چارٹر نے بھی حصول مقاصد کے لئے خاص سفارشات نہیں کی تھیں اسی طرح چار مسائل پیدا ہوئے جو تصفیہ طلب تھے۔

۱۔ مقاصد تعلیم کیا ہوں Objective یہ پہلا مسئلہ تھا اس پر متعلقہ لوگ تین حصوں میں منقسم ہو گئے۔

ا۔ مغربی مضامین کی تعلیم اور انگریزی زبان ذریعہ تعلیم۔

ب۔ ہندوستان کے مضامین۔

ج۔ کمپنی کے لئے ملازمین تیار کئے جائیں۔

۲۔ عاملیت Agency ا۔ وہ کون سی ایجنسیاں ہوں جن کے ذریعہ مندرجہ بالا مقاصد کی تکمیل کی جائے اس پر بھی تین طبقے ہو گئے۔

ا۔ مشنری اسکول ب۔ ہندوستانیوں کے ادارے۔

ج۔ نئے معلمین کی زیر نگرانی نئے ادارے قائم کئے جائیں۔

۳۔ طریقہ تعلیم Methods اس میں بھی دو حصے ہو گئے۔

Downword FilteRation theory کے حامیوں نے کہا کمپنی نے روپیہ بہت ہی کم مخصوص کیا ہے اس لئے اونچے طبقے کے لوگوں کو تعلیم و تربیت بہم پہونچائی جائے جب

وہ لوگ تعلیم حاصل کر لیں تو پھر نیچے طبقے کو خود بخود تعلیم مل جائے گی اس سے حکومت کو ایک وفادار طبقہ مل جائے گا جو برسر اقتدار بھی ہوگا۔

۴۔ ذریعہ تعلیم Medium of Instructions اس ضمن میں بھی لوگ تین حصوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔

ا۔ مغربی تعلیم کو بذریعہ انگریزی پھیلانے کا خوگر تھا۔

ب۔ دیسی زبانوں کے ذریعہ تعلیم کو پھیلانا چاہتے تھے جس کے طرف دار منرو اور الفنسٹن تھے۔

ج۔ تیسرا گروہ فارسی عربی اور سنسکرت کا حامی تھا۔

مندرجہ بالا اختلافات کمپنی کے ملازمین میں موجود تھے جن میں ہندو پاکستانی کوئی بھی نہیں تھا اگر کمپنی کے ڈائریکٹر چاہتے تو اس مسئلہ کو بذریعہ قانون ختم کر سکتے تھے لیکن وہ خود بھی منقسیم تھے اور ایسے فارمولے کے متلاشی تھے جس سے ہر کس و ناکس کو مطمئن کر سکیں چنانچہ ابتدا میں انہوں نے ان کو تجربات پر پرکھنے کی کوشش کی یعنی اس بات کا متلاشی تھا کہ وہ کوئی حل تلاش کر سکے لیکن بمبئی کا بورڈ نجی اسکولوں کے خلاف تھا اسی طرح سے بنگال انگریزی زبان کی موافقت میں تھا جبکہ بمبئی مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے کوشاں تھا اس طرح یہ متضاد خیالات ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے جس کے لئے تجربات کی ضرورت تھی۔

زبان شرقیہ اور غربیہ کا جھگڑا Dispute of The Orientalists And The Anglicists.

شرقیہ زبان کے حامیوں کا کہنا تھا کہ کمپنی نے ایک لاکھ روپیہ اسی زبان کے علوم کی درس و تدریس کے لئے منظور کیا ہے چنانچہ جب اس مسئلہ نے کشیدگی اختیار کی تو اسکے فیصلے کے لئے ایک بورڈ مقرر کیا گیا اس بورڈ کے ممبر دو حصوں میں منقسم ہو گئے ایک گروہ علوم شرقیہ کا طرفدار تھا جس کا لیڈر Prinsep تھا۔ دوسرے گروہ میں راجہ رام موہن رائے جیسے شخص تھے جنہوں نے کہا کہ سنسکرت اور عربی کے بجائے لبرل تعلیم پر توجہ دی جائے اور ذریعہ تعلیم انگریزی ہونا چاہیئے میکالے جو کمیٹی کا صدر تھا وہ دوسرے خیال کا حامی تھا چنانچہ اس نے ۱۸۱۳ء کے چارٹر کی شق ۴۳ پر ایک واضح مقالہ لکھکر

لارڈ ولیم بینگ کے سامنے پیش کیا اس سلسلہ میں اسکے اپنے الفاظ ملاحظہ فرمایئے۔

"A single Shelf of Good European liberary was worth The whole Native Literature of india And Arabia"

ساتھ ہی ساتھ اس نے یہ بھی لکھا۔

iT was The Duty of England To Teach The indians what was Good for Thier Health and Not what was Palatable To Their Taste."

اس طرح اس کے منشور سے مندرجہ ذیل باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

۱۔ ہندوپاک کی ذہنی ترقی صرف انگریزی ذریعہ تعلیم کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔
۲۔ سائنس سے مطلب چارٹر میں مغربی سائنس ہے۔
۳۔ ملک میں لاتعداد مادری زبانیں ہیں صرف ایک ہے یعنی انگریزی۔
۴۔ انگریزی علوم شرقیہ یعنی سنسکرت اور عربی سے آسان ہے۔
۵۔ ہندوستانی خود انگریزی زبان کے دلدادہ ہیں راجہ رام موہن رائے مشرقی زبانوں کو بیکار سمجھتے ہیں۔

میکالے نے انشا پردازی کا پورا زور اپنے منشور میں صرف کر دیا تھا چنانچہ ۱۸۳۵ء میں لارڈ ولیم بنٹگ نے اس کو منظور کر لیا۔

اس اختلاف زبان کو ہندوپاک کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے کاش کہ اس وقت اس سلسلہ میں ٹھنڈے دل سے غور وخوص کر کے فیصلہ کیا جاتا۔ بقول میکالے

If you wa To Distroy A Nation, Distroy its language And culture,"

ہندو مسلمانوں سے کبھی بھی خوش نہیں رہے وہ مسلمانوں کے ادب، زبان تہذیب وتمدن کے دشمن تھے انہوں نے اس طرح انگریزوں کی طرفداری کر کے مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ کسی قوم یا ملک نے کبھی بھی کسی دوسری قوم کی زبان میں ترقی نہیں کی جو حال آج ہمارا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ایک طالب علم اپنی زندگی

کا سب سے اہم دور تعلیم حاصل کرنے میں گزار دیتا ہے لیکن بدلے میں دوسروں کے خیالات اور دوسروں کی زبان کے علاوہ کچھ بھی نہیں ملتا وہ بالکل اسی طرح ہے جیسے اس نے کسی دوسرے کے کپڑے زیب تن کر رکھے ہیں۔ آج ایم اے پاس طلبہ کا حال یہ ہے کہ نہ وہ انگریزی لکھ سکتے ہیں اور نہ مادری زبان پر عبور حاصل ہے وہ اپنے وقت کا زیادہ حصہ زبانِ غیر سیکھنے میں گزارتا ہے لیکن پھر بھی اس کو کچھ نہیں ملتا۔ پاکستان کو وجود میں آئے ہوئے ۴۰ سال ہوئے لیکن دماغی اور ذہنی طور سے آج بھی ہم غلام ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ وہ لوگ جو اپنے کو ماہر تعلیم کے نام سے پکارتے ہیں باتیں تو بہت کرتے ہیں لیکن عملاً کچھ بھی کرنے سے قاصر ہیں کیوں؟ یہ سوال شاید کبھی حل نہ ہو سکے۔

لارڈ آک لینڈ نے اس میں ترمیمیں کیں اس نے علوم شرقیہ کی ضمانت دی کتابیں شائع کرائیں مغربی اور مشرقی علوم کے لئے علیحٰدہ علیحٰدہ روپیہ مخصوص کیا۔ اور دونوں پارٹیوں کو اس طرح مطمئن کر دیا تفصیل کو ہم نظر انداز کر رہے ہیں۔

عوام اور مسائل: Problems of Mass Education

Downward Filtration Theory کے بغور مطالعہ سے مندرجہ ذیل اہم باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

۱۔ کمپنی انگلستان کی طرح ہندو پاک میں بھی اپنے وفاداروں کا ایک طبقہ بذریعہ تعلیم و تربیت پیدا کرنا چاہتی تھی اس کے مطابق راجہ مہاراجہ امرار روسار اور نوابین کے بچوں کو تعلیم و تربیت دینا تھا لیکن کمپنی کو اس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔

۲۔ اگر امرار اور روسا تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو اس سے ادنیٰ طبقوں کو بھی فائدہ پہونچے گا لیکن بوجہ ذات پات کی تفریق اس میں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔

۳۔ کمپنی چند افراد کو تعلیم دے کر ان میں جذبہ وفاداری پیدا کر کے عوام میں اس جذبہ کو قبول عام کرائے اس کی ناکامی کے مندرجہ ذیل اسباب تھے۔

ا۔ وہ لوگ جو کمپنی کے ملازم ہوں گے وہ دوسروں کو کس طرح پڑھا سکیں گے۔

ب۔ وہ خود ایک طبقہ میں تبدیل ہو گئے جن کو عوام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

لیکن پھر بھی اس پالیسی سے کچھ فوائد ہوئے چنانچہ ان لوگوں نے ادارے قائم کرنے شروع کر دیئے اس طرح نجی طور سے تعلیم میں اضافہ ہونا شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ تعلیم یافتہ

لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتے لگا اور پھر ان کو کمپنی میں ملازمت بھی نہیں ملتی تھی چنانچہ ان کو معلم بننا پڑا۔ کچھ لوگوں نے تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا۔ اس طرح دورِ جدید کی بنیاد پڑی۔

عوام الناس کی تعلیم کے سلسلہ میں الفنسٹن کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے یہ بمبئی کا گورنر تھا اس کو اصلاحات کا شوق تھا چنانچہ اس نے نجی اداروں میں بھی اس کی کوشش کی مثلاً ان کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ ان کو عمدہ اور نفیس کتابوں سے مزین کیا جائے عوام میں یہ جذبہ پیدا کیا جائے کہ وہ ان سے خاطر خواہ فائدہ حاصل کر سکیں تعلیم میں مشرقی اور مغربی علوم کو اس طرح شریک کیا جائے کہ دونوں کی انفرادیت ختم ہو جائے۔ کتابوں کو مقامی اور مادری زبان میں شائع کیا جائے سائنس اور انگریزی کی تدریس کے لئے علیحدہ علیحدہ اسکول قائم کئے جائیں اس سلسلہ میں وہ یوں رقم طراز ہے۔

"It is By Means of it (Education) Alone That They can Acquire Those Habits of Prudence and Self Respect From which all other Good Qualities Spring and if There was a country where Such Habits are Required, it is This."

الفنسٹن کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے عوام کی تعلیم کے لئے مادری زبان کی پر زور سفارش کی ہے اس نے کہا کہ مقامی اور نجی اسکولوں میں اصلاحات کر کے عوام کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا جائے البتہ انگریزی کو بھی ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جا سکتا ہے۔

الفنسٹن کا سب سے بڑا حریف وارڈن warden تھا جس نے اس کی زبردست مخالفت کی یہ شخص Downward Filteration Theory کا حامی تھا چنانچہ یہ ہوا کہ الفنسٹن اپنی ناکامی سے مجبور ہو کر ۱۸۲۷ء میں انگلستان واپس چلا گیا۔

المختصر تین اشخاص جو نجی اور ملکی اداروں کے طرف دار ہونے کے ساتھ ہی

ساتھ علوم شرقیہ کی ترقی و ترویج کے حق میں تھے ان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ۔ یہ منرو۔ الفنسٹن اور آدم تھے ۔

ان تینوں کے برعکس Thompson جو شمالی مغربی سرحدی صوبہ کا لفٹنٹ گورنر تھا عوام کی تعلیم کا حامی تھا لیکن اس کو ناکامی نہیں ہوئی اس نے ۱۸۴۵ء میں اپنے ماتحت افسران کو حکم بھیجا کہ نجی اور قدیم اداروں کی ہمت افزائی کی جائے ان میں ضروری اصلاحات کر کے وقتی تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں کی جائیں اس کو لارڈ ڈلہوزی کی بھی لیشت پناہی حاصل تھی اس لئے اس کو کامیابی حاصل ہوئی اس کا دوسرا کارنامہ پرائمری تعلیم کے لئے ٹیکس عائد کرنا تھا۔ انگلینڈ میں تعلیمی ٹیکس ۱۹۷۰ء میں لگایا گیا جب کہ یہاں پر وہ ۱۸۵۱ء میں لگانا چاہتا تھا اس نے اس کی اجازت ڈائریکٹروں سے بھی لے لی تھی ۔ اس طرح وہ ہندو پاک میں پہلا افسر تھا جس نے مقامی ٹیکس لگا کر Hulka bandi کے نظریہ کو قائم کیا جس کے مطابق اسکولوں کو حلقوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا ۔ اسکول ان حلقوں کے بیچ میں قائم کئے جاتے تھے تاکہ ہر حلقہ کے بچے تعلیم حاصل کر سکیں ۔ تھامس ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے محکمہ تعلیمات کو قائم کیا اس نے اسکولوں کے معائنہ کا بھی قاعدہ جاری کیا ۔ تاریخ میں پہلی بار ضلع تحصیل اور پرگنہ کے افسران کا تقرر ہوا اس کو اگر ہم موجودہ زمانہ کے محکمہ تعلیم کا موجد کہیں تو بے جا نہ ہوگا ۔

Raja Ram Mohan Roy   راجہ رام موہن رائے :

(1772 - 1833) ہندو پاک کی تعلیم میں موہن رائے خاص اہمیت کے حامل ہیں پیدائش رادھا نگر میں ہوئی تھی جلدی ہی فارسی عربی اور سنسکرت میں ماہرانہ قابلیت حاصل کر لی اپنے نظریات و خیالات کی وجہ سے ان کی ان کے والد ماجد سے نہیں بنتی تھی چنانچہ ان خیالات نے ان کو سیر و سیاحت پر مجبور کیا تاکہ وہ مذہبی اور سماجی حالات کو دیکھ کر ان کی اصلاحات کر سکیں انہوں نے عبرانی یونانی اور انگریزی زبانوں پر بھی دسترس حاصل کر کے ان کے ادب کا مطالعہ کیا والد کے وفات کے بعد کمپنی میں ملازمت کر لی جہاں پر دیوان کے عہدے تک ترقی کی کچھ عرصہ بعد ملازمت چھوڑ کر معاشرے کی اصلاح پر کمر باندھی ۔ رام موہن رائے مصلح قوم قومی ہیرو اور مختلف حیثیتوں سے مشہور و

معروف ہیں لیکن ہم صرف ان کے تعلیمی نظریات کا وہ بھی مختصراً تذکرہ کر رہے ہیں انہوں نے اس بات کا اندازہ لگالیا کہ قوم مغربی اور مشرقی علوم حاصل کرکے ہی ترقی کر سکتی ہے انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ مغربی معاشرے کو سمجھ کر ہی مشرقی معاشرے میں اصلاحات ممکن ہیں اگرچہ چارلس گرانٹ نے ان سے پیشتر انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے کی اور اس کی ترقی و ترویج کی کوشش کی تھی لیکن اس ضمن میں راجہ صاحب کو کامیابی زیادہ ہوئی جس کی وجوہات حسب ذیل ہیں۔

۱. وہ ہندوستانی لیڈر تھے۔
۲. انہوں نے انگریزوں کو علوم شرقیہ کی اہمیت سے آگاہ کیا یہ ان کی ہی وجہ تھی کہ ۱۸۵۴ء میں ان علوم کو مناسب جگہ دی گئی۔
۳. انہوں نے اپنے کردار و سیرت سے اس خیال کی تردید کی کہ مغربی علوم سے انسان عیسائی بنتا بلکہ اس میں دیگر خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔
۴. انہوں نے ہندو مذہب کی ترجمانی کی۔
۵. ہندوستان کی جدید زبانوں کی ترویج و ترقی کی کوشش کی۔ بنگالی قواعد اور علم فلکیات پر کتب تصنیف کیں جغرافیہ اور جامیٹری پر بھی لکھا وہ جدید بنگالی نثر کے موجد کہلاتے ہیں۔
۶. تعلیم نسواں پر بہت زور دیا۔
۷. ۱۸۳۰ء میں انگلینڈ گئے اور انگریزوں کو مجبور کیا کہ وہ ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدے بھی دیا کریں۔
۸. قوانین کی از سر نو تشکیل کے لئے انگریزوں کو مجبور کیا۔
۹. ۱۸۳۳ء کے مراسلہ کی شق نمبر ۸۷ انہیں کی کوششوں کی وجہ سے نافذ کی گئی جس میں ہندوستانیوں کو بغیر کسی تفریق کے ان کی اہلیت کے مطابق مقام دینے کی ضمانت دی گئی تھی۔
۱۰. انہوں نے ہندو مذہب میں بہت سی اصلاحات کیں مثلاً آدیہ سماج ستی رواج کا خاتمہ وغیرہ

ان کارناموں کی وجہ سے وہ ہمیشہ زندہ و جاوید رہیں گے لیکن افسوس یہ ہے کہ ان

کی تمام کوششوں کو عملی جامہ نہیں پہنایا گیا۔

Wood's Despatch 1854 ۱۸۵۴ء کا مراسلہ

تا ۱۸۱۳ء سے کمپنی تعلیم پر مسلسل تجربات کر رہی تھی اس دور میں اس کو کافی مسائل پیش آئے۔ جن کے حل کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ چنانچہ گورنمنٹ انگلستان نے ۱۸۵۲ء میں کمپنی کے چارٹر کی تجدید کے وقت بورڈ آف کنٹرول کے صدر سر چارلس وڈ کو ہندوستان کے متعلق سفارشات پیش کرنے کو کہا وڈ کی یہ تجاویز ۱۸۵۴ء کا مراسلہ یا وڈ کے مراسلہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے یہ مراسلہ ہندوستان کی تعلیم میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی لئے اس کو Magna charta کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے یہ بہت طویل ہے کیونکہ اس نے ہندوستان کے تمام مسائل سے تفصیلاً بحث کی ہے لیکن ہم صرف خاص خاص باتوں پر ہی اکتفا کر رہے ہیں۔

مقاصد Objectives : اس مراسلہ میں تعلیم کی اہمیت و افادیت پر مکمل طور سے بحث کی گئی ہے اس کے مطابق تعلیم کا مقصد محض ذہنی نشوونما ہی نہیں ہے بلکہ افراد کے اخلاق و تعمیر و تشکیل بھی ہے تاکہ وہ ان مناصب کی ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی انجام دے سکے جو اس کے سپرد کی جائیں تعلیمی میدان میں کوششیں نہ صرف انگلستان کے لئے فائدہ مند ہوں گی بلکہ ہندوستانیوں کی علمی ترقی سے لاتعداد فوائد ہوں گے مثلاً ہندوستانی سرمایہ اور مزدوروں کو کام میں لاکر ملک کے مادی ذخیروں سے فائدہ اٹھائیں گے تجارت اور دولت کی فراوانی سے خاطر خواہ فیضیاب ہوں گے صنعت اور زراعت میں خام اشیاء سے مصنوعات تیار کریں گے جس سے زیادہ فائدہ انگلستان کو ہوگا۔

Oriental Learning مشرقی علوم

اس مراسلہ نے علوم شرقیہ کی اہمیت اور افادیت کو سراہا تاریخی اور آثار قدیمہ کے لئے مشرقی زبانوں کا جاننا ضروری قرار دیا مغرب اور مشرق میں اشتراک اور اچھے تعلقات کے لئے ایک دوسرے کو سمجھنے کا آسان طریقہ ایک دوسرے کے ادب اور ورثہ کو سمجھنا ہے۔ ہندو اور مسلم مذہبی باتوں کو سمجھنا اور ان کے مطابق بنے قوانین کی تعمیر و تشکیل کو ضروری قرار دیا بلکہ زیادہ توجہ مغربی فلسفہ تعلیم کو دی جس سے مشرقی کی زبانوں کا خود بخود انحطاط شروع ہوگیا۔

ذریعہ تعلیم Medium of Instructions

اس مراسلہ نے زبان کے اختلاف پر بھی روشنی ڈالی اور مشرقی علوم کے مطالعہ کو سراہا لیکن میکالے کے خیال کو اپنانے کی کوشش کی انہوں نے کہا کہ انگریزی زبان اس لئے بھی ضروری ہے کہ (۱) ورناکیولر زبانیں نامکمل ہیں (۲) ہندوستان میں کوئی زبان ایسی نہیں جو پورے ہندوستان میں سمجھی اور بولی جاسکے (۳) انگریزی ہی ایسی زبان ہے جو پورے برصغیر میں اپنائی جاسکتی ہے (۴) انگریزی زبان کی ترویج کا مقصد قومی زبانوں کو نقصان پہونچانا نہیں ہے۔ اس کے مطابق انگریزی اور مشرقی زبانیں ذریعہ تعلیم ہوں گی لیکن پروفیسران اور معلمین کے لئے دونوں زبانوں میں مہارت حاصل کرنا ضروری ہے انگریزی ادب کا مقامی زبانوں میں ترجمہ کیا جائے اور مقامی زبانوں کو انگریزی میں منتقل کرنا ضروری ہے۔

دیگر سفارشات Other Suggestions

اس مراسلہ نے کچھ نئی چیزوں کی بھی سفارش کی جن میں سے خاص خاص یہ ہیں۔

۱۔ ہر صوبہ میں محکمہ تعلیم کو قائم کیا جائے جس کے افسر اعلیٰ کو Director of Public Instructions کے نام سے پکارا جائے گا اس کی مدد کے لئے انسپکٹر اور دیگر عملہ ہوگا یہ ہر سال اپنی کارکردگی کی رپورٹ گورنر کو پیش کیا کرے گا۔

۲۔ کلکتہ اور بمبئی میں لندن یونیورسٹی کے اصولوں پر یونیورسٹیاں قائم کی جائیں جن کا کام امتحان کی نگرانی اور ڈگری دینا ہوگا ان کے انتظام کے لئے سینٹ ہوگی چانسلر اور وائس چانسلر گورنمنٹ کے نامزد کردہ ہوں گے اگر ضرورت ہو تو اس قسم کی یونیورسٹیاں دیگر صوبوں میں بھی قائم کی جائیں۔

مدارس Schools: مراسلے نے ضرورت کے مطابق تعلیمی اداروں کے جال پھیلانے کی پر زور سفارش کی۔ ان اداروں میں بالتو ذریعہ تعلیم انگریزی یا مقامی زبان ہوگی۔ یہ اسکول مختلف اقسام کے ہوں گے سب سے ادنیٰ عنم نچی اداروں کی ہوگی اس مراسلہ نے Downward Filteration Theory کی مخالفت کی بلکہ اس پر زور دیا کہ تعلیم کو عوام میں مقبول کیا جائے اس مقصد کے لئے ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ ثانوی اداروں کی تعداد بڑھائی جائے قابل مستحق اور نادار طلبہ کو وظائف اور دیگر سہولتیں بہم پہونچائی

جائیں۔ Grant in Aid اس پر مراسلہ نے پوری توجہ سے عمل درآمد کرنے کی سفارش کی تاکہ عوامی مسائل تعلیم جلد از جلد حل ہو سکیں ان اداروں کی بھی امداد دی جائے۔ جہاں

۱۔ دینی تعلیم کا معقول انتظام ہو۔
۲۔ انتظام اچھا ہو۔
۳۔ سرکاری اصولوں کی پابندی کریں انسپکٹروں کو معائنہ کرنے کا موقع دیں۔
۴۔ طلبہ سے فیس لیں۔
۵۔ سیکولر تعلیم کا بھی بندوبست ہو۔

ایسے اسکولوں کو بھی امداد دی جائے جن کی مالی حالت تسلی بخش ہو تاکہ وہ اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافہ، وظائف اور عمارتوں کی تعمیر پر خاطر خواہ روپیہ خرچ کر سکیں اس قسم کی امداد کالجوں ثانوی مدرسوں اور ابتدائی اداروں سب کو ملے گی تاکہ ہندوستانی تعلیم میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے سکیں۔

معلمین کی تربیت: Training of Teachers

تعلیم کی ترقی اور کامیابی کے لئے تربیت یافتہ اساتذہ ضروری ہیں جن کی بہت کمی ہے ان کی تربیت کے لئے مناسب اداروں کو قائم کیا جائے تاکہ تربیت یافتہ اساتذہ تعلیم کو بہتر اور مناسب طریقہ سے بہم پہونچائیں اس پیشہ کو مقبول عام بنانے کے لئے اساتذہ کی ہمت افزائی کی جائے۔ ان کی تنخواہوں میں اضافہ کیا جائے۔

سرکاری آسامیوں پر تقرر: Employment in Government Service

سرکاری ملازمتیں ایسے لوگوں کو دی جائیں جو تعلیم یافتہ ہوں ادنیٰ ملازمتوں پر بھی خواندہ لوگوں کو ترجیح دی جائے تعلیم میں لبرل نظریہ کو اہمیت دینی چاہیئے۔

تعلیم نسواں Education of women

ملک کی ترقی و تنزلی کا دارو مدار تعلیم نسواں پر ہوتا ہے مراسلہ نے کہا کہ ہندوستان میں تعلیم نسواں کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا ہے اس طرف حکومت کو خاص طور سے توجہ دینی چاہیئے عورتوں کو امور خانہ داری کے ساتھ ہی ساتھ فنی اور پیشہ وارانہ تعلیم بھی دی جائے۔

مراسلہ میں تعلیم کے دیگر پہلوؤں پر بھی توجہ دلائی گئی مثلاً دیسی زبانوں میں بہتر نصاب کی کتابیں پیشہ وارانہ تعلیم صنعتی اسکول اور کالج وغیرہ وغیرہ۔ تاریخ تعلیم Importance اس مراسلہ کو جیسا کہ پیشتر لکھا جا چکا ہے۔ میں بہت اہمیت حاصل ہے کیوں کہ اس نے تعلیم کے ہر پہلو پہ ناقدانہ حیثیت سے بحث کی ہے محکمہ تعلیم کی بنیاد ثانوی اور ابتدائی تعلیم پر توجہ علوم شرقیہ کی تعلیم ذریعہ تعلیم مادری زبان وغیرہ۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کی سفارشات پر عمل نہیں کیا گیا کیوں کہ کمپنی اور حکومت نے صرف ان چیزوں پر عمل کیا جو اسکے فائدے کی تھیں مثلاً انگریزی کو ذریعہ تعلیم قرار دیا کلکتہ یونیورسٹی نے تمام پرچوں کو انگریزی زبان میں حل کرنے کا حکم دیا علوم شرقیہ کو غلطیوں سے پھر پور خیال کیا گیا اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ یہ میگنا کارٹا ہے۔

"IT was That to be a Synthesis of The Best Things That Both The East & The west. Had to offer."



باب ۱۰

ہندو پاک میں ثانوی تعلیم ۱۸۵۴ء کے بعد

Secondary Education in Indo-Pak Since 1854

۱۸۵۴ء سے ۱۹۰۲ء تک ثانوی تعلیم ان ہی خامیوں اور خصوصیات کی حامل رہی جو کالج کی تعلیم میں تھیں ان میں سے چند کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

۱. ۱۸۵۴ء کے مراسلہ سے ثانوی تعلیم کی ترقی و ترویج کا دور شروع ہوا جس کی خاص وجہ محکمہ تعلیمات کی تشکیل و تعمیر تھی۔ اور پھر اسی دور میں انگریزی پر بھی کافی توجہ دی گئی چنانچہ ۱۸۵۴ء سے لیکر ۱۸۷۰ء تک گورنمنٹ کے تحت لاتعداد ثانوی مدارس قائم کئے گئے لیکن آخری ایام میں سرکار کی پالیسی میں تبدیلی واقع ہوئی اور اب اس نے ثانوی تعلیم کی بجائے زیادہ توجہ ابتدائی تعلیم پر دینی شروع کر دی۔

۲. مراسلہ نے امداد کے طریقہ پر بہت زور دیا تھا جس کے لئے نئے نئے اصول و ضوابط کو تشکیل کیا گیا۔ سرکار نے بجٹ میں نجی اداروں کی امداد کے لئے بھی کثیر رقم مخصوص کر دی اس لئے اب عوام نے اس طرف خاص توجہ دی۔ چنانچہ نجی ادارے تیزی سے کھلنے لگے سرکار نے اس بات سے متاثر ہو کر اپنی پالیسی میں نرمی کر دی اس دور کی ایک خوبی یہ ہے کہ مشنری اسکولوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ان کی ضد پر ہندو پاکستانی بھی میدان میں آگئے۔ اس طرح ۱۸۶۲ء تک زیادہ تعداد نجی اداروں کی ہوئی جن کا انتظام ہندو پاکستانی کے ہاتھ میں تھا لیکن چونکہ یہ اسکول مشنری اسکولوں کے مقابلے پر کھولے گئے تھے اس لئے ان میں بھی علوم غربیہ پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ ذریعہ تعلیم بھی انگریزی رہی تھا۔

تعلیمی یا ہنٹر کمیشن ۱۸۸۲ء Education or Hunter Commission 1882

۱۸۸۲ء کے مراسلہ میں ابتدائی تعلیم کی اہمیت اور ترقی پر زور دیا گیا تھا۔ ۱۸۵۴ء

کے مراسلہ میں ابتدائی تعلیم کی رفتار سست اور نا قابل اطمینان تھی چنانچہ مرکزی حکومت نے حالات کو بہتر بنانے کے لئے ۱۸۸۲ء میں ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا تاکہ وہ ابتدائی تعلیم کی ترقی کے لئے مناسب تجاویز پیش کرے چنانچہ مندرجہ ذیل سفارشات ثانوی تعلیم پر پیش کی گئیں۔

۱۔ ایسے طریقوں اور ذرائع کا پتہ لگایا جائے جس سے ثانوی تعلیم زیادہ سے زیادہ ترقی کر سکے۔

۲۔ کمیشن نے کہا کہ دیسی اسکولوں کو مالی امداد دی جائے حکومت ان کو منظور کرے اور مقامی بورڈوں کو ہدایت دے کہ وہ دیسی اسکولوں کو پوری آزادی دیں تاکہ وہ ترقی کر سکیں ان اسکولوں کو ہدایت کی جائے کہ وہ ہر ذات کے بچوں کو داخل کریں مالی امداد امتحان کے نتائج کے مطابق دی جائے کیونکہ یہی طریقہ انگلستان میں بھی رائج تھا لیکن جلد ہی ان کے نقطہ نظر میں تبدیلی آگئی پرائیویٹ اور سرکاری اسکولوں کے سلسلہ میں ایک طبقہ نے کہا کہ نجی اداروں کی تعداد بڑھائی جائے کیونکہ۔

۱۔ عوام کی ضروریات آسانی سے پوری کرتے ہیں (۲) سرکار کا خرچ کم ہوتا ہے (۳) تعلیم کو پرائیویٹ لوگوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر اس کی ترقی و ترویج کے لئے مناسب کام کریں۔

لیکن جہاں تک ابتدائی یا پرائمری تعلیم کا سوال ہے تو اس میں سرکار کو مکمل طور سے دلچسپی نہیں لینی چاہیئے ہر اس جگہ اسکول کھولے جائیں جہاں ضرورت ہو ان سفارشات سے مندرجہ ذیل مسائل پیدا ہوئے۔

۱۔ ان ثانوی اداروں کا کیا ہوگا جو سرکاری تحویل میں ہیں؟ (۲) ان مقامات پر ثانوی ادارے کون قائم کرے گا جہاں پر عوام ایسا کرنے سے قاصر ہیں۔ جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے تو کمیشن نے کہا کہ آہستہ آہستہ سرکاری اسکول نجی ایجنسیوں کو منتقل کر دیئے جائیں۔

دوسرے سوال کے مطابق ایسے مقامات پر سرکار خاص حالات کے تحت ثانوی اسکول قائم کرے لیکن کمیشن نے اسباب کو لازمی قرار دیا کہ ہر ضلع میں ایک سرکاری

اسکول ضرور ہو جو بحیثیت ماڈل اسکول کا کام انجام دے اور باقی اداروں کو نجی تحویل میں رہنے دیا جائے۔

اس کمیشن کی سفارشات صوبائی حکومتوں نے مان لیں اور اس طرح بیس سال کے عرصہ میں یعنی ۱۸۸۲ء سے ۱۹۰۲ء میں ۲۹۱۶ اداروں سے ۵۱۲۴ تعداد ہو گئی طلبہ کی تعداد میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا چنانچہ ۲۱۴۰۷۷ سے تجاوز کر کے ۵۹۰۱۲۹ ہو گئی۔

تمام صوبوں نے اس پر یکساں توجہ نہیں دی بمبئی اور مدارس میں تو پرائمری اسکول کے طلبہ کو ثانوی مدارس میں پہونچا دیا گیا۔ بہرحال ان سفارشات سے کافی فوائد ہوئے۔

ثانوی تعلیم میں خامیاں: Defects of The Secondary Education 1854-1902

خاص خاص درج ذیل ہیں۔

۱. مادری زبان کو ذریعہ تعلیم نہیں بنایا گیا۔ Neglect of Mother Tongue as Medium of Instruction.

اگرچہ ۱۸۵۴ء کے مراسلے نے مادری زبان پر کافی توجہ دی تھی۔ اور سفارش کی تھی کہ ذریعہ تعلیم اسی میں ہونا چاہیئے لیکن انتظامیہ نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ بجائے اس کے اینگلو ورناکیولر اور ورناکیولر اداروں کی تفریق کو ختم کیا جاتا۔ اس کو اور ہوا دی گئی انگریزی زبان کو ہر حال میں فوقیت دی گئی۔

انگریزی زبان میں تدریس بہت جلد شروع کر دی جاتی تھی وقت کم تھا۔ اس لئے بچہ اس پر عبور حاصل کرنے سے قاصر تھا اس کی حیثیت طوطے کی سی تھی۔ ثانوی تعلیم میں انگریزی کو ذریعہ تعلیم تسلیم کیا گیا چنانچہ پنجاب کو چھوڑ کر ہر جگہ مادری زبان بہت ہی کسمپرسی کے عالم میں رہی۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۸۲ء سے بجائے مغربی علوم کی ترویج کے انگریزی زبان کے سیکھنے پر توجہ دی گئی۔ اس طرح ۱۸۵۴ء کے مراسلہ کے نظریہ اشتراک ختم ہو گیا۔ المختصر ۱۹۰۲ء تک مادری زبان پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔

۲. معلمین کی تربیت Training of Techers

۱۸۵۴ء کے مراسلہ نے معلمین کی تربیت پر بھی خاص توجہ دی تھی لیکن صرف دو ہی ادارے کھولے گئے جو اتنے بڑے ملک کے لئے ناکافی تھے ان میں ایک مدراس میں ۱۸۵۶ء میں اور دوسرا ۱۸۸۰ء میں لاہور میں۔ ان کے ساتھ کوئی بھی مشقی اسکول نہیں تھا اور تمام طلبہ کو ایک درجہ اور ایک ہی معیار کا سمجھا جاتا تھا کچھ عرصہ بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ ثانوی مدارس کے معلمین کے لئے تربیت کی ضرورت ہے یا نہیں اس سلسلہ میں کمیشن نے کہا۔

۱۔ سرکاری و نجی اداروں میں تقرر کے لئے معلمین کو اصول تعلیم اور اصول تدریس میں کامیابی حاصل کرنا ضروری ہے۔

۲. گریجویٹ طلبہ کو بالنسبت دیگر طلبہ کے تربیت کے لئے کم وقت دیا جائے

اس بیس سال میں اساتذہ کی تربیت بہت ہی محدود رہی اگرچہ اب چھ ٹریننگ کالجز کھل چکے تھے لیکن وہ بھی اتنے وسیع ملک کے لئے ناکافی تھے پھر اساتذہ کی تعداد بھی زیادہ تھی۔

فنی اور پیشہ ورانہ مضامین کی کمی Want of Vocational Courses: ۱۸۵۴ء کے مراسلہ نے اس طرف بھی خاطر خواہ توجہ دی تھی لیکن بمبئی کو چھوڑ کر اس سلسلہ میں کہیں پر بھی کچھ نہیں ہوا چنانچہ ثانوی تعلیم کا مقصد صرف یونیورسٹیوں میں داخلہ ہی رہا جس کے مندرجہ ذیل نتائج ہوئے۔

۱. عموماً طلبہ اونچے طبقے سے تعلق رکھتے تھے وہ پیشہ ورانہ تعلیم یا زندگی کے دیگر شعبوں سے لاپرواہ تھے۔

۲۔ یونیورسٹی تعلیم کا مقصد سماج میں رتبہ اور پیسہ کمانا تھا۔

۳. سرکاری اسکول اگرچہ ماڈل تھے لیکن ان میں بھی فنی یا پیشہ وارانہ تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔

۴۔ نیئے اسکول اس قابل نہیں تھے کہ وہ ان شعبوں کو قائم کرسکیں کیوں کہ ان کے پاس روپیہ نہیں تھا۔

کمیشن نے اس بات کی بھی سفارش کی کہ ثانوی تعلیم کے بعد پیشہ ورانہ تعلیم کا

انتظام ہو اس طرح نصاب کو دو حصوں میں منقسیم کر دیا گیا۔

۱. لبرل تعلیم   Liberal Education.

۲. عملی تعلیم   Practical Education.

ان سفارشات کو تھوڑے بہت ردو بدل کے بعد صوبوں نے تسلیم کر لیا اس طرح اس میں "Strange Mixture of Good An Evil" موجود رہا۔

نئی تعلیم کے نتائج : Results of New Education

اس دور کی ثانوی تعلیم کے دوررس نتائج نکلے عوام کو مغربی تہذیب و ثقافت کے ساتھ ہی ساتھ سائنس کی ترقیوں اور انگریزی زبان کی ترویج نے دورِ جدید کی نشاۃ ثانیہ کے لئے میدان ہموار کیا۔

اس دور میں ایک نئے ادب کو پھولنے پھیلنے کے مواقع ملے مشنریوں کی کوششیں چھاپہ خانے کی ایجاد قواعد اور لغت کی تیاریاں انجیل مقدس کا ترجمہ ہندو پاکستانی ثقافت کا انگریزوں سے خلط ملط وغیرہ آگے چل کر محکمہ تعلیم نے اس سلسلہ میں کافی خدمات انجام دیں اس نے کتابوں کو چھپوایا نصابی کتب کی اشاعت کی جس سے گورنمنٹ بکڈپو وجود میں آئے۔ آخر میں یہ تمام کام نجی اداروں کے سپرد کر دیئے گئے۔

تعلیمی تبدیلیوں کا معاشرتی اور مذہبی زندگیوں پر بھی خاطر خواہ اثر ہوا یہ خیال کہ مغربی تعلیم سے عوام عیسائی ہو جائیں گے بے بنیاد ثابت ہوا ذات پات چھوت چھات ستی سسٹم وغیرہ کے خلاف بقاعدہ تحریکیں چلائی گئیں آریہ سماج اور برہمو سماج نے ہندوؤں کی اصلاحات میں کافی حصہ لیا۔

سیاسی زندگی بھی کافی متاثر ہوئی نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقوں نے ملکی فلاح و بہبود کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ پنڈتوں کی اجارہ داری ختم ہوئی انگریزوں کی پالیسی کی برائیاں لوگوں کے سامنے آئیں مشنریوں کی کوششوں سے مغربی ممالک کے لوگوں نے ہندوستان کے بارے میں جاننے کی کوشش کیں، وید اور اپنشد وغیرہ کا ترجمہ انگریزی میں کیا گیا۔ اور رفتہ رفتہ یہاں کی برائیاں جو صرف وہم پر قائم تھیں ختم ہو گئیں۔

ثانوی تعلیم ۱۹۰۲ء کے بعد Secondary Education After 1902

۱۹۰۵ء سے ۱۹۲۱ء تک ثانوی تعلیم میں قابل فخر ترقی ہوئی اسکولوں کی تعداد ۵۱۲۴ سے ۷۵۳۰ ہوگئی اس میں زیادہ تر کام نجی ہی تھا سرکار کی پالیسی اس دور میں تعلیمی معیار قائم کرنے کی رہی جس کے لئے اساتذہ کا تقرر کیا گیا ان کے تنخواہوں کے گریڈ کی ازسرنو تشکیل کی گئی ساتھ ہی ساتھ ان کو رہائشی سہولتوں سے بھی نوازا گیا دستکاری کے لئے علیحدہ مکمل کورس کو نافذ کیا گیا امدادی اور تربیتی اداروں میں مزید اضافہ کیا گیا بہرحال اس دور کی خصوصیات درج ذیل ہیں۔

ماڈل اداروں کا نظریہ : Theory of Model Institution.

۱۹۱۳ء میں سرکار نے سرکاری اداروں کو ماڈل کی حیثیت دیدی چنانچہ نجی اداروں پر زیادہ توجہ دی گئی بعض مقامات پر تو سرکاری اداروں کو بند بھی کرنا پڑا نجی اداروں کی امداد میں بھی اضافہ کیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ وہ سرکاری اداروں کے نقش قدم پر تعلیم و تربیت کا انتظام کریں۔

۲. فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم پر توجہ Provision For Vocational Education

اس سلسلہ میں حتی الامکان کوشش کی گئیں کہ طلبہ کو مختلف فنون کی تربیت دی جائے تاکہ وہ زندگی میں اپنی پسند کے پیشہ کو اپنا کر ترقی کر سکیں ابتدا میں مندرجہ ذیل اسباب کی وجہ سے ناکامی ہوئی۔

ا. جو تبدیلیاں کی گئیں ان میں پاک و ہند کے لوگوں سے مشورے نہیں لئے گئے سرکاری اداروں میں اس نوعیت کا کوئی بھی کورس شروع نہیں کیا گیا اس قسم کے اداروں کو امداد کی ضرورت تھی جس پر توجہ نہیں دی گئی معلمین بھی تربیت یافتہ نہیں تھے صنعتی میدان میں بھی کمی تھی۔

ب. ان مشوروں اور تجاویز پر عمل نہیں کیا گیا جو سرکار کی طرف سے وقتاً فوقتاً جاری کی گئیں صرف امتحانوں میں تبدیلیوں سے مسئلہ حل نہیں ہو سکا عوام نے کبھی فنی یا پیشہ ورانہ تعلیم پر توجہ نہیں دی کیوں کہ اس سے زندگی میں فائدے حاصل نہیں ہوتے تھے عموماً طلبہ متوسط طبقے سے آتے تھے۔ وہ دستکاری Manual work کی تربیت کو پسند نہیں کرتے تھے

عملی تعلیم کے مواقع مفقود تھے۔

۳۔ انگریزی کی تدریس میں اصلاحات Improvement in The Teaching of English.

ہمیشہ سے انگریزوں کی کوشش انگریزی کو مقبول عام کرنے کی رہی جس کے لئے Direct Method اور تربیت یافتہ اساتذہ کا تقرر کیا گیا۔ نصابی کتب اور نمبروں میں بھی اضافہ کیا گیا اس کو معیاری بنانے پر بھی خاص توجہ دی گئی نتیجہ یہ ہوا کہ طلبہ اس کو سیکھنے کے لئے دوسرے مضامین کو نظر انداز کرنے لگے کیونکہ تقرری کے وقت اس کی مہارت معاون مددگار ثابت ہوتی تھی۔

۴۔ ذریعہ تعلیم Medium of Instruction.

لارڈ کرزن اور دیگر صاحب اقتدار لوگوں نے قومی زبانوں کی ترقی و ترویج پر زور دیا لیکن انگریزی بوجہ سرکاری زبان ہونے کے ترقی کرتی ہی رہی۔

۵۔ معلمین کی تربیت Training of Teachers

کرزن کی پالیسی سے ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ۱۹۱۲ء تک صرف پندرہ ہی تربیتی ادارے تھے لیکن ۱۹۱۳ء کے بعد ان کی تعداد دگنی ہو گئی۔ چنانچہ اب معلمین کی تعداد اور ان میں معیار قائم کرنے کی طرف خاص طور سے توجہ دی جانے لگی۔

(۱۹۲۹) Hartog کمیٹی نے بھی ثانوی تعلیم پر اپنی سفارشات پیش کیں اس کے مطابق مندرجہ ذیل نقائص تھے۔

۱۔ ثانوی تعلیم کا مقصد امتحان پاس کرنا اور یونیورسٹی میں داخلہ لینا۔

۲۔ تمام ثانوی ادارے ایک ہی قسم کے تھے جن میں پیشہ ورانہ، ٹیکنیکل تعلیم کا فقدان تھا اس وجہ سے طلبہ کو اپنی دلچسپی اور پسند کے مطابق کام کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔

۳۔ ثانوی امتحان میں ہر سال کثیر تعداد میں طلبہ ناکام ہوتے تھے جو قومی نقصان تھا جس کی دو وجوہات تھیں اول کمزور طلبہ کو پاس کر دیا جاتا ہے دوم ہر طالب علم میٹرک پاس کرنے پر مجبور ہے کیوں کہ اس کے سامنے کوئی دوسرا رستہ نہیں ہے۔

ثانوی تعلیم کی اصلاح کے لئے ہارٹگ کمیٹی نے مندرجہ ذیل تجاویز پیش کیں۔

۱۔ ہر طالب علم کو میٹرک کے امتحان میں شریک ہونے کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے۔
صرف ان طلبہ کو یہ حق ملنا چاہیئے جو ذہنی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔

۲۔ جو طلبہ ذہنی طور سے پست ہیں ان کے لئے فنی، پیشہ وارانہ یا دستکاری کے
کورس ہوں

۳۔ انگریزی تعلیم کی تدریس سے لوگ صرف کلرک بن سکتے ہیں دیہاتی طلبہ اس تعلیم
کو حاصل کر کے شہروں میں منتقل ہوجاتے ہیں جس کا سدباب ضروری ہے۔

۴۔ ثانوی تعلیم کو بہتر اور کارآمد بنانے کے لئے اساتذہ کا معیار زندگی بلند کیا جائے۔ ان
کی تربیت، ملازمت اور دیگر سہولتوں پر نظر ثانی کی جائے۔

اس طرح ثانوی تعلیم میں انقلابی اصلاحات کی گئیں۔ مادری زبان کو ذریعہ تعلیم تسلیم کیا گیا معلمین کی تعلیم و تربیت اور ان کی تنخواہوں پر بھی نظر ثانی کی گئی۔ طلبہ کی سیرت اور کردار پر بھی توجہ کی گئی طلبہ کا معیار زندگی بلند کیا گیا ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء کے دور میں نصابی کتابیں معیاری تیار کی گئی۔ نئی نئی اصلاحات اور مضامین کو داخل نصاب کیا گیا۔ ان پر مادری زبان میں کتابیں بھی تصنیف کی گئیں۔ اس طرح پاکستان کے وجود میں آنے سے بیشتر ہی علوم شرقیہ کی تدریج و ترقی شروع ہوگئی تھی جو پاکستان بننے کے بعد دن دونی اور رات چوگنی ہوگئی۔

باب ۱۱
لارڈ کرزن اور تعلیم

Lord curzon & His Contribution To The Development of Indo-Pak Education

لارڈ کرزن کا دور حکومت پاک وہند کی تعلیمی سرگرمیوں کے لئے مشہور ہے اس نے اپنے دور قیام میں یونیورسٹی ایکٹ کے علاوہ ثانوی تعلیم پر بھی کافی توجہ دی اس کی سفارشات اور تجاویز کو ۱۹۰۴ء کے ایکٹ میں پاس کیا گیا ویسے تو اس کے زمانے میں بہت سی چیزیں قابل ذکر ہیں لیکن ہم صرف چند کا مختصراً تذکرہ کر رہے ہیں۔

۱۔ **مالی امداد Large Finance** وکٹوریہ کے زمانے میں ہندوستانی اداروں کو مالی مشکلات کا سامنا تھا کرزن نے اس کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اس نے مالگذاری کو سختی سے وصول کیا حکومت کے اخراجات پر بھی توجہ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سرکاری خزانے میں روپیہ کافی جمع ہو گیا چنانچہ اس نے صوبوں کی امداد بڑھا دی لارڈ کرزن کے جانشینوں نے بھی اس کی پالیسی پر عمل کیا تجارت صنعت وحرفت میں بھی ترقی کی کوششیں کی گئیں چنانچہ اس طرح صوبوں کے تعلیمی اداروں میں مزید ترقی ہوئی۔

تجارت میں انفرادیت: Laissez Faire

کرزن کے دور میں اس نظریہ کو بالائے طاق رکھ دیا گیا اور تعلیم کیلئے معائنہ کرنیوالوں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا انگلینڈ میں اس دور میں Balfore Act پاس کیا گیا جس کا اثر ہندوستان پر بھی ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ پاک وہند میں سیاسی بیداری بھی پیدا ہو گئی تھی محکمہ تعلیمات کا زور تعلیمی اداروں پر زیادہ کر دیا گیا جس کا مقصد اسکے معیار کو بلند کرنا تھا بعض مدبروں نے اس کی مخالفت بھی کی کیونکہ وہ سرکاری اقتدار کو پسند نہیں کرتے تھے۔

خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش Efforts To Improve

کرزن کے دور حکومت کی یہ بھی خوبی ہے کہ وہ معیار تعلیم کو بلند کر رہا تھا۔

لیکن پاک وہند کے لوگ صرف ابتدائی اور ثانوی تعلیم کو مفت اور لازمی کرنے کی فکر میں تھے اس لئے بھی اس کے اور عوام کے درمیان خلیج وسیع ہو گئی۔

تعلیم میں وسعت Great Expansion

کرزن کے متذکرہ بالا کارناموں سے تعلیم میں بہت ترقی و توسیع ہوئی ایک طرف تو ملک میں بیداری ہو رہی تھی دوسری طرف مالی امداد مل رہی تھی جس کی وجہ سے لاتعداد ادارے کھولے گئے طلبہ کو مختلف طریقوں سے نوازا گیا معلمین کی حوصلہ افزائی ہوئی نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم عام ہو گئی۔

قومی نظریہ کی نشوونما Growth of Nationalism

کرزن کنڈر گارٹن طریقوں اور معروضی اسباق کو اپنانا چاہتا تھا تاکہ ابتدائی تعلیم میں بچہ کی زیادہ سے زیادہ نشوونما ہو سکے جب اس نے کلکتہ میں اپنا صدارتی خطبہ پڑھا تو اس نے مغربی نظریات زندگی کی تعریف و توصیف کی اور کہا۔

"Blunoered Into wounping The Educated Intellegentsip Beyond Any Hope of Reconcili a Tion" اس نے ہندوستانی سیاستدانوں اور مدیروں کا مذاق اڑایا جو تعلیمی مسائل حل کرنے کو اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی اس شخص کے خلاف ہو گئے اور اس سے نفرت کرنے لگے۔ کرزن اور اس کے ہمنوا Qualitative اصلاحات کے حامی تھے۔ ہندوستانیوں نے اس پر الزام لگایا کہ اس طرح وہ ترقی و ترویج کو روکنا چاہتے ہیں اس دور میں اعلیٰ عہدے انہیں کو ملے جن کو انگریزی پر عبور تھا تعلیمی اداروں میں نظم و نسق پر بھی توجہ کی گئی۔

کرزن کے خلاف ہند و پاکستان کے لیڈر جن میں گوکھلے وغیرہ شامل تھے۔ Quan-titative اصلاحات کے حامی تھے۔ کیونکہ اول الذکر انگلستان کے لئے فائدہ مند تھیں ان لوگوں نے اس پر بھی زور دیا کہ محکمہ تعلیمات میں پاک وہند کے زیادہ سے زیادہ ملازمین ہونے چاہئیں کیونکہ وہ ملک کی حالت سے بخوبی واقف ہیں۔ پھر مقاصد تعلیم میں بھی تبدیلی کی ضرورت ہے تعلیم اس قسم کی دی جائے جس سے عوام میں حب الوطنی، سیرت کی تعمیر اور

اخلاقی خوبیاں پیدا ہوسکیں اور ان کے لئے ضروری ہے کہ تعلیم مادری زبان میں دی جائے کرزن نے ان کی تجاویز پر کوئی توجہ نہیں دی ان تمام برائیوں کے ہوتے ہوئے بھی اس کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔

کرزن نے ۱۹۰۲ء میں یونیورسٹی تعلیم کی خامیوں کو معلوم کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا اس نے اس پر اپنی سفارشات بھی پیش کیں خاص خاص درج ہیں۔

۱۔ ۱۸۹۴ء کے ایکٹ کے مطابق لندن یونیورسٹی کو ماڈل مان کر یہاں کی یونیورسٹیوں میں اصلاحات کی جائیں۔

۲۔ ثانوی تعلیم پر خاموشی کو پسند کیا۔

۳۔ مندرجہ ذیل امور خاص توجہ کے محتاج ہیں۔

ا۔ انتظامیہ کی از سر نو تشکیل کی جائے۔

ب۔ کالجز کے الحاق پر خاص اصولوں کو اپنایا جائے۔

ج۔ طریقہ ہائے تدریس میں اصلاحات کی جائیں۔

س۔ یونیورسٹیوں کے امتحانات، طریقہ تعلیم، نصاب تعلیم میں ضرورت کے مطابق تبدیلیاں کی جائیں۔

یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۰۴ء۔ The Indian University Act of 1904

اس ایکٹ نے یونیورسٹیوں کی اصلاحات کے لئے اپنی سفارشات پیش کیں جن میں سے خاص خاص یہ تھیں۔

۱۔ سینیٹ کے ممبروں کی تعداد کم از کم پچاس اور زیادہ سے زیادہ سو ہونی چاہیئے۔

۲۔ ممبروں کی مدت ۵ سال ہو کیونکہ اس سے پیشتر وہ عمر بھر کے لئے ہوا کرتے تھے۔

۳۔ الیکشن کا طریقہ رائج کیا گیا جس میں معلمین کی نمائندگی کو ضروری قرار دیا گیا۔

۴۔ سنڈیکیٹ کی از سر نو تشکیل کی گئی۔

۵۔ کالجز کو ملحق Affiliation کے بارے میں اصول مقرر کئے گئے اس سے پیشتر معائنہ کو ضروری قرار دیا گیا۔

۶۔ سرکار کو حق دیا گیا کہ وہ سینیٹ کے فیصلوں کو اگر چاہیئے تو تبدیل کر دے

۷۔ مرکزی حکومت کو اختیار دیا گیا کہ وہ یونیورسٹی کے قوانین کا پاس و لحاظ کرے

قانون پر ردِ عمل : Reaction to the Act

یہ قانون بھی کرزن کے زمانے میں ہی پاس کیا گیا جیسا کہ پیشتر تحریر کیا جا چکا ہے کہ اس کو ہندوستان میں مقبولیت حاصل نہیں تھی بلکہ زیادہ تر لوگ اس کی سخت پالیسیوں سے ناراض تھے اس لئے انہوں نے کہا۔

۱۔ معلمین کا سینیٹ میں ہونا نہ ہونا برابر ہے کیوں کہ ان کو اختیارات حاصل نہیں ہیں۔
۲۔ معلمین کی نشستیں بہت ہی محدود ہیں۔
۳۔ سینیٹ میں زیادہ تعداد یورپین ممبروں کی تھی۔
۴۔ الحاق Affiliation کے اصول بہت سخت تھے۔
۵۔ پورا اقتدار یورپین کا ہی رہا۔
۶۔ یونیورسٹیوں کو بھی سرکاری محکمہ میں تبدیل کر دیا گیا۔

ایکٹ کی اہمیت : Importance of The Act

سرکاری حلقوں کا خیال تھا کہ اس قانون سے وہ کالج کی تعلیم اور یونیورسٹی کی تعلیم میں اصلاحات کر سکتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہوا چنانچہ پاک و ہندوستان نے اس ایکٹ کا بائیکاٹ کر دیا لیکن ان تمام برائیوں کے باوجود اس ایکٹ سے نظم و نسق میں کافی اصلاحات ہوئیں گرانٹ ان ایڈ کی وجہ سے طلبہ اور معلمین کی تعداد میں اضافہ ہوا لیکن سینیٹ اور معائنہ کرنے والوں کے تقرر سے خرچ بڑھ گیا۔ ان تمام باتوں کے باوجود اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سیڈلر کمیشن نے اس ایکٹ کے بارے میں کہا۔

The Act creates,' The most completely Governmental Universities in The world"

Curzon & collegiate.

کرزن اور کالجوں کی تعلیم : Curzon & collegiate

Education اس ضمن میں بھی کرزن کے کام قابل ستائش ہیں چونکہ اس نے امداد بڑھا دی تھی جس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۰۲ء میں اس نے ساڑھے تیرہ لاکھ روپیہ بطور امداد مزید دیا جو صوبوں کو ان کی ضرورت کے مطابق ملا نتیجہ یہ ہوا کہ کتب خانے،

ہوسٹل Laboratories کو اچھے پیمانے پر کھولا گیا طلبہ کی تعداد کے ساتھ ہی ساتھ اساتذہ کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔

لارڈ کرزن اور ثانوی تعلیم Curzon & Secondary

Education ثانوی تعلیم میں بھی لاتعداد نقائص تھے اس لئے کرزن نے اس طرف بھی توجہ دی۔ اس نے دو خاص اصولوں کو اپنایا۔ ۱۔ کنٹرول۔ ۲۔ اصلاحات

جہاں تک نجی اداروں کے کنٹرول کا سوال تھا تو اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل اصولوں کو نافذ کیا گیا۔

۱۔ محکمہ کی منظوری: Departmental Recognition

اس سلسلہ میں اداروں کو دو حصوں میں منقسم کر دیا گیا۔ ۱۔ وہ اسکول جن کو امداد ملتی تھی ۲۔ جن کو امداد نہیں ملتی تھی۔ چنانچہ اس ضمن میں اس اصول کو اپنایا گیا کہ سرکار کو صرف ان اداروں پر ہی کنٹرول رکھنا چاہیئے جن کو وہ گرانٹ دیتی ہے اور ان اداروں کو آزاد رکھا جائے جن کو گرانٹ نہیں دی جاتی تاکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق ترقی کرسکیں منظوری کے سلسلہ میں اصول وضوابط میں اضافہ کیا گیا Recognition سے بیشتر (۱) ادارہ منظوری کے قابل ہے (۲) ادارے کی حالت اچھی ہو۔ (۳) انتظام اور عملہ اس قابل ہے کہ وہ اسکول چلا سکے گا۔ (۴) معیار تدریس (۵) حفظانِ صحت، صفائی کھیل کود کا انتظام ہو۔ (۶) اساتذہ تربیت یافتہ ہوں وغیرہ جن میں یہ چیزیں ہوتی تھیں ان کو منظور کر لیا جاتا تھا اور وہ Recognized Schools کہلاتے تھے انکے طلبہ کو وظائف بھی دیئے جاتے تھے کچھ عرصہ بعد یہی اصول کالجز کے Affiliation کے لئے مقرر کر دیئے گئے۔

۲۔ یونیورسٹی کی منظوری University Recognition

ان اداروں کے امتحانات کا حق یونیورسٹیوں کو دیدیا گیا۔ یہ پابندی بھی عائد کی گئی کہ صرف منظور شدہ اسکول ہی اپنے طلبہ امتحان میں شرکت کے لئے بھیج سکتے ہیں جبکہ Unrecognized کو یہ حق نہیں تھا۔

۳۔ منظوری کے اصول کا نفاذ: Enforcement of the Condition of Recognition

سرکار نے اس طرف توجہ دی کہ اس اصول پر سختی سے

پابندی کی جائے جو اسکول منظور شدہ ہوتے تھے ان کو گرانٹ ملتی تھی مختلف طریقوں سے اداروں کو مجبور کیا گیا کہ وہ منظوری حاصل کرلیں مثلاً نجی اداروں کی امداد میں اضافہ، طلبہ کو وظائف وغیرہ اس طرح ان کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔

۴۔ Transfer of Unrecognized To Recognized Schools کچھ عرصہ بعد گورنمنٹ نے اس اصول کو اپنایا یا نتیجہ ظاہر ہے جبکہ منظور شدہ اسکول اپنے طلبہ کو امتحان میں شریک نہیں کرسکتے تھے ان کو گرانٹ نہیں ملتی تھی اور پھر وہ منظور شدہ اسکولوں کے درجہ میں بھی نہیں آسکتے تھے طلبہ کی تعداد کم ہونے لگی اور اس طرح نجی اداروں کی حالت بد سے بدتر ہونے لگی سیاسی حلقوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا لیکن نتیجہ خاص نہیں نکلا پھر کرزن نے سرکاری اداروں کو مندرجہ ذیل باتوں سے نوازا۔

۱. صوبوں کو مالی امداد زیادہ دینا تاکہ سرکاری اسکولوں کا معیار بلند ہو ان کے لئے عمارتیں، ہوسٹل اور دیگر سہولتوں کو مہیا کیا تاکہ وہ ماڈل اسکول کہلانے کے مستحق ہوں۔

۲۔ ثانوی تعلیم کے لئے تربیت یافتہ معلمین ضروری قرار دیئے گئے. تربیتی ادارے کھولے گئے۔

۳۔ نصاب تعلیم اور طریقہ ہائے تدریس میں خاطر خواہ تبدیلیاں کی گئیں۔

۴۔ مادری زبان میں مڈل تک تعلیم دی جائے گی انگریزی کو معیاری بنانے کی کوشش کی گئی چونکہ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی جماعتوں میں انگریزی ہی ذریعہ تعلیم تھی. اس لئے طلبہ کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ اس کو سمجھ سکیں۔

۵۔ سرکاری افسروں کو بڑھایا گیا تاکہ وہ معائنہ کرسکیں ان کی تنخواہیں بھی بڑھائی گئیں۔

کرزن اور پرائمری تعلیم: Curzon & Primary Education کرزن نے اس پہلو پر خاص طور سے توجہ دی وہ تعداد اور خوبی دونوں میں اضافہ کا خوگر تھا خاص خاص باتیں درج ذیل ہیں۔

۱. اس نے گرانٹ کے ساتھ Recurring گرانٹ کا اضافہ کیا۔

۲۔ معلمین کی تربیت لازمی کردی گئی جس کی مدت ۲ سال ہوگی زراعت میں

بھی تربیت دی جائے گی۔

۳۔ نصاب میں 3 R s کے ساتھ دیگر مضامین کا بھی اضافہ کیا گیا۔

۴۔ Object Lesson اور کنڈرگارٹن کے طریقوں کو اپنایا جائے۔

۵۔ جسمانی تعلیم پر خاص توجہ دی جائے۔

۶۔ دیہی علاقوں کیلئے مختلف نصاب کی سفارش کی۔

۷۔ گرانٹ جو نتیجہ کے مطابق دی جاتی تھی اس کو بند کیا۔

ان کے علاوہ کرزن نے اور بھی بہت سی اصلاحات کیں مثلاً

۱۔ آرٹس اسکول اور دیگر اسکولوں کی تفریق کو ختم کیا۔

۲۔ زرعی تعلیم کے لئے جامع منصوبہ پیش کیا Pusa میں ایک مرکزی انسٹیٹوٹ زرعی ترقی کے لئے قائم کیا اور صوبوں سے کہا کہ وہ اپنے یہاں ایسے ادارے قائم کریں زراعت کو مڈل اور ہائی اسکول میں مضمون کی حیثیت دی۔

۳۔ پیشہ وارانہ اور ٹیکنیکل تعلیم کے لئے طلبہ کو وظائف دیکر غیر ممالک بھیجا۔

۴۔ شملہ کانفرنس میں اپنے خیالات کا اظہار کیا جس کے مطابق تعلیم کا مقصد تشکیل اخلاق ہونا چاہیئے۔

۵۔ ۱۹۰۴ء میں محکمہ آثار قدیمہ قائم کیا اور اس کے لئے قانون بھی پاس کیا۔

۶۔ ہندوستان میں پہلی بار Director General of Education کا عہدہ قائم کیا جس کی وجہ سے مرکز میں بھی محکمہ تعلیم قائم ہوا۔

المختصر لارڈ کرزن نے تعلیم کے ہر شعبے میں اصلاحات نافذ کیں جن کا مختصراً تذکرہ کیا جا چکا ہے۔

سیڈلر کمیشن : Sadler Commission 1917

اس کو کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کے نام سے بھی پکارتے ہیں مسٹر ایم ای سیڈلر اس کے چیرمین تھے انھوں نے ایک جامع منصوبہ یونیورسٹی اور ثانوی تعلیم کی اصلاحات کیلئے پیش کیا جو سفارشات پیش کی ان میں سے خاص خاص یہ ہیں۔

۱۔ انٹرمیڈیٹ کالجز کی تشکیل کی سفارش کی جن میں آرٹ سائنس طب، انجینرنگ اور ٹیچنگ کا انتظام کیا جائے۔

۲۔ یونیورسٹی تعلیم کا آغاز میٹرک کی بجائے انٹرمیڈیٹ سے کیا جائے۔
۳۔ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی بورڈ قائم کیا جائے جو ثانوی تعلیم کا بندوبست کرے۔
۴۔ ڈھاکہ میں یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں درس و تدریس بھی ہو۔
۵۔ کلکتہ یونیورسٹی کو بھی تدریسی یونیورسٹی بنایا جائے اور مفصلات کے تمام کالجوں کو اس میں شامل کیا جائے۔
۶۔ قابل اور ذہین طلبہ کے لئے آنرس کورس قائم کیا جائے۔
۷۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد ڈگری کورس تین سال کا ہونا چاہیئے۔
۸۔ پروفیسران کا تقرر ایک بورڈ کیا کرے جو ملکی اور غیر ملکی ماہرین پر مشتمل ہو۔
۹۔ مسلمان اور ہندو لڑکیوں کے لئے ایسے ادارے قائم کئے جائیں جہاں پردے کا انتظام ہو۔
۱۰۔ ڈھاکہ اور کلکتہ میں ایجوکیشن کا شعبہ قائم کیا جائے اور اس کو انٹر سے ایم اے تک مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جائے۔
۱۱۔ یونیورسٹیوں میں مخصوص قسم کے کورس شامل کئے جائیں جیسے صنعتی ٹیکنیکل وغیرہ
۱۲۔ مزید یونیورسٹیاں قائم کی جائیں چنانچہ میسور، پٹنہ، بنارس، علی گڑھ لکھنو اور حیدرآباد میں قائم کی گئیں۔
۱۳۔ جسمانی تربیت، طلبہ کے لئے طبی امداد اور بورڈ آف اسٹوڈنٹس پر بھی خاطر خواہ توجہ دی جائے گی۔
۱۴۔ یونیورسٹی کے اساتذہ کے لئے بھی خاص قسم کے کورسز کا انتظام کیا جائے۔ تاکہ وہ اپنے فرائض بہتر طریقوں سے انجام دے سکیں۔

بہرحال یہ خاص خاص سفارشات تھیں جو کہ کمیشن نے پیش کی تھیں۔

پرائمری تعلیم کی ترقی Development of Primary Education

ہم یہاں ۱۸۵۴ء سے ۱۹۰۲ء تک دور کی خصوصیات پر اختصار سے روشنی ڈال رہے ہیں۔

۱۔ ۱۸۵۹ء کا مراسلہ :۔ ۱۸۵۴ء کے مراسلہ نے دیسی اسکولوں کو سرکاری اداروں میں مربوط کرنے کی سفارش کی تھی لیکن ۱۸۵۹ء کے مراسلہ نے

اتفاق نہیں کیا اس نے سفارش کی کہ ایک تعلیمی ٹیکس عائد کر کے ابتدائی تعلیم کو بذریعہ سرکار ترقی دی جائے۔

۲۔ ۱۸۵۹ء اور ۱۸۸۲ء کے دوران اختلاف رونما ہوئے جن کے خاص اسباب درج ذیل ہیں۔

(الف) دلیسی اداروں پر اختلاف (ب) ٹیکس عائد کرنا اور اس کو Grant in Aid کی شکل میں وصول کرنا۔ (ج) مختلف صوبوں میں مختلف ردِعمل چنانچہ کچھ لوگوں نے دلیسی مدارس کی طرف داری کی اور کہا کہ یہی طریقہ بہتر ہے جبکہ دوسرے گروہ نے کہا کہ تعلیم سرکاری کنٹرول میں بہتر طریقوں سے دی جا سکتی ہے لیکن ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو ان دونوں میں اتحاد کا خوگر تھا چنانچہ مدارس میں نجی اور سرکاری اسکولوں کے طرف دار تھے بمبئی صرف سرکاری اسکولوں کا حامی تھا جبکہ بنگال والے صرف دلیسی ادارے چاہتے تھے۔

Finance: ۱۸۵۹ء کے مراسلے نے مقامی ٹیکس کی سفارش کی۔ مرکزی حکومت نے اس سے اتفاق کیا اس طرح دیہاتوں میں مالگذاری اور شہروں میں مکانوں پر ٹیکس لگانے کا انتظام کیا گیا لیکن میونسپل اداروں نے اس پر مناسب طور سے عمل نہیں کیا۔

Training of Teachers اس مراسلے کے مطابق لاتعداد تربیتی ادارے قائم کئے گئے۔

Extent of Expansion: اس کو اس نظریہ کے مطابق The Funds Provided & The made of Agencies Employed پر عمل کیا گیا۔ ہر صوبہ میں مختلف حالات تھے بنگال ٹیکس پر منحصر تھا اور وہ دلیسی اداروں کو اپنانا چاہتا تھا جس سے وہاں پر کافی ترقی ہوئی بمبئی اور پنجاب سرکاری اسکولوں کو پسند کرتے تھے اس لئے وہ زیادہ ترقی کرنے سے قاصر رہے۔

کچھ سفارشات پر تو فوراً ہی عمل کیا گیا لوکل سیلف گورنمنٹ جو رپن نے جاری کی تھیں ان کی وجہ سے بہت سے باتوں میں رکاوٹیں پیدا ہوئیں لیکن پھر بھی ابتدائی تعلیم کو

مقامی خود اختیاری اداروں کے سپرد کرنے سے کافی ترقی ہوئی جن وجوہات سے گورنمنٹ تعلیمی مسائل کو حل کرنے میں ناکام ہوئی ان میں سے خاص خاص درج ذیل ہیں۔

۱۔ Failure to Introduce Compulsory Primary Education وقت کی سب سے اہم ضرورت ابتدائی تعلیم مفت اور لازمی کرنا تھی جبکہ انگلستان میں ۱۸۷۰ء میں ایسا ہو چکا تھا لیکن ہندوستان میں اس سلسلہ میں کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ پاک وہند کے لیڈروں نے اس سلسلہ میں احتجاج کیا لیکن انگریزوں نے بہانہ کر دیا کہ وہ بیرونی لوگ ہیں اس لئے وہ لوگوں کو مجبور کرنے سے قاصر ہیں۔

۲۔ Control of the Primary Education By Local Bodies :- ابتدائی تعلیم کی ذمہ داری ان اداروں کے سپرد کر دی گئی تھی جن کے پاس پیسہ نہیں تھا اس لئے رفتار بہت ہی سست رہی رپن نے اس کے لئے بہت کوششیں کیں۔ اس نے ہدایات کیں۔

(۱) کافی روپیہ خرچ کیا جائے

(۲) صوبوں کو ضرورت کے حساب سے روپیہ دیا جائے لیکن پھر بھی ناکامی ہوئی۔

(۳) Neglect of Indigeneous Schools ان پر توجہ نہیں کی گئی۔ اس لئے رفتہ رفتہ یہ معدوم ہو گئے۔

اس طرح غیر دانشمندانہ پالیسی سے ابتدائی تعلیم میں ترقی نہیں ہو سکی البتہ جہاں تک Qualitative معیار کا سوال تھا تو اس میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں۔

۱۔ **اسکولوں کی عمارتیں**:۔ دیسی اداروں کی اپنی عمارتیں تھیں۔ زیادہ تر اسکول مسجد اور مندر میں ہوتے تھے اس دور میں اس طرف توجہ دی گئی۔

۲۔ **معلمین کی تربیت**: معلمین کو تربیت دی گئی۔ خود مختار اداروں کے معلمین کے لئے اچھی تنخواہوں کی سفارش کی گئی لیکن امدادی اسکولوں کے ساتھ ایسا نہیں کیا گیا۔

۳۔ **داخلے**:۔ دیسی مدارس میں چھوت چھات، اونچ نیچ کا فرق تھا۔ یہ نظریہ

ہندوؤں میں عروج پر تھا اس کو ختم کیا گیا۔

(۴)۔ کتب :۔ دیسی مدارس میں چھپی ہوئی کتب کا استعمال نہیں ہوتا تھا لیکن ۱۹۰۰ء کے بعد سے اس میں خاطر خواہ ترقی ہوئی۔

۵۔ نئے طریقۂ تعلیم :۔ ہندوستان کے Monitorial طریقے کو انگلستان میں کافی مقبولیت ہوئی۔ لیکن اب نئے نئے طریقوں کی سفارش کی گئی۔ ذہین طلبہ کو وظیفہ بھی دیا جاتا تھا کنڈر گارٹن اور معروضی اسباق بھی اپنائے گئے۔ سزا کا نظریہ ختم کیا گیا لیکن انفرادی توجہ بوجہ جماعتی تدریس ختم ہوگئی۔

۶۔ نصاب تعلیم میں بھی خاطر خواہ تبدیلیاں کی گئیں معلمین کی قلت کی وجہ سے کامیابی نہیں ہوئی۔ ڈرائنگ، ہائی جین، زراعت، سائنس، دیگر زبانیں حساب جسمانی تعلیم اور دستکاری کو بھی شامل کیا گیا۔

پرائمری تعلیم ۱۹۰۲ء کے بعد : Primary Education After 1902

اس سلسلہ میں سب سے اہم نام گوپال کرشن گوکھلے کا ہے اس نے ۱۹۱۱ء میں Imperial Legislative Council میں بل پیش کیا جس کے مطابق ۶ سے ۱۰ سال کے بچوں کے لئے مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام کیا جائے لیکن یہ پاس نہیں ہوا ۱۹۱۱ء میں اس نے پھر ایک بل پیش کیا۔ جس میں ابتدائی تعلیم کے لئے تجاویز پیش کی گئی تھیں اس کو مقامی اداروں کو بھیجا گیا۔ اس کو بھی نامنظور کیا گیا البتہ خود مختار اداروں کی امداد میں اضافہ کیا گیا جس کی وجہ سے طلبہ کی تعداد میں حیرت ناک اضافہ ہوا۔ کنگ جارج پنجم ۱۹۱۱ء میں ہندوستان تشریف لائے اور انہوں نے تعلیم کے لئے ۳۰،۰۰۰ پونڈ کا مزید اضافہ کیا اس وجہ سے اداروں میں بھی ۷۵ فیصد کا اضافہ ہوا۔ اس کے نتیجہ میں ۱۹۱۳ء میں ایک ریزولیوشن پاس کیا گیا جو زیادہ تر ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں ہی تھا اس کے مطابق۔

۱۔ لوئیر پرائمری اسکولوں کو پرائمری اسکول میں ضم کر دیا جائے۔

۲۔ پرائیویٹ امدادی اسکولوں پر خاص توجہ دی جائے۔

۳۔ مقامی خود مختاری ادارے زیادہ سے زیادہ اسکول کھولیں۔

۴۔ معلمین تربیت نارمل اسکول میں حاصل کریں۔

ان تجاویز پر فوراً ہی عمل کیا گیا۔ زیادہ تر صوبوں میں نجی اسکول ختم ہو گئے البتہ بنگال میں ہر ڈسٹرکٹ میں یونین کے تحت اسکول کھولے گئے اس نے یہ بھی سفارش کی کہ ۸ میل کے ایریا میں لڑکوں کا ایک اسکول ضرور ہونا چاہیئے۔ ۱۹۱۸ء کے قانون کے مطابق یہ طے کیا گیا کہ اس میں ہندوستانیوں کو زیادہ سے زیادہ شریک کیا جائے چنانچہ میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ کو حق دیا گیا کہ وہ مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام کریں اسی سال Primary Education Act پاس ہوا جس کے مطابق پرائمری تعلیم کو مفت اور لازمی قرار دیا گیا۔

سارجنٹ اسکیم

The Sargent Scheme 1944

آزادی سے بیشتر جنگ عظیم دوم کے اختتام پر حکومت برطانیہ نے ہندوستانیوں کی تعلیم کے لئے ایک نئی اسکیم پیش کی جو "سارجنٹ اسکیم" کے نام سے مشہور ہے یہ اسکیم تعلیم کے تمام پہلوؤں پر وضاحت سے روشنی ڈالتی ہے۔ اس لئے بہت اہم ہے۔ یوں تو یہ کافی طویل ہے لیکن ہم خاص خاص باتوں کا تذکرہ کر رہے ہیں۔

۱۔ Primary Education

۶ سال سے ۱۴ سال کے دوران مفت اور لازمی تعلیم۔

۲۔ طریقہ ہائے تدریس رپورٹ کے مطابق اپنائے جائیں۔

۳۔ مڈل اسکولوں کو خاص افادیت حاصل ہے اس لئے ان میں تربیت یافتہ عملہ رکھا جائے۔

۴۔ معلمین کے تقرر، مشاہیرے اور تربیت پر اصلاحات کی جائیں۔

۵۔ تربیت یافتہ خواتین کو ملازمتیں دی جائیں۔

Pre-Primary تعلیم جو تین سال سے ۶ سال تک ہوگی اس میں طلبہ کو مندرجہ ذیل آسانیاں دی جائیں۔

۱۔ ان اداروں پر خاص توجہ دی جائے۔

۲۔ نرسری اور پرائمری اسکولوں کو ملا دیا جائے خاص طور سے ایسے مقامات

پر جہاں طلبہ کی تعداد کم ہو۔

۳۔ ان اسکولوں میں عورتوں کو بحیثیت معلمین رکھا جائے۔

۴۔ والدین کو مجبور کیا جائے کہ وہ اپنے بچوں کو مفت اداروں میں بھیجیں۔

۵۔ تعلیم کا مقصد سماج کے لئے تخلیقی کام کرنا ہو۔

بنیادی تعلیم زیادہ تر عملی ہونی چاہیئے ابتدا میں گرد و نواح کی مناسبت سے کسی دستکاری کے ذریعہ تعلیم دی جائے نصاب اور دستکاری میں ارتباط قائم کیا جائے۔ لکھنا پڑھنا اور حساب ہی کافی نہیں ہے تعلیم ہر طرح سے خود کفیل ہونی چاہیئے۔ چنانچہ بچہ کو ایسی تعلیم دی جائے جس سے وہ آئندہ زندگی میں کوئی پیشہ اپنا سکے۔

ان کے علاوہ اس نے ثانوی تعلیم پر بھی کافی اہم تجاویز پیش کی ہیں۔ خاص خاص یہ ہیں۔ **ثانوی تعلیم** ، Secondary Education :۔

۱۔ ہائی اسکول میں ۱۱ سے ۱۷ سال یعنی ۶ سال کا کورس ہو۔

۲۔ جونیر بیسک کے بعد اس میں داخل کیا جائے۔

۳۔ انتخاب میں توجہ دی جائے اور ان ہی کا داخلہ ہو جن میں استعداد ہو۔

۴۔ ہائی اسکول دو اقسام کے ہونے چاہئیں Academic اور Technical ان میں زندگی کی تیاری کے لئے تعلیم دی جائے۔

۵۔ یونیورسٹیوں کی ضروریات کے لحاظ سے نصاب کو مختلف شعبے میں تقسیم کر دینا چاہیئے۔

۶۔ غریب، نادار اور مستحق طلبہ کو ہر قسم کی سہولتیں دی جائیں ذہین طلبہ کو وظائف دے کر ان کی ہمت افزائی کی جائے۔

۷۔ مرکزی مشاورتی کونسل کے مطابق معلمین کی تنخواہیں مقرر کی جائیں۔

Technical Education :۔ اس ضمن میں عملی تعلیم پر توجہ دی جائے اور اس کو تعلیم کا جزو لاینفک قرار دیا جائے کیوں کہ اس کی بڑی ضرورت اور افادیت ہے۔ کامرس اور آرٹس کو بھی اس میں شریک کیا جائے اس سلسلہ میں جونیر اور سینیر ٹیکنیکل اسکول کھولے جائیں جس میں دو سال اور چار سال کے کورس ہوں پولی ٹیکنیک اسکول بھی کھولے جائیں جس میں تربیت یافتہ اساتذہ کا تقرر کیا جائے۔

Training of Teachers تمام معلمین تربیت یافتہ ہوں ان میں میٹرک پاس جو ۱۶ سال سے کم عمر کے ہوں ان کو داخلہ دیا جائے۔ ہائی اسکول کے معلمین کم از کم گریجویٹ اور تربیت یافتہ ہوں نرسری اسکول کے معلمین عموماً خواتین ہوں۔ ہائی اسکول کی تربیت کا کورس ایک سال کا ہو۔ بیسک اور پرائمری اسکول کے لئے مدت تین سال اور نرسری انفنٹ کے لئے مدت ۲ سال ہو معلمین کا زیادہ سے زیادہ وقت تعلیمی سرگرمیوں میں خرچ ہونا چاہیئے۔

University Education یونیورسٹی کی تعلیم ملک کی ضرورت پوری کرنے سے قاصر ہے اس لئے اس پر پابندیاں عائد کی جائیں ایک سال یونیورسٹی میں اور ایک سال ہائی اسکول میں ضم کر کے انٹرمیڈیٹ کو ختم کر دینا چاہیئے ٹیوٹوریل سسٹم کو نافذ کیا جائے درس و تدریس کا معیار بلند ہونا چاہیئے معلمین کی شرائط ملازمت میں اصلاح کی جائے یونیورسٹی گرانٹ کمیٹی کی تشکیل کی جائے۔ ان کے ممبروں کے فرائض پر بھی بحث کی گئی ہے۔

Adult Education :۔ ہندوستان میں ناخواندہ اکثریت میں ہیں جن پر خاص توجہ کی ضرورت ہے ان کی تعلیم کو بھی مفت اور لازمی تعلیم کا حصہ سمجھنا چاہیئے اور اس میں ناخواندگی کو بیس سال کے عرصہ میں ختم کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے اس کام کے لئے حکومت کو روپیہ مخصوص کرنا چاہیئے۔

کمیٹی نے جسمانی تعلیم، حفظان صحت، داخلے کے وقت طبی معائنہ معلمین کو طبی امداد وغیرہ کے لئے سفارشات پیش کی تھیں۔

المختصر اس اسکیم کی خاص خاص باتوں پر مختصراً روشنی ڈال دی ہے۔ اس اسکیم کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ سب سے جامع اور واضح اسکیم تھی جس میں ۱۴ سال کی عمر تک مفت لازمی تعلیم کی سفارش کی گئی تھی پیشہ معلمی کو بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی تھی تاکہ قابل لوگ اس میں آسکیں۔ عورتوں کی تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ ان کے لئے معلمی کے پیشے کو مخصوص کیا گیا تھا۔ نصاب کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے ملکی ضروریات کے مطابق تعلیم و تربیت کی سفارش کی گئی تھی۔ اس نے (Aptitude) رجحاناتی امتحانات کی بھی سفارش کی تھی طلبہ کا انتخاب اس کی

استعداد اور فطرت کے مطابق کیا جائے ثانوی تعلیم مختلف اقسام کے ہوں فنی، پیشہ وارانہ اور دیگر ضروری چیزوں پر بھی توجہ کی گئی تھی۔

ان تمام خوبیوں کے ہوتے ہوئے بھی اس پر عمل نہ ہو سکا کیونکہ ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہو گیا۔



انگریزوں کے تعلیمی رجحانات پر تبصرہ

Comments on British Attitude TO wards Education.

اس سے پیشتر کہ ہم پیشقدمی کریں بہتر یوں معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کی تعلیمی پالیسی میں ناکامی کے اسباب پر بھی مختصراً نظر ہو جائے خاص خاص درج ذیل ہیں۔

Failure To Evolve A National System of Education

عام اعتراض اور الزام انگریزوں پر یہ ہے کہ انہوں نے پاک و ہند کے باشندوں کی تعلیم و تربیت کے لئے کوششیں نہیں کیں لیکن یہ خیال صداقت سے دور ہے حقیقت یہ ہے کہ انگریزوں نے یہاں کے باشندوں کی تعلیم و تربیت کے لئے کوششیں ضرور کیں لیکن انہوں نے کبھی بھی تعلیم کو قومی نقطہ نظر سے پھیلانے کی کوشش نہیں کی۔ ۱۹۲۱ء کے بعد سے اگرچہ تعلیمی ذمہ داریاں پاک و ہند کے باشندوں کے سپرد کردی گئیں تھیں لیکن اس وقت تک قومی نظریہ وجود میں نہیں آیا تھا یہ تو دوسری جنگ عظیم کے بعد سے تیزی سے ترقی پذیر ہوا ۱۹۴۴ء کی سفارشات سے پتہ چلتا ہے کہ حقیقتاً ہندوستان اور پاکستان کے باشندوں کو انگریز قومی نظریہ تعلیم سے دور ہی رکھنا چاہتے تھے۔ اس نے اس الزام میں کسی حد تک صداقت ہے۔ اس سے پیشتر جب کرزن نے ۱۹۰۴ء میں انقلابی تبدیلیاں کرنے کی کوشش کیں اور اسی طرح سے ۱۹۳۷ء کے واقعات پر بھی لوگوں کے رائے مختلف ہیں سرکاری مورخین اس سلسلہ میں دعویٰ کرتے ہیں کہ حکومت انگلستان نے پاک و ہند کے باشندوں کی تعلیم و تربیت پر بہت توجہ دی اس کے برعکس قومی لیڈروں کا الزام ہے کہ انہوں نے جو کچھ بھی کیا۔ وہ زیادہ تر کاغذی حیثیت کا حامل رہا جس پر عمل نہیں کیا گیا۔ وہ زیادہ تر کاغذی حیثیت کا حامل رہا جس پر عمل نہیں کیا گیا۔ پھر ان کی ہمیشہ سے یہی کوشش رہی کہ وہ پاک و ہند کے لوگوں کے ثقافتی اور روحانی اقدار کو ختم کردیں۔ بہرحال ان ناکامیوں کے مندرجہ ذیل خاص اسباب تھے۔

۱۔ Failure To Realise The Place of India in The Country of Nations قومی نظریہ مقصدیت پر منحصر ہوا کرتا ہے اور یہ اسی حالت میں کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے جبکہ اس میں پوری قوم حصہ لے۔ لیکن حکومت برطانیہ نے ہمیشہ ہندوستان کو اپنی نوآبادی سمجھا اور یہاں کے باشندوں کو کبھی بھی شریک کرنے کی کوشش کی تعلیم و تربیت کی ابتدا بھی اصل میں مشنریوں کی کوششوں سے ہوئی تھی جن کا مقصد یہاں پر عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت تھا کمپنی نے اپنے دور حکومت میں زیادہ تر توجہ صنعت و حرفت اور تجارت پر دی۔ ۱۸۵۴ء کے مراسلہ نے بھی اس ضمن میں ان کی راہبری کی۔ کرزن اور رپن کی کوششیں اس سلسلہ میں ضرور قابل ستائش

ہیں لیکن انہوں نے بھی آقا اور غلام کے فرق کو برقرار رکھا اس وجہ سے قومی نظریہ تعلیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۲. Failure to Evolve a Synthesis of East & west :۔ اس سلسلہ کا دوسرا سبب مغرب و مشرق کا فرق تھا۔ انگریزوں نے اپنے دور حکومت اس کو کبھی بھی ختم کرنے کی کوشش نہیں کی وہ ہندوستانی ثقافت اور باشندوں کو کمتر سمجھتے تھے البتہ کچھ افسروں نے علوم شرقیہ کو سراہا لیکن ان کی تعداد بہت قلیل تھی جتنی اسکیمیں بھی بنائی گئیں ان میں زیادہ تر نمائندے انگریز ہی ہوتے تھے جو Kipling سے ہم خیال تھے یعنی East is East and west is west and Never They shall Meet" ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد اس نظریہ میں اور زیادتی ہوگئی۔ وکٹوریہ کے عہد سے پاک و ہند کے باشندوں کو باغی بے وفا اور دیگر برے ناموں سے نوازا جانے لگا انگریزوں کے کلب ریل گاڑیاں اور دیگر جگہ پر ان کے لئے پابندیاں عائد کر دی گئیں جس سے بجائے اشتراک اور تعاون کے تفریق اور تنفر بڑھتا ہی گیا اس کا ردعمل یہ ہوا کہ ہندوستان کے قومی رہنماؤں نے بھی اس فرق کو بڑھانے میں خاطر خواہ حصہ لیا۔ یہ ضرور ہے کہ کچھ لوگ ایسے ضرور تھے جو ابھی تک اختلاط کے قائل تھے لیکن وہ کیا کرتے جب انگریز کسی طرح بھی مخلوط ہونے کے لئے تیار نہیں تھے ایسی حالت میں قومی نظریہ کا تخیل ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

۳. Inadequate Aims انگریزوں نے کبھی بھی تعلیم کے مقاصد کا تعین نہیں کیا اگرچہ ۱۷۵۷ء سے ۱۹۴۷ء کے عرصہ میں صرف دو ہستیوں نے یعنی ہسٹینگز اور ڈنکن نے اس طرف توجہ ضرور دی اور انہوں نے کوشش کی کہ ان لوگوں سے بھی تعلقات استوار کئے جائیں جن کو موردِ الزام ٹھہرا کر ہر قسم کی سہولتوں اور آسائیوں سے محروم کر دیا گیا ہے لیکن اس طویل عرصہ میں ان کی کیا چلتی اس کے علاوہ اگرچہ ۱۸۵۴ء کے مراسلے نے مشرقی علوم کی ہمت افزائی اور اس کی ترقی و ترویج پر پوری توجہ دی تھی لیکن Deffusin of The Improved arts Sciene, Philosophy & Litrature of Europe" پہ

بالکل توجہ نہیں دی گئی ۱۸۲۲ء کے کمیشن نے تو اس سلسلہ میں خاموشی کو ہی بہتر خیال کیا۔ کرزن نے علوم شرقیہ کی برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ ۱۸۱۳ء کے چارٹر کے مطابق تعلیم کا مقصد خاص سیرت و کردار کی تعمیر قرار دیا گیا تھا۔ لیکن عملی شکل میں ان کو سرکاری ملازمتوں کے لئے تیار کرنا ہی مقصد تعلیم رہا۔ بغیر مقاصد کا تعین کئے کوئی بھی اسکیم کامیاب نہیں ہو سکتی یہ ضرور ہے کہ لاتعداد کمیشن اور رپورٹیں تیار کی گئیں لیکن جہاں تک عمل کا سوال ہے تو صرف ان ہی باتوں پر کیا گیا جو ان کے اپنے فائدے کی تھیں مقامی خود اختیاری اداروں کو بھی قائم ضرور کیا گیا لیکن جہاں تک عمل کا سوال ہے تو صرف ان ہی باتوں پر کیا گیا جو ان کے اپنے فائدے کی تھیں لیکن ان کو روپیہ نہیں دیا گیا اور بغیر روپیہ کے کوئی کام نہیں کیا جا سکتا اسلئے ناکافی ہوئی۔

۴۔ Adoption of wrong methods ایک طرف تو انہوں نے مقاصد کا تعین نہیں کیا تھا تو دوسری طرف ایسے طریقوں کو اپنایا گیا جو غلطیوں سے بھرپور تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۹ء تک تمام نجی ادارے ختم ہو گئے اور پھر ہمیشہ پاک و ہند کے باشندوں کو مختلف طریقوں سے انگریزی اور علوم عربیہ سیکھنے پر مجبور کیا گیا اتنا ہی نہیں بلکہ ان کو نقالی پر بھی مجبور کیا گیا انگلستان، صنعتی مالدار اور شہری ملک ہے۔ جب کہ ہند و پاک زرعی غریب اور دیہاتوں کا ملک ہے چنانچہ اس تفریق کو نظرانداز کر کے انہوں نے انگلستان کے پیمانہ پر یہاں یہ جو کچھ بھی کرنا چاہا کیا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ملک کی معاشرتی اور اقتصادی حالت بالکل تباہ ہو گئی سونے پر سہاگہ Down ward Filteration Theory کو اپنایا گیا جس میں عوامی تعلیم کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا۔ انگریزی ذریعہ تعلیم تدریس پر زور اور یہ خیال کہ انگریزی ہی اس ملک کی قومی زبان ہے بنا دی جائے اور پھر علاقائی زبانوں کو ختم کرنے کی کوشش سے بھی انگریزوں کی بیوقوفی کا پتہ چلتا ہے انگریزوں نے کبھی بھی ہند و پاک کے باشندوں کو ان کی نظر سے نہیں دیکھا اس سلسلہ میں ہم Rawlinson کے خیال سے بالکل متفق ہیں کہ انگریزوں کے اسباب زوال کی اہم وجہ ان کا غلط تخیل تھا۔

۵۔ Failure To Develop Indo-Pak

Socially, Economically & Politically Strong

کسی بھی اسکیم کی کامیابی کا دارومدار سماجی، سیاسی اور اقتصادی اصولوں پر ہوا کرتا ہے انگریزوں کی ہمیشہ سے پالیسی مذہب میں غیرجانبدارانہ رہی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ دیگر ضروری معاملات سے بھی کنارہ کشی کر لیتے۔ ہندوستان میں ان پہلوؤں پر لاتعداد اصلاحات کی ضرورت تھی مثلاً چھوت چھات کا مسئلہ، کمسن کی شادی ذات پات کا فرق وغیرہ وغیرہ لیکن انگریزوں نے اس طرف کبھی بھی توجہ نہیں دی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی اور زیادہ کٹر اور متعصب ہو گئے اس کا تعلیم پر بھی خاطر خواہ اثر ہوا ان کے علاوہ سیاسی پابندیوں نے بھی تعلیم کی ترقی میں رکاوٹیں پیدا کیں قومی جذبہ کو پیدا کرنے کے لئے سب سے ضروری چیز یہ تھی کہ تمام مذاہب اقوام اور ذاتوں کو ایک دھاگے میں پرونے کی کوشش کی جاتی لیکن انگریزوں نے کبھی بھی ان میں توازن پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی انہوں نے ہمیشہ Divide & Rule کی پالیسی پر عمل کیا اس طرح ہندو مسلم میں نفاق پیدا کر کے اپنا الو سیدھا کرنے کی کوشش کی چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد دونوں ہی ان کے مقصد سے آگاہ ہو گئے۔ اقتصادی حالات سے نظر اندازی نے اس ملک کو بالکل تباہ کر دیا۔ وہ ہندو پاک جو Golden Bird کے نام سے مشہور تھا اس کو کنگال اور مفلس کر دیا گیا تاکہ ہر شخص روٹی اور پانی کے چکر میں پڑ کر انگریزوں کے نظام سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش نہ کر سکے قومی نظریہ تعلیم کو منظر پر لانے کے لئے سیاسی سماجی اور اقتصادی حالات پر نظر ثانی کر کے ان کے حیات نو بخشنا ضروری تھا۔

۴. Failure To Secure The Necessary Personnel

انگریزوں نے ہمیشہ پاک و ہند کے باشندوں کو بری نظر سے دیکھا تھا اتنے بڑے ملک کے لئے ضروری تھا کہ یہاں کے باشندوں پر اعتماد اور بھروسہ کیا جاتا۔ اور نظام حکومت میں ان کو شریک کر کے قومی تعلیم کے نظریہ کو فروغ دیا جاتا اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ انہوں نے وقتاً فوقتاً انگلستان سے ماہرین تعلیم کو بلایا لیکن اس سلسلہ میں دو اعتراض کئے جا سکتے ہیں اول تو وہ تعداد میں بہت کم ہوتے تھے دوسرے وہ اس ملک کے حالات اور ضروریات سے بھی آشنا نہیں ہوتے تھے پھر ان کا قیام بھی

مختصر اس لئے وہ یہاں کے بارے میں تعلیم کے لئے کیسے مناسب اسکیمیں بنا سکتے تھے پورے دور میں ہم کو ڈف اور ولسن ایسے اشخاص بھی ملتے ہیں جنہوں نے یہاں کے معاملات میں دلچسپی لی ان کے علاوہ پنجاب میں آرنولڈ اور بمبئی میں سر الیگزنڈر گرانٹ بھی کافی مشہور ہیں ان لوگوں نے حقیقتاً ناقابل فراموش کارنامے انجام دیئے الیگزنڈر کی قابلیت اور وسیع النظری کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ اس نے اس زمانہ میں اس بات کی سفارش کی تھی کہ محکمہ تعلیمات کی ملازمت کو اس قابل بنایا جائے کہ اس میں قابل لوگ داخل ہو سکیں حالانکہ ۱۸۹۶ء میں I.E.S کا وجود ہوا لیکن اس سے بھی حالات میں تبدیلی نہیں ہوئی اس محکمہ کا جب ہم دوسرے محکموں سے مقابلہ کرتے ہیں تو ہم کو اس کی کسمپرسی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ انجینئرنگ، سول سروس، عدلیہ اور میڈیکل میں لاتعداد انگریز تھے جب کہ محکمہ تعلیم میں وہ آنا پسند نہیں کرتے تھے یہ حقیقت ہے کہ کسی بھی محکمہ کی کامیابی اور ناکامی اس کے اہل کاران پر ہوتی ہے اس سلسلہ میں گوکھلے کے الفاظ قابل غور ہیں (محکمہ تعلیم کے بارے میں)

Narrow, Bigoted, and in Expansive Rule of Experts."

اسی سلسلہ میں ۱۹۲۱ء میں Mayhew اپنے خیالات اس طرح بیان کرتا ہے۔

"Experience Secretary, After spending His Morning Energy on Finincial and Judicial files, Genenally Drafted His Educational Resolution with The Sinking sun."

اس سے تعلیم کی اہمیت اور افادیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس محکمہ کو آج کی طرح اس زمانہ میں بھی ایک بوجھ خیال کیا جاتا تھا۔ ہند و پاک کی تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ تمام انگریزی افسران نے اس کے لئے مل جل کر کام کیا ہو بلکہ اس کے برعکس محکمہ مال اور خزانہ ہمیشہ اپنے کو لاتعلق رکھنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

۷۔ Absence of Plan اس میں سب سے ضروری وجہ یہ بھی تھی کہ انہوں نے تعلیم کی منزل کا تعین نہیں کیا انہوں نے ہمیشہ Muddling Through ہی خیال کیا

کرزن نے بھی اپنی تقریر میں اس کا اعتراف کیا تھا وہ اس بات کے حامی تھے کہ ہندوستان میں وقتی طور کے لئے آئے ہیں چنانچہ اس دور میں وہ ایسے امور پر توجہ دیتے تھے جن کے نتائج ان کے دور میں ہی بار آور ثابت ہوسکیں اس وجہ سے وہ ہمیشہ ماضی اور مستقبل سے لاپرواہ رہے تعلیم ایسا کام ہے جس کے پھل اسی وقت نہیں پکتے جو افسر یا گورنر جنرل یہاں آتا تھا اس کو آئندہ کے لئے کسی لائحہ عمل کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ اس کے لئے گذشتہ اصلاحات یا امور کی تکمیل بھی ضروری نہیں تھی۔ اس لئے وہ نئے سرے سے کام شروع کرتا تھا۔ ہندوستان کی ہر پالیسی کی عمر زیادہ سے زیادہ دس سال اور کم از کم پانچ سال ہوا کرتی تھی۔ بھلا اتنے عرصہ میں کون سی اسکیم بار آور ثابت ہوسکتی ہے چنانچہ انگریزوں نے میکالے کے ہی نظریہ پر ہمیشہ عمل کیا اور جب وہ واپس گئے تو ہم کو نہایت ہی قابل افسوس حالت میں چھوڑا جس کی تلافی ابھی تک نہیں ہو پائی ہے۔

انگریزوں کے تعلیمی کارنامے

British Contrbution To Education.

ہر شخص کو اس کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے کہ انگریزوں نے ہندو پاکستانیوں کے لئے کچھ اچھے کام بھی انجام دیئے اور حقیقت بھی یہی ہے جہاں تک تعلیم کا سوال ہے تو اس میں بھی مندرجہ ذیل ان کے خاص کارنامے ہیں۔

۱۔ Introduction of English انگریزوں کا سب سے عظیم کارنامہ انگریزی زبان اور مغربی علوم کی اشاعت ہے مغلیہ خاندان کے دور سے ہی ہندوستان کا زوال شروع ہوگیا تھا انگریزوں کی آمد سے Thraloon of old Ideas World میں مدد ملی اور ان کے غلط ملط سے تہذیب و تمدن میں کافی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

۲۔ Science انگریزوں کی آمد سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ہندو جو اکثریت میں تھے اور بہت ہی دقیانوسی اور توہم پرست خیالات کے مالک تھے ان میں تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ زندگی میں سائنس کو مناسب مقام دیا گیا پرانے طریقوں کو بالائے طاق رکھ کر نئے طریقوں کو اپنایا گیا۔ گذشتہ طریقہ فرسودہ تھے جن میں لچک اور تنقید کی گنجائش

نہیں تھی اس لئے ان کی آمد سے ایک نئے فکر کی ابتدا ہوئی جس نے زندگی کے ہر پہلو کو بدل کر رکھ دیا۔

۲۔ Modern India یہ مسلمہ امر ہے کہ انہوں نے جدید ہندوستانی زبانوں پر توجہ نہیں دی لیکن یہ وہی تھے جنہوں نے جدید ہند کا نظریہ پیش کیا۔ افسروں، مشنریوں اور شوقین حضرات نے علوم شرقیہ کو پڑھا اور اس میں اضافے کئے انہوں نے قواعد کو مرتب کیا۔ لغتوں کو مرتب کیا اور چھاپہ خانہ کے استعمال سے تعلیم کو نئے موڑ پر لاکر کھڑا کیا۔ عہد عتیق پر بھی انہوں نے قابلِ فخر کارنامے انجام دیئے۔ اس سلسلہ میں سب سے اہم شخصیت Sir George Grierson کی تھی جس نے مایہ ناز Lingustic Survey of India کو جنم دیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جدید زبانوں کی ترقی و نشر و ترویج میں بھی یورپین کا بہت ہاتھ ہے۔

۴۔ Indian Arts ہندوستان کی مصوری، فنِ سنگ تراشی، فنِ عمارات میں بھی انہوں نے لاتعداد کارنامے انجام دیئے۔ کرزن کے احسانات سے ہم کسی طرح بھی سبکدوش نہیں ہو سکتے اس نے ہمارے ثقافتی ورثہ کو قائم رکھنے میں لاثانی کارنامے انجام دیئے محکمہ آثار قدیمہ کو قائم کر کے اس نے جو کچھ کیا ہے اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔

۵۔ Awakening مغرب سے تعلقات نے ہند و پاک میں مختلف نظریات کو جنم دیا چھوت چھات کا نظریہ، عورتوں سے برا سلوک، سماجی اور معاشرتی اصلاحات۔ یہ سب انگریزوں کی وجہ سے ہی ہوئیں ان کے علاوہ :۔

1. Modern Democratic Institutions of Europe
2. Western System of Law & Medecine
3. The Auxiliary System of Tools of Popular Education such as Press cinema, Radio, library and Museum.

[illegible] انگریزی [illegible] بہت مشکل ہے تاہم
حال مندرجہ بالا سطور سے اس سلسلہ میں تھوڑا بہت اندازہ لگایا جا سکتا ہے
لارڈ کرزن [illegible] نے ۱۹۰۴ء میں [illegible] خیالات کا اظہار [illegible]
[illegible]

باب ۱۲

مسلمان اور اصلاحی تحریکیں

[illegible] Muslim Reformation Movement [illegible]
[illegible] Muslim Renaissance [illegible]
[illegible] تحریکیں [illegible] ہیں [illegible]
[illegible] ہیں لیکن [illegible]
کہ انہوں نے اپنے وجود کو علیحدہ رکھا اگرچہ [illegible] کوشش
[illegible]
[illegible]

[illegible] لیکن پھر بھی مسلمانوں نے
اپنی ثقافت اور مذہب کی خصوصیات کو برقرار رکھا جس کی اہم وجوہات ان کی مذہبی
ثقافتی سماجی اور [illegible] اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مسلمانوں
کی حالت تیزی سے [illegible] سے
[illegible] ہندوستان [illegible] سکھوں اور مرہٹوں کی [illegible] کا شکار
بنا [illegible] یہ تو [illegible] تھے خود مسلمان
بھی [illegible] ایک دوسرے کے خون
سے ہولی کھیل رہے تھے نام نہاد علما فتنہ و فساد برپا کرنے میں پیش پیش تھے مسلمانوں
میں فرقہ وارانہ اختلافات پیدا کر کے [illegible] کتاب و سنت اور حدیث
و فقہ کے مسائل [illegible] آجاتی تھی
پر علما [illegible] اسلامی تعلیمات سے [illegible]
[illegible] قائم رکھنا [illegible]

اٹھارہویں صدی کے شروع میں مندرجہ بالا حالات تھے ایسے میں ایک زبردست

مصلح کی ضرورت تھی اللہ تعالیٰ نے اس کام کے واسطے ولی صاحب کو بھیجا جو فاروقی نسل سے تھے۔ آپ نے باہمی اختلافات کا خاتمہ کر کے اسلامی علوم کو جن پر ہوس پرستوں کا قبضہ تھا عوام کے لئے پیش کیا صدیوں کا جمود ختم ہو گیا۔ اور اسلامی روح پھر عود کر آئی۔

شاہ صاحب نے مسلمانوں کو تحت شزلت سے نکالنے کے لئے لاتعداد کام انجام دیئے انھوں نے سب سے بیشتر قرآن پاک کا فارسی میں ترجمہ کیا تاکہ ہر خاص و عام اس کے معانی و مطالب سمجھ سکے۔ تفسیر پر ایک رسالہ جس کا نام فوز الکبیر لکھا حدیث کی کتابوں میں آپ کو سب سے زیادہ امام مالک کی موطا پسند تھی جس کی آپ نے دو شرحیں مصفی اور مسوی لکھیں۔ ان کے علاوہ حجتہ اللہ البالغہ الخیر الکثیر، البدور البازغہ، ازالتہ الخفاعن خلافتہ الخلفاء وغیرہ کو تصنیف کیا۔

مسلمانوں کو راہ راست پر لانے کے لئے آپ نے علماء کی ایک جماعت بنائی اور مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لئے بہت سے مدارس بھی قائم کئے جن میں قابل بیان دارالعلوم دہلی مدرسہ نجیب آباد، نقیہ رائے بریلی، تھٹہ، اور مدرسہ محمد میاں ہیں۔ نجیب آباد کے مدرسہ میں کہا جاتا ہے کہ قریباً نو سو علماء درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے۔ جن کو پانچ روپیہ ماہوار سے پانچ سو روپیہ ماہوار تک مشاہرہ ملتا تھا اس طرح شاہ عبدالعزیز صاحب نے بھی ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔

ولی اللہ صاحب کے علاوہ شاہ عبدالعزیز، سید احمد شاہ، شاہ اسمٰعیل شاہد، مولانا عبدالحی، مولانا اسحاق، مولانا یعقوب، میر کرامت علی، حاجی شریعت اللہ وغیرہ نے بھی مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے کوششیں کیں۔ لیکن ان کو خاطر خواہ کامیابیاں نہ ہو سکیں۔

اس طرح مندرجہ بالا بزرگوں نے مسلمانوں کی اصلاحات کی ہر ممکن کوشش کی لیکن کچھ خاص وجوہات کی بنا پر ان کو خاطر خواہ کامیابیاں نہیں ہوئیں انگریزوں کے ظلم و ستم سے مجبور ہو کر مسلمانوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی شکل میں اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن آپس کی نااتفاقی انگریز اور ہندوؤں کی عیاریوں سے اس میں بھی ناکامی ہوئی۔

دارالعلوم دیوبند

DARUL ULOOM DEO BAND

پس منظر:

دارالعلوم دیوبند کا قیام حضرت شاہ ولی اللہ کی انقلابی فکر کا نتیجہ تھا جو حالات و واقعات کے پیش نظر عمل میں آیا۔ ۱۸۵۷ء تک اس تحریک کے حامیوں کا خیال تھا کہ وہ طاقت اور قوت کے ذریعہ مسلمانوں کے کھوئے ہوئے وقار کو واپس لا سکتے ہیں۔ لیکن جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد انھوں نے اچھی طرح اندازہ لگا لیا کہ کسی انقلابی تحریک کے لئے حالات سازگار نہیں ہیں اور وقت کی اہم ضرورت تحفظ فکر ہے۔ گویا ایک صدی کی جدوجہد کے بعد تحریک اسی مقام پر آگئی جہاں سے اس کا آغاز ہوا تھا اور پھر اس کے سامنے نئے حالات میں فکر کے تحفظ، تدوین اور اشاعت، جماعت کی تیاری اور پھر عملی میدان میں مصروف سعی ہونے کے مراحل تھے۔ چنانچہ پہلے مرحلے کا آغاز دارالعلوم دیوبند کے قیام سے ہوا۔

دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ۱۸۶۴ء میں مولانا فضل الرحمٰن اور مولوی ذوالفقار علی نے ڈالی تھی۔ لیکن اس کو شہرت عام اور بقائے دوام مولانا محمد قاسم کی وجہ سے ہوئی آپ شاہ ولی اللہ کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے تھے۔ جب کہ مولانا ذوالفقار علی صاحب انگریزوں کے محکمہ تعلیم کے نائب مہتمم رہ چکے تھے لیکن دینی خدمت کے جذبے اور انگریزوں کی عیارانہ پالیسی کی وجہ سے ملازمت کو خیرباد کہہ کر یہاں آگئے تھے۔

دارالعلوم کا آغاز ایک مسجد کے دالان سے ہوا۔ چند سالوں میں تشنگان علوم کی

تعداد بہت بڑھ گئی۔ اس لئے درس و تدریس اور اقامت خانے کے لئے جداگانہ عمارتیں بنانا پڑیں۔ مولانا محمد قاسم صاحب نے صدر مدرس کی حیثیت سے درس و تدریس کا کام شروع کیا۔ اور نہایت ہی قلیل عرصہ میں محنت اور کوششوں سے اس کو دارالعلوم کے درجہ تک پہنچا دیا۔ مدرسے کے مستقبل کے بارے میں ان کا توکل کچھ عجیب ہی شان و شوکت کا حامل نظر آتا ہے۔ مولانا کو یقین کامل تھا کہ جب تک آمدنی غیر یقینی رہے گی تب تک مدرسہ خدا کے بھروسہ پر چلتا رہے گا۔

دارالعلوم کا قیام

دیوبند ضلع سہارنپور میں ایک قصبہ کا نام ہے۔ جو یو۔ پی میں ہے۔ اس مقام کے نام پر ہی یہ دارالعلوم دیوبند کہلاتا ہے۔ اس سے پہلے اس کو مولانا محمد قاسم صاحب کے نام پر مدرسہ قاسم العلوم کہتے تھے۔ اس مدرسے نے ویسے تو ہر شخص نے ہی قابل تحسین کارنامے انجام دیے ہیں۔ لیکن ان میں مولانا فضل الرحمن۔ مولانا محمد حسین۔ مولانا ذوالفقار علی۔ مولانا محمد علی اور مولانا شاہ رفیع الدین کے نام مشہور و معروف ہیں۔

آج کل دارالعلوم میں ۳۰ بڑی درسگاہیں ہیں۔ چار سو حجرے اور آٹھ اقامت گاہیں ہیں۔ ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی ہے۔ انتظامی امور چار عہدے داروں کے ذمہ ہیں۔

۱۔ سرپرست ۲۔ مہتمم ۳۔ صدر مدرس ۴۔ مفتی

اس وقت دنیا میں چار بڑے دارالعلوم ہیں۔

۱۔ جامعہ ازہر ۲۔ جامعہ زیتون

۳۔ جامعہ تیونس ۴۔ جامعہ دیوبند

نصاب:

دارالعلوم دیوبند کا نمبر اسلامی یونیورسٹی میں چوتھا ہے۔ دیوبند کا

نصابِ تعلیم وہی ہے جو درسِ نظامیہ کا تھا۔ عربی، فارسی، قرآن، حدیث، طبِ یونانی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اب دستکاری، خوشنویسی اور جسمانی تربیت کا بھی معقول انتظام ہے۔ تبلیغ کی تعلیم پر بھی خاص توجہ دی جاتی ہے۔ یہیں پر تقلید کی روش سے ہٹ کر دین کے صحیح عقائد و اعمال واضح کئے جاتے ہیں۔ تصنیف اور تالیف پر بھی خاص توجہ دی جاتی ہے۔ ایک ماہانہ رسالہ "القاسم" بھی شائع ہوتا ہے۔ یہاں آج کل تقریباً دو ہزار طلبہ زیرِ تعلیم ہیں۔ ہندوستان کے علاوہ دیگر اسلامی ممالک مثلاً افغانستان، ایران، افغانستان وغیرہ سے بھی طلبہ آتے ہیں۔ بانی — مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اس دارالعلوم کے آٹھ اصول متعین کئے تھے جن کا اعادہ یہاں ضروری ہے۔

اصول

۱۔ آزادیٔ ضمیر کے ساتھ ہر موقع پر کلمۃ الحق کا اعلان کرنا۔

۲۔ عام مسلمانوں سے زیادہ سے زیادہ تعلق پیدا کرنا۔ تاکہ یہ خود بخود مسلمانوں میں نظم و ضبط پیدا کر سکے۔ مسلمانوں کو اسلام کی اصل روح سے روشناس کرانا تاکہ وہ اس پر عمل کر سکیں۔

۳۔ کارکنانِ مدرسہ اور مصنفین کی جماعت جملہ اخراجات سے محفوظ و مامون رہ کر دولتِ الٰہی سے ایک مدت سے عمل پیرا ہے۔

۴۔ خود رائی اور استبداد کے خلاف باہمی مشاورت سے اجتماعی اور جمہوری حیثیت کے ساتھ کام کرنے کا نمونہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جائے۔

مندرجہ بالا اصولوں کو ذہن میں رکھ کر مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تعلیم و تربیت پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا۔ کہ دارالعلوم دیوبند علومِ اسلامی کی ایک عظیم درسگاہ ہی نہیں بلکہ احیائے اسلام اور قیامِ ملت کی ایک عظیم الشان تحریک کا نام ہے۔ اصل میں دارالعلوم دیوبند

فکری انقلاب کا مرکز اور سیاست کی تربیت گاہ ہے۔ جس نے اسلام کے جاں نثاروں اور ملت کے غم گساروں کی ایک ایسی جماعت تیار کردی جس نے انگریزوں کے استعمار کو توڑ کر قوم کو ایک نئی راہ دکھائی۔ اس کے علاوہ اس نے علی گڑھ کے سیاسی ویرانے میں شمع آزادی بھی روشن کی اور قوم میں سیاسی بیداری بھی پیدا کی۔

دارالعلوم کے اکابر اور اس کے فرزند علمی و ادبی خدمت میں بھی پیش پیش رہے ہیں۔ اس کے بانیوں میں حاجی امداد اللہؒ اور مولانا قاسمؒ صاحب اردو کے بہترین ادیب اور صاحب تصنیف و تالیف تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے نام سے کون ہے جو واقف نہیں۔ ان کے علاوہ علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا سید محمد میاں۔ مولانا مناظر احسن گیلانی۔ مولانا حفظ الرحمٰن وغیرہ کی تحریریں عالمانہ اور محققانہ ہونے کے ساتھ ساتھ زبان و بیان اور اسلوب کے لحاظ سے بھی لاثانی ہیں۔

خدمات

دارالعلوم نے اپنے قیام سے سو سال کی مدت میں تقریباً سترہ ہزار مشائخ طریقت۔ مدرس۔ خطیب۔ مبلغ۔ مفتی۔ مناظر۔ مصنف۔ صحافی۔ طبیب اور ماہرین صنعت و حرفت پیدا کئے ہیں۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند میں ۱۹۶۵ء تک کے ایک جائزے کے مطابق تفصیل درج ہے

عالم و مدرس	۴۴۸	مصنف	۲۷۶
مفتی	۱۶۴	مناظر	۱۱۲
صحافی	۱۰۸	خطیب و مبلغ	۲۲۸
طبیب	۱۶۴	صناع و اہل حرفہ	۷۴۸

دارالعلوم دیوبند کا علمی اور دینی فیضان پاک و ہند سے گزر کر افغانستان۔ روس

چین۔ برما۔ ملائیشیا۔ انڈونیشیا۔ عراق۔ کویت۔ ایران۔ سیلون۔ جنوبی افریقہ۔ سعودی عرب۔ تھائی لینڈ۔ یمن وغیرہ تک جا پہنچا ہے۔ اس وقت پورے عالم اسلامی میں دار العلوم دیو بند کے تقریباً ستر ہزار فارغ التحصیل علماء موجود ہیں۔ جو اسلام کی خدمت میں دن رات معروف و مشغول ہیں۔

پالیسی

دیو بند نے کبھی بھی انگریزی حکومت کی امداد قبول نہیں کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے اساتذہ اور طلبہ نے ہمیشہ اپنی آزاد خیالی بحال رکھی۔ وہ حکومت برطانیہ کی پالیسیوں کے ہمیشہ سخت مخالف رہے اور انگریز دشمن جماعتوں سے مل کر ملک کی آزادی کی جنگ میں عملاً شامل رہے۔

دار العلوم دیو بند میں اسلامی نظام تعلیم رائج ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اسلامی تہذیبی قدروں کے تحفظ اور مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی بداخلاقی اور انگریزیت میں رنگ جانے سے بچانے کے جوش و خروش میں ان ضرورتوں کو بھی نظر انداز کر دیا گیا۔ جو حالات کی تبدیلی سے ہندوستان میں پیدا ہو گئی تھیں۔ ملک غیر ملکیوں کے آہنی شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ اسلامی قوانین۔ اسلامی روایات اور اسلامی نظم ملک سے ختم ہو چکے تھے۔ مسلمانوں پر روزی کمانے کے ذرائع مسدود ہو چکے تھے۔ اسلامی نظام تعلیم میں حالات کے مطابق تبدیلیوں کی ضرورت تھی جس سے مسلمانوں کو جدید علوم سے واقفیت حاصل ہوتی۔ جدید سائنس انھیں اصولوں پر مبنی ہے۔ جسے مسلمانوں نے چند صدی قبل معلوم کیا تھا۔ اُس زمانے میں اسلام اور طبیعیاتی علوم میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ اور تمام مدارس میں ان کی تعلیم دی جاتی تھی۔ آج بھی یہ مدرسے طبیعیات اور ریاضی وغیرہ علوم کی تعلیم دیتے ہیں لیکن ان کی شکل وہی ہے۔ لیکن گذشتہ سو سال میں ان علوم میں نا قابل بیان ترقی ہوئی ہے۔ دار العلوم دیو بند اگر ان علوم کو ترقی یافتہ شکل میں اپنے نصاب میں

داخل کرلیتا اور ان کی تعلیم دیتا تو وہ آج بھی دنیا پر یہ واضح کرسکتا تھا کہ اسلام اور جدید سائنس میں گہرا ربط ہی نہیں بلکہ حقیقت میں دونوں ایک ہی ہیں۔ اس کے علاوہ جدید سائنسی علوم سے کما حقہ واقف ہونے کی وجہ سے دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کو اپنے یہاں کی یونی ورسٹیوں میں داخلہ کے اہل قرار دیتے ہیں۔ (بجز انگلستان کے)

المختصر دارالعلوم دیوبند ایک قدیم طرز کی اسلامی درسگاہ ہے جس میں اسلامی علوم وفنون کی مخصوص انداز میں تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے فارالتحصیل ذہن وفکر اور اخلاق سیرت کے ان پیمانوں سے بہت بلند ہیں۔ جن کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ ان میں وسعت قلبی۔ بلند نظری۔ اعلیٰ ظرفی اور اخلاص وعمل کی زیادہ صلاحتیں ہوتی ہیں۔ کیوں کہ دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور حالات وقت کے مطابق دیوبند کے اکابر نے اپنے طلبہ کو جدید علوم وفنون کے مطالعہ وغور وفکر کی آزادی دے رکھی ہے۔ اور غیر نصابی مضامین کی حیثیت سے جدید علم ہیئت۔ فلسفہ۔ سائنس۔ اقتصادیات۔ معاشیات۔ سیاسیات سماجیات وغیرہ مضامین کے مطالعہ کی دعوت دی ہے۔ اس کے لاتعداد علماء وفضلاء نے ہر صنف ادب پر قلم اٹھایا۔ اور ایسی ایسی تصانیف پیش کیں۔ جو اگر ایک طرف اسلامی فکر کی حامل ہیں تو دوسری طرف ان کا علمی وفنی معیار بہت بلند ہے۔

تحریکِ علی گڑھ

ALIGARH MOVEMENT

پس منظر :

سید احمد خان دہلی کے ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ سید صاحب کے خاندان کے لوگ عہدِ مغلیہ میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ سید احمد کے والد میر متقی گوشہ نشین بزرگ تھے۔ اس لئے ان کی تعلیم و تربیت ان کی والدہ نے کی۔ دستور کے مطابق سید کی تعلیم کی ابتدا بھی قرآن پاک سے ہوئی جس کے بعد کچھ فارسی اور عربی کتب کا بھی مطالعہ کیا مروجہ علوم میں ریاضی اور طب میں دستگاہ حاصل کی۔

بائیس سال کی عمر میں کمپنی کی ملازمت اختیار کی۔ دوران ملازمت وہ صوبہ یو۔پی کے مختلف مقامات پر رہے۔ ۱۸۵۷ء میں وہ بجنور میں تھے۔ ملازمت کا آغاز سررشتہ دار کی معمولی ملازمت سے کیا۔ لیکن محنت۔ دیانت۔ شوق اور ذہانت کی وجہ سے منصف کے عہدے تک پہنچ گئے۔ ان کی خدمات کے صلے میں وائسرائے کی کونسل کی ممبری۔ پبلک سروس کمیشن کی ممبری اور کے۔ سی۔ ایس۔ آئی کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔

سید احمد کو یقین کامل تھا کہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم حاصل کرکے ہندوؤں کے شانہ بشانہ چلنا چاہیئے۔ چنانچہ انھوں نے برطانوی حکومت پر زور دیا کہ وہ مسلمانوں کی انگریزی تعلیم کا مناسب انتظام کرے۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے مسلمانوں کو بھی مشورہ دیا کہ وہ اپنی تعلیم کے لئے اسکول قائم کریں۔ اور اس میں دینیات

کو مناسب مقام دیں۔ ۱۸۵۸ء میں سید احمد خاں کا تبادلہ مرادآباد ہوگیا جہاں پر انھوں نے ایک انگریزی اسکول قائم کیا جس میں مسلمانوں کے علاوہ تمام فرقوں کو تعلیم حاصل کرنے کی آزادی تھی۔ ۱۸۶۳ء سید احمد خاں نے غازی پور میں ایک ادبی اور سائنٹی فک سوسائٹی قائم کی۔ تاکہ ہندوستانیوں میں سائنسی علوم سے دلچسپی پیدا کی جاسکے۔ ۱۸۶۶ء میں جب وہ علی گڑھ گئے تو سوسائٹی کا دفتر بھی وہیں پر منتقل ہوگیا۔

جس زمانہ میں سرسید بنارس میں تھے تو ان کو احساس ہوا کہ حکومت برطانیہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرنا چاہتی ہے۔ اس لئے ہندو اور مسلمانوں کا مل کر کوئی کام کرنا ناممکن ہے۔ سید احمد خاں کی ہر ممکن کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف راغب کیا جائے۔ لیکن ان کو ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھی بخوبی احساس تھا کہ زبان غیر میں تعلیم حاصل کرنا نقصان دہ ہوگا۔ اس لئے انھوں نے طے کیا کہ ایک ایسی یونی ورسٹی قائم کی جائے۔ جس میں تمام مضامین اردو میں پڑھائے جائیں چنانچہ ۱۸۶۷ء میں انھوں نے گورنر جنرل کو اس مقصد کے لئے ایک درخواست روانہ کی۔ جس کو خارج کردیا گیا۔

انگلستان سے واپس آکر سرسید احمد خاں نے ایک سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد مسلمانوں میں تعلیم پھیلانا تھا۔ انھوں نے ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں ایک انگریزی ماڈل اسکول قائم کیا جو دو سال بعد محمڈن اورینٹل کالج بن گیا۔ اور آخر کار ۱۹۲۰ء میں یہ اسکول ترقی کرتے کرتے یونی ورسٹی ہوگیا۔ ۱۸۷۶ء ریٹائرمنٹ کے بعد سرسید علی گڑھ میں آباد ہوگئے۔

انگریزوں کا سلوک مسلمانوں کے ساتھ نہایت ہی خراب تھا۔ کیوں کہ وہ مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ اور ان کو ہی جنگ آزادی کا ذمہ دار قرار دیتے تھے۔ چنانچہ سرسید نے ایک کتاب "اسباب بغاوت ہند" تحریر کی۔ جس میں مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کی غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

لیکن حالات بد سے بدتر ہو گئے۔ چنانچہ آپ نے کافی غور و فکر کے بعد ایک ہمہ گیر لائحہ عمل تیار کیا جس کے ذریعہ مسلمانوں کی تعلیمی۔ معاشرتی اور سیاسی فلاح و بہبود کے لئے کوشش کی۔ اس پروگرام کے مطابق تین منصوبے تیار کئے گئے:

۱۔ تعلیمی منصوبہ
۲۔ مذہبی اصلاح کا پروگرام
۳۔ معاشرتی اصلاح کا پروگرام

تعلیمی منصوبہ Educational Plan.

اس کا مقصد مسلمانوں کی مغربی علوم سے نفرت کو ختم کرنا تھا۔ سرسید نے ان کو علمی ورثہ کے بارے میں بتا کر وقت کے ساتھ چلنے کو کہا۔ آپ نے مسلمانوں کے لئے جو نصاب تعلیم مرتب کیا۔ وہ مسلمانوں کے قومی اور مذہبی جذبات کے شایانِ شان اور دورِ جدید کی ضرورت کے مطابق تھا۔ آپ نے مشرقی علوم کے ساتھ مغربی علوم اور مذہبی تعلیم دونوں کو نصاب میں جگہ دی۔ سرسید کا مقصد یہ تھا کہ مغربی علوم اور مذہبی تعلیم محض درس و تدریس تک ہی محدود نہ رہیں بلکہ عملی ہو۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔

"علی گڑھ کا فارغ التحصیل ایسی متوازن شخصیت کا حامل ہو جس کے ایک ہاتھ میں مشرقی علوم کا خزانہ اور دوسرے ہاتھ میں مغربی علوم کا خزانہ اور سر پر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِؐ کا تاج ہو گا"

طریق کار

سرسید نے ذاتی رجحانات کو وقعت نہ دی بلکہ سنہ ۱۸۷۰ء میں ایک کمیٹی تشکیل کی جس کا نام "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان ھند" رکھا ان سے مسلمانوں کی تعلیمی حالت پر انعامی مضامین لکھوائے۔ جن میں ان خیالات کا اظہار کیا گیا تھا کہ مسلمانان ہند تعلیم میں دوسری اقوام سے پس ماندہ کیوں ہیں۔ اس

کا علاج کیا ہے۔ ان مضامین سے مندرجہ ذیل باتیں واضح ہیں۔

۱۔ بیشتر مسلمان علمار انگریزی اور مغربی علوم کی تعلیم کو کفر خیال کرتے ہیں۔

۲۔ مسلمان طلبہ کی تعداد مدارس میں بہت ہی کم ہے۔

۳۔ مسلمان نئے نظام تعلیم سے مطمئن نہیں ہیں۔ اس لئے بچوں کو سرکاری اسکولوں میں نہیں بھیجتے۔

۴۔ جدید مدارس میں عربی اور مذہبی تعلیم کا فقدان ہے۔ لامذہبیت کے جذبات ابھارے جاتے ہیں۔

۵۔ انگریزی مدارس میں مسلمانوں کا عدم احترام

۶۔ حکومت ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے مسلمانوں کی مالی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ متوازی ادارے کھولنے کی ان میں ہمت نہیں۔

۷۔ مشنری اسکولوں کے عزائم خطرناک ہیں۔

یہ کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچی کہ :

۱۔ قوم خود ہی اپنے تعلیمی خزانوں کو محفوظ کرے۔

۲۔ علوم جدیدہ سے استفادہ کرے اور اپنی تعلیم کی فکر آپ کرے۔

کمیٹی کی اس رپورٹ میں اس کالج کی تعلیم۔ نصاب اور طریقہ تعلیم موجود تھا جو سرسید قائم کرنا چاہتے تھے۔

تحریک کے بنیادی اصول
Fundamentals of the Movement.

۱۔ مشرقی اور مغربی علوم کی آمیزش

۲۔ دینی تعلیم

۳۔ انگلستان کے پبلک اسکولوں کی روایات کو برقرار رکھنا۔ سرسید ۱۸۶۹ء میں انگلستان گئے وہ وہاں کے نظام تعلیم سے بہت متاثر تھے۔

اپنے قائم کردہ اسکول میں سرسید نے آکسفورڈ اور کیمبرج کے طریقہ ہائے

تعلیم کو رائج کیا۔ انھوں نے کھیلوں کا بھی خاص انتظام کیا۔ اور طلبہ کے لئے یونین اور سوسائٹیاں بھی قائم کیں۔ تاکہ جمہوری اقدار قائم کی جاسکیں۔ انھوں نے طلبہ کے لئے اسکول میں ہاسٹل بھی قائم کیا۔ اس طرح سرسید کا قائم کردہ ماڈل اسکول برصغیر میں پہلا رہائشی اسکول تھا۔ اور اپنی مثال آپ تھا۔ جو تعلیم کے ساتھ ساتھ طالب علم کی شخصیت۔ کردار۔ اور معاشرتی تربیت کو بھی پیش نظر رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ طلبہ میں قومی جذبہ پیدا کرنا بھی اس کا مقصد تھا۔ سرسید نے جو خدمات سیاست اور علم ادب میں انجام دیں ان کا اثر لامحالہ ادارے کے طلبہ پر بھی پڑا۔ غرضیکہ آپ نے مسلمانوں کے لئے ایسی تعلیم کی بنیاد ڈالی جس کو حاصل کرکے مولانا محمد علی جوہر جیسے مذہب کے شیدائی اور محب وطن پیدا ہوئے۔ مسلمان نوجوانوں کے دل و دماغ مشرقی اور مغربی علوم سے روشن اور منور ہوئے۔ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ سارے ہندوستان میں چمکنے لگے۔ اور مسلمانوں کی کھوئی ہوئی عزت و عظمت اور روایات کی یاد تازہ ہوگئی۔ یہ علی گڑھ کالج یونیورسٹی اور دیگر اسی قسم کے فرزندوں کا ہی کام تھا کہ ہمارے لئے ایک الگ وطن پاکستان وجود میں آیا۔

سرسید کی اسکیم پر تنقید
Comments on Sir Syeds' Scheme

۱۔ بعض لوگ مثلاً نواب سمیع اللہ خاں وغیرہ سرسید احمد خاں کی اسکیم سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ اور ان کے ساتھ کام کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ان لوگوں کا خیال تھا۔ کہ اگر مسلمان اپنے ادارے الگ قائم کریں گے تو بہت سی دشواریاں پیدا ہوجائیں گی۔ کیوں کہ اس طرح مسلمان ان سہولتوں سے محروم ہوجائیں گے۔ جو حکومت سرکاری اداروں کو مہیا کرتی ہے۔

۲۔ تعلیمی تحریک کے ساتھ ساتھ سرسید نے اسلام کو سائنٹفک مذہب کی حیثیت سے پیش کرنے کا بھی منصوبہ بنایا۔ یعنی مذہب کو سائنس کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے اکثر علما ارکان سے

اختلاف ہوگیا۔ اور اس اختلاف کو جو سر سید سے ذاتی نوعیت کا تھا۔ ان کی تعلیمی تحریک کی طرف کر دیا گیا۔ ویسے بالغ النظر علماء انگریزی تعلیم کے مخالف نہیں تھے لیکن آپ کے معاشرتی اصلاحی پروگرام۔ لباس وغیرہ کی وجہ سے آپ کے سخت مخالف ہو گئے۔

۳۔ ڈاکٹر لیٹنس جو اورنٹیل کالج کے پرنسپل تھے۔ انھوں نے مشرقی علوم کی یونی ورسٹی کے لئے جدوجہد جاری رکھی جس کا مرکز وہ اپنا کالج بنانا چاہتے تھے۔ سرسید نے اس کی مخالفت کی۔ کیوں کہ اس سے مسلمانوں کی توجہ مغربی علوم اور سائنس سے ہٹ جاتی۔ لہذا انھوں نے اخبارات میں مضامین کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس سے سرسید کی مخالفت میں مزید اضافہ ہوا۔

۴۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ سرسید نے پوری قوم کے لئے نظام تعلیم جاری نہیں کیا ہے بلکہ ایک خاص طبقہ یعنی اعلیٰ طبقہ ہی اس سے مستفید ہو سکتا ہے۔

۵۔ سرسید کا تمام علمی اور ادبی پلان وکٹورین انگلینڈ سے حاصل شدہ تھا آپ نظریہ تقاطر (Filteration) کے حامی تھے۔ آپ نے مسدس حالی کے ذریعہ "ادب برائے زندگی" ہی نہیں بلکہ "ادب برائے قومی زندگی" پیش کیا۔ یہ اعتراض کسی حد تک قابل قبول ہے لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ سرسید کے وسائل اس وقت بہت محدود تھے۔ اور اس طرح وہ ساری قوم کے لئے تعلیمی پروگرام چلانے سے قاصر تھے۔ ویسے ان کے تعلیمی منصوبے میں تعلیم کا ایسا ہمہ گیر نظام موجود ہے جس میں عوام۔ تعلیم بالغاں۔ صنعتی و زراعتی تعلیم اور تعلیم نسواں کو مساوی مقام دیئے گئے تھے۔

۶۔ سرسید تعلیم اور قومی زندگی میں ربط قائم کرنے کے حق میں تھے۔ وہ اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ ذہنیت اور قومی زندگی میں انقلاب کی ضرورت ہے اور یہ انقلاب بذریعہ تعلیم ہی لایا جا سکتا ہے۔ اس لئے انقلابی تحریک کا رخ تعلیمی دائروں سے قومی زندگی کی سمت آسانی سے پھیرا جا سکتا ہے۔ اسی اصول کی

بنیاد پر انھوں نے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی تھی۔ انھوں نے علی گڑھ میں زندگی کے ہر پہلو کو بہتر بنانے کے لئے کچھ ادارے اور کچھ کام والے لوگ تیار کئے اور ان کے ذریعہ انھوں نے تعلیم اردو زبان اور ادب۔ اسلامی تاریخ۔ اسلامی تمدن۔ سائنسی رجحانات اور معاشرتی اصلاحات کا کام شروع کیا۔

۷۔ سرسید کی کوششوں سے ملک کے ہر حصے سے طلبہ علی گڑھ میں حصول تعلیم کے لئے آنا شروع ہوئے۔ کالج میں انگریز اور ھندوستانی دونوں بحیثیت اساتذہ مقرر کئے گئے۔ انھوں نے سرسید کے جوش عمل سے متاثر ہو کر خود ایک ولولے اور جذبے کے تحت کام شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قلیل عرصہ میں علی گڑھ مسلم تعلیم اور ثقافت کا مرکز بن گیا۔

۸۔ حقیقتاً سرسید کی نگاہ میں اس کالج کا تخیل کچھ اور تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ علی گڑھ کو مسلمانوں کا ایسا تعلیمی مرکز ہونا چاہیئے۔ جہاں وہ اپنی تعلیم کا انتظام اپنے قومی کردار وافکار کے مطابق اپنے ہاتھوں سے کریں۔ اور غیروں کو اس میں دخل اندازی کی مطلق اجازت نہ ہو۔

۹۔ سرسید علی گڑھ کو محض کالج یا یونی ورسٹی کی شکل دینا ہی نہیں چاہتے تھے بلکہ اس کو مسلمانوں کی تعلیمی۔ سیاسی۔ معاشرتی۔ تمدنی۔ گویا کہ ہر قسم کی اصلاح کا مرکز بنانا بھی چاہتے تھے۔

۱۰۔ اپنے مقصد میں کامیابی کے لئے وہ چاہتے تھے۔ کہ نصاب تعلیم میں ایسی ترمیمیں اور طریقہ ہائے تدریس میں ایسی چاشنی وجاذبیت ہو جو طلبہ میں صرف ڈگریاں لینے کا شوق پیدا نہ کرے۔ بلکہ قومی فلاح وبہبود کے جذبے کے تحت حصول تعلیم پر آمادہ کرے۔

آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس

All India Educational Conference

سرسید احمد خاں نے ۱۸۸۶ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو

قائم کیا اس کا مقصد مسلمانوں کے سیاسی معاشی اور ملی مسائل کو طے کرنا تھا۔ مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو انگریزی زبان اور جدید علوم و فنون کی تحصیل کو اسلام کی تعلیمات کے خلاف سمجھتا تھا یہی طبقہ سرسید کی کوششوں کی مخالفت زور شور سے کر رہا تھا۔ اس لئے سرسید نے مدرسۃ العلوم کے قیام کے ساتھ لوگوں میں انگریزی تعلیم کی مخالفت دور کرنے، حصول تعلیم پر آمادہ کرنے اور اس خیال کے پیش نظر کہ ایک مدرسۃ العلوم پورے ملک کے مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کے لئے ناکافی تھا ایک ایسی تحریک کی ضرورت محسوس کی جس کے ذریعہ ملک کے طول و عرض میں جدید علوم کے مدارس قائم کئے جائیں۔ چنانچہ مسلمانوں میں تعلیم کی اہمیت کا احساس پیدا کرنے اور پورے ملک میں مدارس کے قیام کے لئے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے ایک تحریک شروع کی اس کانفرنس کے خاص خاص مقاصد حسب ذیل تھے۔

۱۔ مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو اعلیٰ درجہ تک پہنچانے کی کوشش کرنا۔
۲۔ مسلمانوں کی تعلیم کے لئے جو انگریزی مدرسے مسلمانوں کی طرف سے کھولے جائیں۔ ان میں مذہبی تعلیم کو داخل کرنا۔
۳۔ علوم مشرقی اور دینیات کی تعلیم جو علمائے اسلام جابجا اپنے طور پر خود دیتے ہیں اس کو تقویت پہنچانا اور اس کو قائم رکھنے کے لئے مناسب تدبیریں عمل میں لانا۔
۴۔ جو تعلیم قدیم طرز پر دیسی مکتبوں میں جاری ہے۔ اس کے حالات کی جانچ پڑتال کر کے اس کی ترقی و توسیع کے لئے کوشش کرنا۔
۵۔ قرآن خوانی اور حفظ قرآن کے لئے جو مکتب جاری ہیں اور جن کی حالت روز بروز گرتی جارہی ہے ان کو قائم رکھنے کے لئے تجاویز مرتب کر کے ان پر عمل پیرا ہونا۔

مندرجہ بالا مقاصد کی انجام دہی کے لئے دو طریقے تجویز کئے گئے۔

۱۔ ہر سال کسی مقام پر جہاں کے ممتاز اشخاص کانفرنس کے اجلاس کی

خواہش کریں اور اس کا انتظام اپنے ذمہ لیں۔ کانفرنس کا اجلاس ہوا کرے اور اجلاس کی تاریخوں میں کانفرنس کے ممبر جو تجویزیں مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے لئے مناسب خیال کریں۔ ان کو اجلاس میں پیش کریں اور پھر بحث و مباحثہ کے بعد ان کی منظوری یا نامنظوری عمل میں آئے۔

۲۔ جہاں تک ممکن ہو ہر شہر اور قصبے میں کانفرنس کے مقاصد کے لئے کمیٹیاں قائم کی جائیں۔ اور جہاں جہاں اسلامی انجمنیں قائم ہیں۔ اگر وہ منظور کریں تو انھیں کو کانفرنس کی کمیٹیاں تصور کیا جائے۔ تاکہ یہ کمیٹیاں اپنے اپنے شہر و قصبے کی تعلیمی کوائف لکھ کر کانفرنس کے جلسوں میں بھیج دیا کریں۔ اور جو تجاویز کانفرنس میں منظور ہوں ان کو اپنے یہاں جاری کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔

اس طریقہ کار کی وجہ سے کانفرنس کے جلسے مختلف شہروں میں ہونا شروع ہوئے اور چند ہی سالوں میں مسلمانوں میں اپنی اصلاح اور تحصیل علم کی زبردست تحریک شروع ہو گئی۔ سرسید جہاں کانفرنس ہوتی تھی خود جاتے اور ہر چیز کو دیکھتے اور کانفرنس کی کارروائی کو بھی مرتب کرتے تھے۔

سرسید کی کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ کانفرنس برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں میں قومی و اجتماعی شعور و ہم آہنگی کا وہ صور پھونکا کہ پورا ملک خواب غفلت سے بیدار ہو گیا۔ اور بنگال سے سرحد اور پنجاب سے مدراس و دکن تک مسلمانوں میں قومی و اجتماعی تعلیم و ترقی کا احساس پیدا ہو گیا۔

ایجوکیشنل کانفرنس کی کوششوں سے مختلف شہروں میں اسلامیہ ہائی اسکول قائم ہوئے۔ مثلاً اسلامیہ کالج پشاور۔ محمڈن عریبک اسکول پٹنہ، اسلامیہ انٹر کالج اٹاوہ۔ بدایوں۔ بریلی اور میرٹھ وغیرہ کے اسلامیہ کالج اسی تحریک کا نتیجہ تھے۔ اور پھر علی گڑھ یونیورسٹی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی اور عثمانیہ یونیورسٹی کی شکل میں نمودار ہوئیں تحریک ندوۃ العلماء۔ انجمن حیات الاسلام (لاہور) مدرسہ احمدیہ آرہ (بہار) جیسے

مذہبی ادارے اسی تحریک کی وجہ سے منظر پر آئے۔
انجمن ترقی اردو ۱۹۰۳ء میں ایک شعبے کی حیثیت سے قائم ہوئی۔ اور ۱۹۱۲ء میں اس نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کی قیادت میں ایک مستقل ادارہ کی حیثیت اختیار کر لی۔ اسی کانفرنس کے ایک اجلاس میں جو ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں نواب محسن الملک کی زیر صدارت ہوا تھا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ جس کی کوششوں سے بالآخر ۱۹۴۷ء میں پاکستان وجود میں آیا۔
ایجوکیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے اردو کی ترویج و ترقی کے لئے ہر ممکن کوشش کی گئی۔ سرسید تو آخری ایام تک اسی تگ و دو میں لگے رہے۔ اور ان کے جانشین نواب محسن الملک نے تو گورنر یو۔پی تک سے ٹکر لے لی۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ صوبہ بمبئی میں اردو سیکنڈ زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لی گئی۔
کانفرنس کے اجلاس کراچی ۱۹۰۷ء۔ راول پنڈی ۱۹۱۴ء۔ خیر پور ۱۹۱۹ء اور لاہور ۱۹۳۶ء کی بدولت سندھ۔ سرحد اور بلوچستان میں بھی اردو کا کام زور شور سے ہوا۔ کثرت سے اردو مدارس قائم ہوئے۔ رسائل نکالے گئے اور ان علاقوں کے شعراء اور مصنفین نے اردو کے لئے جو کام کئے وہ اردو ادب میں روشن باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ایجوکیشنل کانفرنس کا صرف یہی کارنامہ نہیں کہ اس کے ذریعہ مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ۔ جدید علوم و فنون کی تحصیل اور انگریزی زبان سیکھنے کا احساس پیدا ہوا۔ بلکہ کانفرنس نے ایک ایسا پلیٹ فارم بھی مہیا کیا جس پر جمع ہو کر مسلمان رہنماؤں نے مسلمانوں کے ملی۔ سیاسی اور سماجی مسائل پر غور و خوض کیا جس سے مسلمانوں میں قومی اور ملی شعور بیدار ہوا۔ کانفرنس نے مسلمانوں کی ہر شعبہ زندگی میں رہنمائی کی، زبان کو ترقی دی۔ اس کو ایک ادبی زبان کے درجہ پر پہنچایا۔ تصنیف و تالیف کا ذوق پیدا کیا۔ خطابت۔ شاعری اور قومی شاعری میں نیا انداز پیدا ہوا غرض مسلمانوں کی ادبی۔ تعلیمی۔ تہذیبی۔ سیاسی زندگی اور

ذہن وفکر میں کانفرنس کی بدولت انقلاب پیدا ہوگیا۔ مسلمانوں کی تعلیم سے بہرہ مندی اور جدید علوم وفنون میں ان کی ترقی درحقیقت آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی رہین منت ہے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے نصف صدی سے زیادہ تعلیم وثقافت اور زبان وادب کے میدان میں جو خدمات انجام دی ہیں۔ وہ برصغیر پاک وہند میں مسلمانوں کی تعلیمی وثقافتی تاریخ کا ایک اہم روشن باب ہے۔ پاکستان کا وجود بھی حقیقتاً سرسید کے خواب کی تعبیر ہے۔ المختصر سرسید کی خدمات لاتعداد ہیں۔ جن کو قلم بند کرنا ناممکن نہیں۔ تو مشکل ضرور ہے ہم نے مندرجہ بالا سطور میں مختصراً ایک خاکہ پیش کر دیا ہے۔ تاکہ ناظرین کو سرسید کے بارے میں تھوڑا بہت تو معلوم ہو سکے۔

سرسید کی ادبی خدمات

Sir Syed's Literary services

سرسید نے اردو ادب کی بہت خدمت کی وہ خود اچھے نثرنگار تھے۔ اور انھوں نے بہت سے نثرنگار پیدا کئے جنھوں نے اردو کو پاکیزہ صحیح۔ علمی اور اُردو کو ہی ذریعہ تعلیم بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اردو نثر میں مولوی نذیر احمد مولوی چراغ علی۔ ذکاءاللہ شبلی اور مولانا حالی جیسے تحریک کے حامی تھے نواب محسن الملک اور وقار الملک جیسے نثرنگار۔ نذیر احمد صاحب پہلے اردو ناول نویس ہیں۔ ان لوگوں نے سماجی اور تعلیمی اصلاحات کے لئے قلم اٹھایا۔ مولانا حالی نئی پاکیزہ شاعری کے محرک ہیں۔ آپ ہی نے پرانی شاعری کو نئے قالب میں ڈھال کر ایک نئے تنقیدی رنگ سے پیش کیا۔ "مقدمہ شعروشاعری" اس کی روشن دلیل ہے۔ آپ نے مسدس حالی کے ذریعہ ادب برائے زندگی ہی نہیں بلکہ ادب برائے قومی زندگی پیش کیا۔ تاریخ میں سرسید۔ مولانا شبلی اور مولانا ذکاءاللہ کے نام نامی ہمیشہ زندۂ جاوید رہیں گے۔

سرسید نے ایک رسالہ "تہذیب الاخلاق" بھی جاری کیا۔ جس کے ذریعہ آپ

نے مغربی تعلیم کی تبلیغ شروع کی۔ قدامت پسند طبقے نے سرسید کی مخالفت کی لیکن آپ مایوس نہ ہوئے۔ آپ نے مسلمانان ہند۔ پیغمبر خدا کی سوانح حیات۔ دہلی دربار۔ آثار قدیمہ کی تاریخ جیسے مقالے تحریر کئے۔ اور قرآن پاک کی تفسیر بھی لکھی۔

سرسید اور ان کے رفقار کار نے مضمون نویسی کی نئی طرز قائم کی شبلی نعمانی نے تاریخ اسلام اور تنقیدی ادب کی ابتدا کی سائنس کی ترقی کے لئے اردو کو اس قابل بنا دیا کہ اس کا اظہار جدید سائنسی علوم میں ہو سکے۔ اسی کام کے لئے انھوں نے علی گڑھ سوسائیٹی بھی قائم کی۔ ان تمام کاموں کا مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح اور سیاست پر بڑا گہرا اثر پڑا۔

جدید تعلیمی اداروں اور متعدد مسلمان مصنفین کے ذریعہ ایک نیا انقلاب ظہور پذیر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید کو پاک و ہند میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا بانی کہا جاتا ہے جو بالکل صحیح ہے۔

آپ نے مسلمانوں میں جدید تعلیم کا آغاز کر کے ہندو پاکستانیوں کو مغربی علوم سے روشناس کرایا ہمارے خیال میں سرسید نے علی گڈھ یونیورسٹی کو قائم کیا اور علی گڈھ یونیورسٹی کے فرزندوں نے پاکستان قائم کیا جو عالم اسلام میں سب سے بڑی مملکت ہے۔ C.F. Andrews ان کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

"There Are Few More Impressive Facts in Modern History Than This Conversion of A Great People in a Single Genertion By The steady Pressure of Higher Education combined with The Influence of A Commanding Personality

H. V. Hampton - Biograghical Studies in India Education P. 237.

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو

DARUL ULOOM NIDVATUL ULEMA

پس منظر :

ندوۃ العلماء کی تحریک مولانا سید محمد علی مونگیری جو مولانا لطف اللہ کے شاگرد اور حضرت شاہ فضل الرحمان کے خلیفہ تھے نے ۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیض عام کان پور کے ایک سالانہ جلسہ میں اس مدرسہ کے فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کے موقع پر پیش کیا جس کے دو بنیادی مقاصد تھے۔ پہلا دفع نزاع باہمی اور دوسرا اصلاح طریقہ تعلیم۔ اس جلسہ میں جو باکمال حضرات شریک تھے ان میں مولانا لطف اللہ علی گڑھی۔ مولانا حافظ شاہ محمد حسین الہ آبادی ۔مولانا اشرف علی تھانوی۔ مولانا محمد خلیل۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری۔ مولانا نور محمد پنجابی مولانا احمد حسن کان پوری۔ مولانا سید محمد علی۔ مولانا محمود الحسن ۔ مولانا شاہ سلیمان پھلواروی۔ مولانا حکیم سید محمد ظہور الاسلام فتح پوری وغیرہ شامل تھے۔ اس فہرست سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ جلسہ پورے ملک کے مسلمانوں کی نمائندگی کر رہا تھا۔

اصول :

اس تحریک کے سلسلہ میں سید ابو الحسن علی ندوی فرماتے ہیں :

(۱) "اس تحریک کی اساس خالص دینی تھی یعنی اس میں مسلمانوں کے تنزل کا اصل سبب دین سے انحراف اور صحیح دینی تعلیم سے محرومی کو قرار دیا گیا

تھا۔ اور اسی کو ملت کے درد کا مداوا اور اصلاح و ترقی کا واحد راستہ تسلیم کیا گیا تھا۔)

(۲) (اس تحریک میں طبقہ علما کو مرکزی مقام دیا گیا تھا۔ اور اسی کو امت کی تعمیر و تخریب، ترقی و تنزلی اور اصلاح و افساد کا اصل ذمہ دار قرار دے کر اپنی دعوت و جد و جہد کا محور بنایا گیا ہے کہ امت میں اصلاح حال کی کوئی کوشش حقیقی طور پر اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک علماء اس کے داعی اور علم بردار نہ بنیں۔ اور ان میں امت کی رہنمائی و قیادت کی صلاحیت پیدا نہ ہو۔

(۳) اس تحریک کا اولین بنیادی مقصد رفع نزاع باہمی تھا۔

(۴) اس تحریک کا مزاج علمی و فکری تھا۔

(۵) ندوۃ العلماء کی تحریک کا آغاز ہی اصلاح و ترقی نصاب کے کام سے ہوا تھا۔

(۶) انگریزی زبان اور بقدر ضرورت جدید علوم کو نصاب میں داخل کیا جائے اور ان کو دینیات اور عربی علوم و فنون کے ساتھ پڑھایا جائے۔

(ندوۃ العلماء کے قیام کا مسلمانوں میں گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا مختلف اسلامی اور قومی انجمنوں نے تائیدی تجویزیں اور ریزولیوشن بھیجے۔ مختلف اضلاع نے سپاس نامے پیش کئے۔ ملک کے ہر کونے سے تحسین و آفرین کے پیغامات موصول ہوئے قدیم تعلیمی اور دینی حلقوں اور نامور اساتذہ اور علماء نے تائید کی۔ علی گڑھ کے جدید تعلیمی حلقوں میں جس کے صدر نواب محسن الملک اور جسٹس محمود تھے اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ اور اس کو مسلمانان ہند کے حق میں فال نیک اور قدیم و جدید حلقہ کے درمیان ذریعہ وصل و قرب قرار دیا گیا۔ جگہ جگہ سے وفود آئے۔ اور ندوۃ العلماء کا تعارف کرانے کی دعوت دی گئی۔

۲۵ دسمبر ۱۸۹۵ء کو مولانا سید عبدالحئی مددگار ناظم مقرر ہوئے تو انھوں

نے سید محمد علی ناظم ندوۃ العلمار کی قیادت میں ندوۃ العلمار کے تبلیغی وفد کے ساتھ ۱۱ر جنوری ۱۸۹۶ء میں فتح پور ہسوہ اور رائے بریلی کا دورہ کیا۔ اس دورہ میں مولانا سید عبدالحیؒ نے نزاع باہمی۔ رسوم قبیحہ کے انسداد اور مدارس کے احیار و ترقی پر پُراثر تقریریں کیں۔ اسی طرح انھوں نے اکثر دورے کئے۔ جس سے ندوۃ العلمار کو بہت فائدہ پہنچا۔

تنظیم :

۲ر ستمبر ۱۸۹۸ء کو ندوہ کا دفتر کان پور سے لکھنؤ منتقل ہو گیا۔ ۱۹۰۵ء میں نظامت کا کام تین معتمدیوں میں تقسیم ہو گیا۔:-

(۱) معتمدی مراسلات و دفتر مولانا عبدالحیؒ کے سپرد ہوا۔

(۲) صیغۂ مال یعنی ندوہ کے مالی امور کا انصرام۔ مداخل و مخارج (آمدنی اور خرچ) کی نگرانی اور بجٹ وغیرہ کی تیاری منشی محمد احتشام علی رئیس کاکوری کے سپرد ہوا اور وہ معتمد مال کہلائے۔

(۳) دارالعلوم کے تعلیمی مسائل کا انصرام۔ تعلیمی نگرانی اور طلبہ و مدرسین سے تعلق رکھنے والے امور کی انجام دہی شمس العلمار مولانا شبلی نعمانی کے سپرد کی گئی اور ان کو معتمد تعلیمات کا لقب دیا گیا۔

اپریل ۱۹۰۵ء مولانا شبلی خاتون منزل گولہ گنج لکھنؤ منتقل ہو گئے ان کی تربیت سے مولانا سلیمان ندوی۔ مولانا عبدالسلام ندوی۔ مولانا عبدالباری ندوی۔ مولانا مسعود علی ندوی۔ مولانا اکرام اللہ خاں ندوی۔ حاجی معین الدین ندوی وغیرہ نامی نامی ہستیاں منظر عام پر آئیں جو اپنی اپنی صلاحیتوں اور ذوق کے مطابق نمایاں اور مشہور ہوئے۔ ان سے اشاعت اسلام کی تحریک میں بھی جان پیدا ہوئی۔

(۱۹۰۸ء میں گورنمنٹ نے مبلغ پانچ صد روپے ماہوار کی امداد منظور کی۔ بھوپال اور دوسری ریاستوں نے ماہانہ رقوم مقرر کیں۔ نامور اساتذہ مثلاً مولانا

محمد فاروق چریاکوٹی۔ مولانا شیر علی۔ شیخ محمد طیب مکی رام پوری اور مولانا عبد اللہ ٹونکی جیسے ماہرین تعلیم کا تقرر ہوا۔ جدید نصاب کا اجراء اور انگریزی تعلیم کا بھی انتظام ہوا۔ دارالعلوم کے لئے حکومت نے ایک وسیع آراضی عطا کی۔ اور درس گاہ کی تعمیر کے لئے ۲۸ نومبر ۱۹۰۸ء کو ایک عظیم الشان جلسہ سنگ بنیاد منعقد ہوا۔ جس کی بنیاد کی رسم سر جان ہیوٹ لفٹیننٹ گورنر صوبہ متحدہ کے ہاتھوں انجام پائی۔ نواب والی ریاست بھاولپور نے تعمیر کے لئے پچاس ہزار روپیہ کا عطیہ دیا۔

دارالعلوم ندوہ کی اصل غرض مولانا شبلی کی نظر میں یہ تھی کہ اس کی تعلیم و تربیت خاص طرح کی ہو۔ یعنی

"اس کے تعلیم یافتہ ادب اور عربی میں ماہر ہوں۔ عقائد اسلام کو جدید فلسفے کے مقابلے میں ثابت کر سکتے ہوں۔ روشن خیال اور وسیع المعلومات ہوں۔ قرآن مجید کے حقائق اور اسرار پر ان کی نظر ہو۔ عربی میں تحریر و تقریر کر سکتے ہوں۔"

نصاب :

ندوہ کے نصاب تعلیم کو اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ اس میں اصلی دینی علوم یعنی قرآن پاک۔ احادیث نبوی۔ فقہ۔ تاریخ اسلام۔ اسرار شریعت اور تصوف کی صحیح اور اعلیٰ فہم پیدا ہو سکے اور ان پر عمل کرنے کا جذبہ بھی پیدا ہو۔ اس کے علاوہ بقدر ضرورت انگریزی اور حکومت کی سرکاری زبان ھندی کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

خدمات :

ندوۃ العلماء کی خدمات کا اعتراف برصغیر کے تمام اکابر نے کیا ہے لیکن ہم یہاں پر صرف رام بابو سکسینہ کے چند جملوں پر اکتفا کر رہے ہیں۔

"ندوۃ نے یہ بڑا کام کیا کہ علوم عربیہ اور اسلامی تہذیب کو دنیا کے سامنے صحیح طور پر پیش کیا قیمتی قلمی اور نیز ہزارہا مفید مطبوعہ کتابیں جمع کر کے ایک اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ قائم کیا مسلمانوں کے عہد میں ہندوستان کے متعلق جو تاریخی غلطیاں لوگوں میں مشہور ہو گئی تھیں ان کو دفع کیا........ اسلامی علوم اور تمدن کا ایک مرکز قائم کیا۔ جس کا اثر دور دراز کے ممالک پر بھی پڑا۔"

انگلستان کی مشہور یونی ورسٹیوں آکسفورڈ اور کیمبرج کے تعلیم یافتہ اصحاب جس طرح اپنے نام کے بعد "آکسن" اور "کینٹ" لگاتے ہیں اسی طرح ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل اپنے نام کے آخر میں "ندوی" کا اضافہ کرتے ہیں۔ تاکہ لوگوں کو اندازہ ہو سکے کہ وہ لوگ ندوۃ العلماء کے طلبہ رہ چکے ہیں۔ نوجوان کے لئے باعث افتخار ہوتا ہے۔

ندوہ کی موجودہ عمارت لکھنؤ میں دریائے گومتی کے کنارے ایک وسیع اور پر فضاء مقام پر ہے۔ جس میں ایک مسجد اور دو دارالاقامہ ہیں۔ شبلی دارالاقامہ جس میں بڑی عمر کے طلبہ رہتے ہیں اور دوسرا دارالاقامہ سلیمانی جس میں کم سن بچے رہتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے لئے دارالعلوم کا چار سالہ مکتب بھی دارالعلوم کی عمارت میں ہے۔ ایک قیمتی کتب خانہ بھی ہے۔ جس میں قریباً چالیس ہزار کتابیں ہیں۔ جن میں بہت سی نایاب اور لاجواب ہیں۔

جامعہ ملیّہ اسلامیہ دہلی

JAMIA ISLAMIA DELHI

پس منظر

سرسید نے جس مقصد کے لئے علی گڈھ میں کالج قائم کیا تھا۔ وہ مقاصد اس سے پورے نہ ہو سکے اور یہ کالج صرف سرکاری ملازمت دلانے کا ذریعہ بن کر رہ گیا۔ اس طرح وہاں پر روحانی۔ ذہنی اور مادی خرابیاں پیدا ہو گئیں اور رفتہ رفتہ یہ خیال پیدا ہونے لگا۔ کہ یہ کالج قوم کی اصلاح و ترقی کے لئے ناکافی ہی نہیں بلکہ بے کار ہے۔ تمام مفکرین اس سے متفق ہو گئے کہ ایک ایسا تعلیمی ادارہ قائم کیا جائے جس کا بنیادی مقصد اور دستور العمل علی گڑھ سے بالکل مختلف ہو۔ چنانچہ سرسید کے خلیفۂ ثانی نواب وقار الملک نے ۱۹۱۲ء میں ان مسلمانوں کے لئے جو سرکاری ملازمتوں کو تعلیم کا نعم البدل خیال نہیں کرتے تھے۔ جامعہ اسلامیہ قائم کرنے کی اسکیم پیش کی۔ اور یہ بھی خواہش ظاہر کی کہ اس کو سرکاری اثرات سے آزاد رکھا جائے۔ وقار الملک کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی لیکن سنہ ۱۹۲۰ء جب تحریک ترک موالات کا زور ہوا تو طلبہ نے بھی سرکاری اداروں میں جانا بند کر دیا۔ اس کا اثر علی گڑھ پر بھی پڑا اور اس طرح قومی اور ملی جذبات رکھنے والے طلبہ نے علی گڑھ کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ ایسے طلبہ کے لئے بھی ایک نیشنل یونی ورسٹی کا قیام ناگزیر ہو گیا۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیو بندی نے ۲۹ر اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سنگ بنیاد رکھا۔ مولانا نے اپنے خطبے میں فرمایا:

"ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ ہونا چاہیئے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے داموں کے غلام پیدا کرتے رہیں۔ اب ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں۔ بغداد اور قرطبہ یونی ورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنھوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا تھا۔ ضرورت ہے کہ ہماری تعلیم اغیار کے اثر سے مکمل آزاد ہو۔"

جامعہ ملیہ کی بنیاد علی گڑھ میں رکھی گئی تھی۔ خیمے قیام گاہ اور درختوں کے سائے تعلیم گاہ تھے مگر اس میں بھی بڑی دل جمعی تھی حکیم اجمل خاں مرحوم جامعہ کے پہلے امیر اور مولانا محمد علی شیخ الجامعہ مقرر ہوئے کچھ عرصے کے بعد جب مولانا محمد علی جوہر گرفتار ہو گئے تو خواجہ عبدالمجید نے یہ عہدہ سنبھالا۔

جامعہ کی بنیاد شدید ہیجان کے زمانہ میں پڑی تھی یعنی تحریک خلافت کا زور تھا۔ اور جامعہ اس کی حمایت کر رہی تھی۔ اور عوام جامعہ کی طرف داری کر رہے تھے یہی لوگ جامعہ کے لئے ذرائع آمدنی بھی مہیا کرتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ جذبہ سرد ہو نا گیا۔ جن لوگوں نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔ ان میں سے بعض ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کی تسخیر کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن ان کو جلد ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ ایسا ناممکن ہے۔ رفتہ رفتہ جامعہ کے لئے علی گڑھ میں قائم رہنا اور ترقی کرنا ناممکن ہو گیا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یہ سوچا جانے لگا کہ جامعہ کو بند کر دیا جائے۔ لیکن مایوسی کی اس فضا میں بعض کارکنوں نے ہمت نہیں ہاری۔ چنانچہ کارکنوں اور طلبہ کا وفد حکیم اجمل خاں سے ملا اور ان کو بغیر مشاہرے کے کام کرنے کی یقین دہانی کی۔ آخر کار یہ طے پایا کہ جامعہ کو علی گڑھ سے دہلی منتقل کر دیا چنانچہ ۱۹۲۵ء کی موسم گرما کی تعطیلات میں قرول باغ دہلی میں آ گئی۔

جامعہ نے سب سے زیادہ ترقی اس وقت سے کی جب ڈاکٹر ذاکر حسین نے بحیثیت شیخ الجامعہ اور ڈاکٹر عابد حسین نے بحیثیت رجسٹرار کام سنبھالا۔ حکیم

اجمل خاں کی وفات کے بعد ڈاکٹر مختار احمد انصاری امیر جامعہ مقرر ہوئے۔ انھوں نے بورڈ آف ٹرسٹیز کی جگہ انجمن تعلیم ملی قائم کی جس کے ممبران کے اسمائے گرامی یہ تھے۔

۱۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ۲۔ پروفیسر محمد مجیب
۳۔ مولانا اسلم جے راج پوری ۴۔ خواجہ عبدالحی
۵۔ حافظ فیاض احمد ۶۔ ارشاد الحق
۷۔ معیب الدین ۸۔ سعید انصاری
۹۔ حامد علی خاں ۱۰۔ شفیق الرحمان قدوائی

ان اصحاب نے ملک میں دورے کرکے ایک خطیر رقم جمع کی ان لوگوں کی کوششوں سے جامعہ نے بڑی ترقی کی اور چند ہی سال میں جامعہ کے پرائمری اور سیکنڈری دونوں شعبوں نے بہت ترقی کی اور جدید تعلیمی طریقوں کے کامیاب تجربوں کی بدولت دلیس و بر دلیس میں شہرت حاصل کی۔ یہ چھوٹا سا کالج اپنا نصاب اپنا امتحان۔ اپنا تصنیف و تالیف کا شعبہ اردو اکادمی اور اس کا آرگن رسالہ جامعہ اپنا پبلیشنگ ہاؤس۔ مکتبہ جامعہ اور پریس وغیرہ رکھتا تھا اردو اکادمی کی طرف سے لاتعداد علمی۔ تاریخی۔ تعلیمی۔ سوانحی اور سیاسی کتابیں بھی شائع ہوئیں۔

تعلیمی اسکیم

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے دیگر ماہرین تعلیم سے مل کر ۱۹۳۸ء میں بیسک ایجوکیشن کی اسکیم مرتب کی۔ ہندوستان میں پہلا ٹریننگ کالج جامعہ نے ہی قائم کیا۔ توسیعی لیکچروں کے سلسلے میں ترکی سے حسین رؤف بے اور خالدہ ادیب خانم اور مصر سے ڈاکٹر وہبی لیکچر دینے کے لئے آئے۔ اسی سال شفیق الرحمان قدوائی نے ہمہ گیر تعلیم کا ادارہ تعلیم و ترقی کے نام سے قائم کیا۔

۱۹۳۱ء تعلیمی مرکز کی پہلی عمارت قرول باغ میں بنائی گئی۔ اور ۱۹۳۵ء

میں اوکھلے میں اور اس طرح ۱۹۳۶ء میں ابتدائی اسکول اپنی مستقل آبادی جامعہ نگر منتقل ہوگیا.

خصوصیات

جامعہ میں اساتذہ کی دل چسپی کا یہ عالم تھا. کہ چلانے والے بھی وہی تھے اور حکم دینے والے بھی وہی یعنی حاکم و محکوم دو گروہ الگ الگ نہ تھے۔ جامعہ میں بہت سی اقسام کے تعلیمی شعبے قائم ہو چکے ہیں. ہر شعبہ میں بہترین اور تجربہ کار اساتذہ ہیں. جن کے حسن تربیت نے جامعہ ملیہ کو ایک عظیم ادارے میں تبدیل کر دیا ہے ۱۹۳۸ء میں جو مدرسہ تربیت اساتذہ کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ اس نے جامعہ کی اہمیت وافادیت میں مزید چار چاند لگا دیے ہیں۔

ابتدا میں تمام اساتذہ کے لئے ایک ہی نصاب مقرر کیا گیا تھا۔ لیکن ۱۹۵۴ء میں ابتدائی اور ثانوی جماعتوں کے اساتذہ کی تربیت کا علیحدہ علیحدہ انتظام کر دیا گیا ہے۔

تقسیم ملک کے بعد جامعہ میں تبدیلیاں نظر آنے لگیں اور رفتہ رفتہ یہ خیال زور پکڑنے لگا کہ اس کا انتظام حکومت کو سنبھال لینا چاہیئے۔ چنانچہ ۱۹۶۳ء میں حکومت ہند نے اس کو ایک اعلیٰ درس گاہ قبول کرتے ہوئے اس کا انتظام اور انصرام بھی خود سنبھال لیا ہے۔ آج کل اس میں. ایم۔ اے اور ایم ایڈ کی کلاسوں کا بھی انتظام ہے۔

جامعہ کے اولین اساتذہ نے زر کثیر صرف کر کے یورپ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی۔ اور بعد میں معمولی مشاہروں پر قومی خدمت کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ یہ اساتذہ کرام خود ہی سادہ نہیں [illegible] بلکہ انھوں نے کالج کے اندر کفایت شعاری کو اپنی و جامعہ کی زندگی کا مقصد اوّل قرار دیا۔

درس گاہ طلبہ کے اقتصادی مسائل کا حل پیش کئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ جامعہ نے دستکاری، صنعت وحرفت کو حصول معاش کا ذریعہ بنایا اور مختلف مفید پیشوں کی تعلیم کا انتظام کیا۔ مثلاً نجاری، قفل سازی۔ پارچہ بافی۔ ڈیری فارمنگ اور کیمیاوی صنعتوں میں طلبہ کی تربیت کا اہتمام۔ جامعہ میں علمی زندگی ہے جس میں شعبہ دارالاشاعت قائم ہے جس نے لاتعداد قابل قدر کتابیں شائع کی ہیں۔ اس کے علاوہ اردو اکادمی بھی قائم ہے جسے ڈاکٹر عابد حسین جیسے بلندپایہ نثر نگار چلارہے ہیں۔ اس ضمن میں پروفیسر محمد مجیب بھی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ شعراء میں قیصر زیدی اور غلام ربانی تاباں قابل ذکر ہیں۔ جامعہ ایک مجلہ "جامعہ" کے نام سے ہر ماہ شائع کرتی ہے۔ جس میں ثقافت۔ تعلیم۔ سیاست تاریخ۔ سوانح اور دیگر علمی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس رسالہ کا شمار ھندوپاک کے بلندپایہ اردو رسائل میں ہوتا ہے۔

پاکستان کا نظام تعلیم

EDUCATION IN PAKISTAN

تاریخی پس منظر:

جمہوری حکومتوں کے برعکس شخصی حکومتوں میں عموماً معاشرہ ایک شخص کی پسند اور ناپسند پر منحصر ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرے کے اعلیٰ طبقوں میں خود غرضی اور مفاد پرستی کا زور رہتا ہے۔ اس نظریہ کے عوام پر بھی خاطر خواہ اثرات ہوتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام وطن کے مفاد اور معاشرے کی اصلاح کو چھوڑ کر ذاتی ترقی اور افسران بالا کی خوشنودی حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ اگر حاکم بیدار مغز سمجھدار۔ ہوشیار اور تعلیم یافتہ ہو تو وہ عیش وعشرت کی بجائے عوام کی فلاح وبہبود میں مصروف رہتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک میں امن وامان برقرار رہتا ہے اور ہر طرح کی ترقی بھی ہوتی ہے۔ شر پسندوں کو سر اٹھانے کا موقع نہیں ملتا۔ رعایا آرام وسکون سے رہتی ہے لیکن عوام ہر قسم کی تربیت سے بے بہرہ رہتے ہیں۔ نہ تو ان میں احساس ذمہ داری پیدا ہوتا ہے۔ نہ وطن کی محبت اور نہ ہی اپنے حقوق وفرائض کا احساس، ان کو حکومت کے کاموں سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ حکومت بدلنے سے ان پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

جب تک ہندوستان پر قابل اور لائق مسلمان حکمران رہے ملک میں امن وسکون رہا۔ لیکن مغلوں کے آخری دور میں حکمران ان صلاحیتوں اور خوبیوں سے محروم ہو گئے۔ جو ان کے آباء اجداد میں پائی جاتی تھیں۔ تو حکومت کا زوال بھی شروع ہو گیا۔ امراء اور روساء کی خود غرضیاں۔ آپس کی رقابتیں اور اقتدار کی

ہوس رنگ لانے لگی۔ اگرچہ کچھ لوگوں نے مرکز کو پھر طاقتور بنانے کی کوشش کی۔ لیکن ان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ رفتہ رفتہ مغربی لوگ جو تاجر بن کر آئے تھے تاج دار بن گئے۔

برصغیر جو سونے کی چڑیا تھی اس میں عوام کو جو آسانیاں میسر تھیں وہ یورپ کی اقوام کے خواب و خیال میں بھی نہ تھیں۔ چنانچہ اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے یورپ کے حکمرانوں نے اپنے عوام میں جذبہ قومیت اُبھارنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اور اس طرح پورے یورپ میں مقامی حکمرانوں کی قومی حکومتیں قائم ہوگئیں اور یہ حکمران عوام کے جذبات کے ترجمان تصور کئے جانے لگے۔ اس قسم کی حکومتوں میں حکمران عوام کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ تھی کہ یورپ کے ممالک میں لاتعداد انقلاب آئے۔ اور اس طرح ملوکیت کا قریب قریب وہاں خاتمہ ہوگیا۔ انگلستان ایک غریب اور چھوٹا ملک تھا۔ اس لئے وہاں حکمران عوام کے رحم و کرم پر تھا۔ جب چارلس اوّل نے اپنی حدود سے تجاوز کرنے کی کوشش کی تو ۱۶۴۹ء میں اس کو پھانسی دے دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان کا حکمران صرف نام کا ہی رہ گیا۔ طاقت کا منبع و مخرج وزیراعظم ہوتا ہے جو عوام کا نمائندہ ہوتا ہے۔

اس بحث سے بخوبی ظاہر ہے کہ انگریزوں کو عوام کی طاقت کا بخوبی اندازہ تھا۔ چنانچہ جب انھوں نے ہندوستان کے اقتدار پر قبضہ کیا تو انھوں نے ہندوستان کے عوام کو ہر طرح مفلوج کرنے کی کوشش کی۔ ہندوستانیوں کا اخلاق و کردار تباہ کر دیا۔ ان میں فرقہ بندی کے جذبات ابھار کر ایک کو دوسرے کا دشمن بنا دیا۔ صنعت و حرفت کو بالکل تباہ کر دیا۔ دست کاروں کے ہاتھوں کو قلم کرا دیا۔ تعلیمی اداروں کو نیست و نابود کر دیا۔ ہر جگہ شراب و کباب کے اڈے کھول دیئے۔ اگر ان حرکتوں پر لوگوں نے احتجاج کیا تو ان کے ساتھ انسانیت سوز برتاؤ کر کے ان کے منہ بند کر دیئے۔ منفی تعلیم کو رائج کر کے عوام کو ذہنی طور سے مفلوج کر دیا۔ ان میں غور و فکر کی قوت کو ختم کر کے غلامانہ ذہنیت کی آبیاری کی۔ المختصر نتیجہ یہ ہوا کہ

سو سال کے عرصہ میں ایک مہذب اور شائستہ قوم کو جاہل۔ غیر منظم اور مفلوک الحال بنا دیا۔

۱۹۴۷ء میں انگریز جب واپس ہوئے تو ان کو اطمینان کلی تھا کہ انھوں نے ہندوؤں کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص اخلاقی۔ مادی۔ روحانی۔ تہذیبی۔ غرض ہر لحاظ سے دیوالیہ کر دیا ہے۔ ان کی میراث کے سلسلہ میں قومی کمیشن[۵۹] نے تمہید میں تحریر کیا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کے لوگوں کو چار باتوں کا عادی بنا دیا تھا۔

۱۔ جمود پسندی Passivity

کسی کام میں اپنی طرف سے قدم نہ اٹھانا۔ بلکہ خاموش تماشائی بنے رہنا۔

۲۔ نظم و ضبط سے بیگانگی Indiscipline

یعنی ہم لوگوں میں نظم و ضبط بالکل ہی ختم کر دیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم کسی کام کو کرنے سے بالکل قاصر ہیں۔ جس کے اثرات ظاہر ہیں۔

۳۔ موقع پرستی Opportuists

نفسی نفسی کا عالم ہے ہر شخص کو صرف اپنی ذات سے ہی دلچسپی ہے، ملک و قوم سے کسی کو کوئی سروکار نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آدھا ملک الگ ہو گیا۔

۴۔ صوبائیت Provincialism

پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا۔ اسلام کے مطابق تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ لیکن جیسے جیسے وقت گذر رہا ہے۔ تعصب اور تنگ نظری میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہر شخص اپنی اور اپنے خطہ کی بات کرتا ہے ملک سے کسی کو دلچسپی نہیں۔

ان چاروں برائیوں نے پاکستان کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں کمیشن کے الفاظ ملاحظہ ہوں جو اس نے تیرہویں باب "کردار سازی میں تعلیم کا حصہ" میں بیان کئے ہیں:

"حب وطن، سچائی، ایمان داری، دیانت، احساسِ فرض، انصاف

خلوص نیت ، جذبہ مساوات ، ہمدردی ، محنت کی عادت ، جسمانی محنت کی قدر ، اصول وضابطہ پر چلنا ، ہر شخص کے ساتھ یکساں سلوک ، قوم کی بھلائی کے لئے مل جل کر کام کرنے کی عادت ۔ بے لوث خدمت کا جذبہ ، احساس خود داری ، کھانے ، سونے کے اوقات کی پابندی ، صفائی پسندی "

ان تمام خوبیوں کو بالائے طاق رکھ کر جو برائیاں اپنائی گئی ہیں ۔ اس ضمن میں کمیشن لکھتا ہے :

"جھوٹے وعدے کرنا ، گالیاں بکنا ، نظم وضبط کی پابندی نہ کرنا ، اور خود غرضی وغیرہ وغیرہ "

ان کے علاوہ اور بھی چند کمزوریاں ہیں ۔ جن کا تذکرہ اگرچہ قومی تعلیمی کمیشن نے نہیں کیا ہے ۔ لیکن ہم کرنا ضروری خیال کرتے ہیں ۔ اسلام سے روگردانی ۔ بے حیائی ، عریانیت ، مغرب کی نقالی ۔ احساس کمتری ۔ قوت فکر وعمل کی کمی وغیرہ وغیرہ

مختصراً یہ وہ میراث ہے جو انگریزوں نے اہل پاکستان کو چھوڑیں ۔ مقام افسوس ہے کہ بجائے اس کے کہ ہم ان برائیوں سے نجات حاصل کرتے ۔ دن بدن ان میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے ۔ پاکستان نظریاتی ملک ہے ۔ جس کو حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں نے بڑی قربانیاں دی ہیں ۔ ان تمام خوبیوں میں سب سے اہم جذبہ لگن ہے جس نے پاکستان کو معرض وجود میں لانے کا کام انجام دیا ۔ آج بھی اسی جذبہ اور لگن کی ضرورت ہے ۔ دوسری خامی ہم میں عزم کا فقدان ہے ۔ جب کسی قوم سے قوت فیصلہ رخصت ہو جاتا ہے اور اس میں بے یقینی اور تذبذب کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ، تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا ہے ۔

ملک و قوم کو اس حالت سے نجات دلانے کا صرف اور صرف علاج یہ ہے کہ ہم اپنے نظام تعلیم میں انقلابی تبدیلیاں کریں ۔ تعلیم کی کامیابی یا ناکامی کا زیادہ تر دارومدار اساتذہ پر ہے ۔ ہمارے معاشرے میں اساتذہ پریشانیوں اور

مصائب میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ جب اپنے اردگرد پر نظر ڈالتے ہیں تو بجز ان کے ہر شخص کی حالت بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان اصحاب کی تبدیلی کی وجہ ان کی محنت یا لگن نہیں ہوتی بلکہ ناجائز اثرات اور ذرائع کا استعمال ہوتا ہے۔ جس سے استاد کے احساس محرومی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

اسلام نے معلم کو جو عزت و شوکت بخشی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی اس کو معزز خیال کیا جاتا ہے کیوں کہ معلم ہی وہ ذات ہے جو ہماری آئندہ نسل کو راہ راست پر چلا سکتا ہے۔ وہ ان کے اخلاق اور عادات کو سنوار کر ان کو بہترین فرد بناتا ہے۔ لیکن زمانہ کے ساتھ ساتھ معلم کے نقطہ نظر میں بھی تبدیلیاں آگئی ہیں۔ اگر معاشرے اور فرد کو سدھارنا ہے تو سب سے پہلے ضرورت یہ ہے کہ اساتذہ کے نقطہ نظر میں تبدیلیاں پیدا کی جائیں۔ استاد کا پہلا فرض طلبہ میں فکر اسلامی پیدا کرنا ہونا چاہیئے۔ کیوں کہ یہی ہماری زندگی کا مقصد اولین ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ اساتذہ عزم اور بے لاگ جذبہ سے کام کریں۔ مشکلات اور مصائب وقتی ہوا کرتی ہیں۔ ان سے اساتذہ کو دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیئے

انگریزوں نے ہمارے اساتذہ کو راہ راست سے ہٹا دیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان میں وہی لگن اور جذبہ پیدا کر دیا جائے۔ جس کی ہم کو ضرورت ہے اصل ضرورت قوت ارادہ کی ہے۔ پاکستانی معاشرہ کو انگریزی میراث سے نجات دلانے کی بجز اس کے کوئی دوسری صورت نہیں ہے کہ عوام کی اصلاح پر خاطر خواہ توجہ دی جائے اور اس اصلاح کی ابتداء تعلیم سے ہونی چاہیئے۔ حکومت اور عوام میں محبت اور اخوت کا رشتہ قائم کیا جائے۔ حکومت اساتذہ پر مکمل بھروسہ کرے اور ان کو سیاست سے الگ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرے۔ اگر اساتذہ باسیرت۔ نیک کردار ہوں گے۔ تو وہ بچہ کو بھی صالح اور نیک بنا سکیں گے۔ علم باعمل کے نظریہ کو بنیاد بنانا چاہیئے تب ہی ہم اصل پاکستانی پیدا کر سکتے ہیں۔

ملک کی ترقی و تنزلی کا دارومدار تعلیم پر ہوتا ہے۔ آج دنیا جس تیزی سے ترقی

کر رہی ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اگر ہم کو با عزت زندگی گذارنی مقصود ہے تو ہم کو تعلیم و تربیت پر حد سے زیادہ توجہ دینی چاہیئے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ تعلیم لازمی اور مفت ہو۔ اتنا ہی نہیں بلکہ تعلیم ایسی ہو جو ہماری ضروریات کی تکمیل میں معاون و مددگار ثابت ہو۔ تعلیم کا بنیادی مقصد ہماری اقتصادی، معاشرتی اور روحانی ترقی میں ہم آہنگی پیدا کر کے ہم کو بہترین فرد بنانا ہے۔ امریکہ۔ روس اور جرمنی میں ماہرین اقتصادیات نے اپنی تحقیقوں اور تجربات سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تعلیم پر خرچ ہونے والا روپیہ دراصل ملک کی اقتصادیات میں لگایا جانے والا سرمایہ ہے جو فرد کی ترقی کا ضامن ہوتا ہے۔ اس ضمن میں قومی تعلیمی کمیشن کے خیالات ملاحظہ ہوں :

"ابتدائی تعلیم پر بحث کرنے سے پیشتر یہ بتا دینا لازمی ہے کہ جبری یا لازمی تعلیم اور ابتدائی تعلیم میں فرق ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں لازمی تعلیم ابتدائی تعلیم کے بعد بھی جاری رہتی ہے۔ جس سے ہر بچہ کو ثانوی تعلیم کا بھی چند سال کا تجربہ ہو جاتا ہے۔ ان ممالک میں ایک بچے کو نو یا دس سال تک اسکول میں جانا پڑتا ہے۔ بعض ممالک میں گیارہ اور بارہ سال تک لازمی تعلیم کا سلسلہ رہتا ہے۔ مختلف ممالک میں لازمی تعلیم کا زمانہ مختلف رہا ہے اور جیسے جیسے حالات بہتر ہوتے گئے۔ انھوں نے لازمی تعلیم کی مدت میں اضافہ بھی کیا ہے۔ اور اس طرح ابتدائی تعلیم وسائل کے مطابق ترقی کرتی جاتی ہے۔"

محدود پیمانے پر ابتدائی تعلیم کا انتظام خواہ وہ بالکل مفت ہی کیوں نہ ہو ملک کے سب سے نچلے طبقے سے شروع کرنا چاہیئے کیوں کہ یہ طبقہ بچوں کو اسکول نہیں بھیج سکتا۔ کیوں کہ اس طبقہ کا خیال ہے کہ ملک میں کوئی بھی نظام حکومت ہو اس طبقہ کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ تعلیم لازمی ہونے کی صورت میں بچوں کو مدرسہ میں جانا پڑتا ہے۔ جس سے اس کے مسائل میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ

اس طبقہ کے بچے محنت مزدوری کر کے اپنے خاندان کی کفالت کرتے ہیں۔ پاکستان میں ایسے ہی افراد کی اکثریت ہے۔ ان میں تعلیم سے دلچسپی پیدا کرنے کا مقصد پاکستان کی ترقی ہے۔ کیوں کہ تعلیم ہی وہ جوہر ہے جو بچے میں اوصاف حمیدہ پیدا کرتی ہے۔ اس طرح تعلیم کو لازمی کرنے سے پاکستان کی ترقی میں بھی مدد ملے گی۔ اور انگریزی میراث سے بھی چھٹکارا ہو جائے گا۔

اس بات کا تذکرہ کرنا بے محل نہ ہوگا کہ جن ممالک میں تعلیم عام ہے۔ وہاں انقلاب کا خطرہ بھی کم ہوتا ہے۔ فوج یا دوسرے با اثر افراد انقلاب اسی وقت برپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جبکہ عوام جاہل ہوں۔ جاہل عوام اچھے اور برے میں۔ تفریق کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ ان میں سیاسی سوجھ بوجھ کم ہوتی ہے اور وہ دوسروں کے آلہ کار جلد بن جاتے ہیں۔ اس لئے اگر پاکستان کو مضبوط اور مستحکم بنانا ہے تو لازمی تعلیم ہی اس کا حل ہے۔

اگر آپ قومی تعلیمی کمیشن کا بنظر غائر مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس میں تحریر ہے:

"وسائل کی کمی کی وجہ سے کچھ عرصہ تک تعلیم کو لازمی اور مفت نہیں کہا جا سکتا۔"

قول اور فعل کے اس تضاد نے پاکستان کی تعلیم کو آج تک غیر معیاری بے کار اور فرسودہ بنا رکھا ہے۔ دوسری بات جس پر کمیشن نے زور دیا تھا:

"دنیا کے دوسرے ممالک کے مقابلے کے لئے لازمی ہے کہ معیار تعلیم پر زیادہ زور دیا جائے۔"

یہی وہ نظریہ ہے جو انگریزی دوران حکومت میں بار بار دھرایا گیا ہے۔ اور اسی بات کو بنیاد بنا کر انھوں نے تعلیمی میدان میں ہمیشہ رکاوٹیں پیدا کیں۔ اصل چیز الفاظ نہیں بلکہ نظریہ ہے۔ چین کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ دوسرا سوال معیاری تعلیم ہے۔ معیار کا مطلب اگر انگریزی زبان کے ماہر پیدا کرنا ہے تو

ایسا ناممکن ہے کیوں کہ اوّل تو اس کے لئے بہت روپیہ کی ضرورت ہے دوسرے زبان غیر میں آج تک کسی نے ترقی نہیں کی ساتھ ہی ساتھ تعلیم محدود بھی ہو جائے گی جیسا کہ آج کل ہے۔

دور جدید کا اہم تقاضہ سائنس اور ٹکنالوجی کے ماہرین تیار کرنا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ تعلیم قومی زبان میں دی جائے۔ روس، جرمنی، فرانس، امریکہ، چین اور جاپانی جو اس میں امتیازی مقام کے حامل ہیں وہ مادری زبان میں ہی تعلیم دے رہے ہیں۔ اس کے لئے ہونا یہ چاہیے کہ ہر زبان کے ترجمہ کا انتظام کیا جائے۔ ہر زبان کی معیاری کتاب کا ترجمہ کیا جائے۔ اس کام کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہمارے بچے منزل مقصود پر بہ آسانی پہنچ سکتے ہیں۔ ہماری کسمپرسی کی سب سے بڑی وجہ زبان غیر ہے کیوں کہ ایک بچہ اپنی زندگی کا کافی وقت اس کے سمجھنے اور پڑھنے میں صرف کرتا ہے اور پھر بھی اس میں خود اعتمادی کا فقدان رہتا ہے۔ اس کا اپنا کچھ بھی نہیں ہوتا۔

فرنگی میراث سے دامن چھڑانے میں انگریزی ذریعہ تعلیم کے اسکول بھی ایک رکاوٹ ہیں۔ یہ اسکول آزادی کے بعد پاکستان کے مختلف حصوں میں بہت تیزی سے قائم کئے گئے ہیں ان اسکولوں میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔ لیکن اساتذہ پاکستانی ہیں جو عموماً "بابو انگلش" بولتے ہیں۔ بابو انگلش کا تقسیم سے قبل انگریزی کتابوں اور رسالوں میں بہت ذکر ملتا ہے۔ یہاں پر صرف اتنا گوش گذار کردینا کافی ہوگا کہ ایک ایسا شخص جس کی مادری زبان دوسری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچے اس کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کی تمام صلاحیتیں تباہ وبرباد ہو جاتی ہیں۔ وہ صرف رٹنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ان اسکولوں کا اصل مقصد پاکستانی بچوں کو ان کے تمدنی اور ثقافتی ورثہ سے متنفر کرنا۔ زیادہ سے زیادہ فیس لینا۔ بچوں کے کردار میں ہر برائی پیدا کرنا۔ ان کو اسلامی اقدار سے ہٹا کر یا ان کو غلط رنگ میں پیش کر کے اسلام سے متنفر کرنا ہے ناظرین کو تعجب ہوگا

کہ آزادی سے پیشتر پاکستان میں اس قسم کے چند ہی اسکول تھے۔ لیکن آج یہ لاتعداد ہیں۔ کیوں کہ اس میں تعلیم دلانا باعث فخر سمجھا جاتا ہے۔ پاکستان کے افسران اعلیٰ اس قسم کے اسکولوں کی سرپرستی کرتے ہیں کیوں کہ ان اسکولوں کا مقصد حکمران طبقہ کو پیدا کرنا ہے جو عوام سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ مغربی پاکستان کے ایک گورنر نے فیصل آباد کے ایک اسکول کا افتتاح کرتے وقت بڑے فخر سے فرمایا:

"پاکستان کے تعلیمی مسائل کا حل یہ ہے کہ رفتہ رفتہ ہر ضلع میں ایک پبلک اسکول قائم کر دیا جائے۔"

ان اسکولوں میں کچھ مشنری بھی ہیں۔ یہ اسکول پاکستان کے مختلف حصوں میں قائم ہیں۔ ان کا مقصد بچوں کو غیر قومی بنانا ہے۔ کیوں کہ ان کا بنیادی مقصد عیسائیت کی تبلیغ و ترویج ہے۔ ان کے منتظم عموماً غیر ملکی مبلغ ہوتے ہیں۔ جن کا مقصد ملک کی نظریاتی بنیادوں کی بیخ کنی ہے۔ اور بچوں کو زیادہ سے زیادہ ملک کی تہذیب، زبان مذہب اور اقدار سے برگشتہ کر کے ان کو عیسائی بنانا ہوتا ہے کیوں کہ وہ بچے کے خام ذہن کے سامنے اسلام کو عیسائیت سے کمتر پیش کرتے ہیں۔ اس لئے بچے ابتدا ہی سے اسلام سے برگشتہ ہو جاتے ہیں۔

اس قسم کے اداروں میں انگریزی کی تعلیم پر بہت توجہ دی جاتی ہے اساتذہ کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ بچوں کو لباس۔ وضع قطع۔ چال ڈھال، حرکات و سکنات میں انگریز اور مغربی تہذیب کا دل دادہ بنا دیا جائے۔ اگر ہم کو پاکستان سے محبت ہے اور اس کو قائم رکھنا ہے تو ضرورت اس بات کی ہے کہ اس قسم کے تمام مدارس کو بند کر دیا جائے۔ جن کا مقصد میر جعفر اور میر صادق پیدا کرنا ہے۔ اور وہ ہر وقت اس چیز کے لئے کوشاں ہیں پاکستان کو دولخت کر چکے ہیں۔ اب ہم کو آنکھیں کھولنی چاہئیں۔ ورنہ اس کے جو نتائج ہوں گے وہ کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔

انگریزوں کی آمد سے پیشتر نظام تعلیم

انگریزوں کی آمد سے پیشتر ہندوستان میں مدرسے اور مکتب مسلمانوں کو مذہبی تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ اخلاقی اور عام تعلیم بھی دیتے تھے۔ مدرسوں کے نصاب میں اسلامی علوم کے علاوہ ریاضی۔ علم ھندسہ۔ طبیعیات۔ فلکیات۔ فلسفہ۔ منطق اور طب وغیرہ علوم شامل تھے۔ ان تمام علوم میں مسلمانوں نے قابل تحسین کارنامے انجام دیئے۔ لیکن تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں ایشیا میں منگولوں اور یورپ میں عیسائیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کو صرف قتل ہی نہیں کیا گیا بلکہ ان کی تمام کتابوں کو بھی تباہ و برباد کر دیا گیا۔ آپس کی لڑائیوں نے مسلمانوں میں جمود کا عالم پیدا کر دیا۔ وہ قدامت پسند اور لکیر کے فقیر بن کر رہ گئے۔ اس طرح نصاب تعلیم بھی بیکار اور فرسودہ ہو کر رہ گیا۔ جب انگریزوں نے اس ملک پر قبضہ کیا تو یہاں پر نوآبادیاتی نظام قائم کر دیا۔ جس سے مدرسوں کی مقبولیت ختم ہو گئی۔ ہر شخص دنیاوی معاملات میں الجھ کر انگریزوں کا آلہ کار بن گیا مدرسوں کو دینی علوم کا مرکز سمجھ لیا گیا۔ ان میں ناکارہ اور فرسودہ سائنسی مضامین کو بھی شامل کر دیا گیا۔

پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد یہاں پر دو قسم کے ادارے تھے:

۱۔ انگریزوں کا نوآبادیاتی نظام تعلیم

۲۔ مسلمانوں کا مذہبی نظام تعلیم

ایک میں دین و اخلاق سے عاری دنیاوی تعلیم دی جا رہی ہے۔ پاکستان بننے کے بعد اس میں تھوڑی بہت دین کی پیوندکاری بھی کر دی گئی ہے۔ تمام سرکاری اور غیر سرکاری محکموں اور اداروں میں اسی نظام تعلیم کے فارغ التحصیل طلبہ ملازم رکھے جاتے ہیں۔ دوسرے میں مذہبی تعلیم دی جاتی ہے اس نظام تعلیم کے فارغ التحصیل مسجدوں میں امام، نکاح خواں اور مؤذن وغیرہ ہو جاتے ہیں۔ ان کی

تعلیم کو سرکاری طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی مذہبی اور دنیاوی دو حصوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔ گویا اسلام میں بھی کلیسا بن گیا ہے جب کہ اسلام میں ہر شخص مساوی حیثیت کا حامل ہے۔

مفکرین تعلیم کا ایک طبقہ پاکستان میں صرف ایک نظام تعلیم کا حامی ہے یہ طبقہ مدرسوں کا وجود برداشت کرنے سے قاصر ہے۔ کچھ لوگ مدرسوں کو اسی حالت میں رکھنے کے قائل ہیں۔ تاکہ کچھ افراد کو مذہبی تعلیم ملتی رہے۔ ہمارے خیال میں مدارس کے نظام میں لاتعداد خوبیاں ہیں۔ مثلاً

۱۔ بہت سے اساتذہ مخلص ہوتے ہیں۔ وہ ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا خیال رکھتے ہیں۔
۲۔ ان مدارس کے طلبہ میں نظم و ضبط بہتر ہوتا ہے۔
۳۔ استاد کا ادب کرتے ہیں۔ استاد اور شاگرد کے درمیان خلوص و محبت کا رشتہ قائم رہتا ہے۔
۴۔ کتابوں کو مادری زبان میں سمجھایا جاتا ہے۔ جس سے طلبہ کی سمجھ میں نفس مضمون اچھی طرح سے آجاتا ہے۔
۵۔ ان مدرسوں سے لوگوں کو عقیدت ہوتی ہے اور لوگ ان کی مدد کرنا باعث ثواب سمجھتے ہیں۔

اس لئے بہتر یہ ہے کہ مکتب اور مدرسوں کے نظام کو برقرار رکھا جائے ان میں سائنسی علوم کو شامل کر کے جدید بنایا جائے۔ نصاب میں۔ تاریخ۔ جغرافیہ اقتصادیات اور تجارت وغیرہ کو بھی شامل کیا جائے۔ تاکہ جدید اور قدیم کا حسین امتزاج پیدا کر کے طلبہ کو بہترین شہری بنایا جا سکے۔ عملی تعلیم پر بھی زیادہ توجہ دی جائے۔ اس طرح پاکستان میں معیار تعلیم بہتر ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ یہ ادارے ایک طرف تو ہماری روحانی تکمیل کا باعث ہیں تو دوسری طرف ہم کو دنیاوی علوم سے روشناس کرا کر ہم کو دنیا میں اعلیٰ مقام کی طرف رہبری بھی کرتے ہیں

ان مکاتب سے تعلیم کی ترویج اور ترقی میں بھی کافی مدد مل سکتی ہے۔ کیوں کہ یہ مساجد سے منسلک ہوتے ہیں اور مساجد ہماری زندگی کا جزو لاینفک حصہ ہیں ضرورت صرف تنظیم نو، لگن اور جذبے کی ہے۔

دشمنان پاکستان نے ابتدا ہی سے پاکستان کے خلاف سازشیں شروع کردی تھیں بنگال۔ پنجاب۔ سندھ۔ سرحد اور بلوچستان میں برطانوی عہد سے ہی ھندوؤں کو معاشی۔ اقتصادی اور تعلیمی میدانوں میں برتری حاصل تھی۔ چنانچہ قیام پاکستان کے وقت ان تمام صوبوں میں سرکاری مدارس اور کالجوں پر ھندوؤں ہی کا قبضہ تھا اساتذہ کی اکثریت ھندوؤں کی ہی تھی۔ سرکاری مدارس اور کالجوں کے علاوہ ھندوؤں کے اپنے بھی بہت سے ادارے تھے۔ ملیں اور کارخانے، بنک پر بھی ھندوؤں کا غلبہ تھا ذرائع آمدورفت پر بھی ان کا ہی قبضہ تھا۔

مخالفین پاکستان نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ منصوبوں کے تحت ھندو مسلم بلوے کرانے شروع کئے تاکہ سارا نظام ناکارہ ہوجائے۔ اس کے بعد ھندوؤں نے پاکستان سے ہجرت شروع کردی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان کا قیمتی اثاثہ بھارت منتقل ہوگیا۔

دیگر لوگوں کی طرح ہندو اساتذہ نے بھی بھارت جانا شروع کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان میں سرکاری اور غیر سرکاری تمام ادارے بند ہوگئے۔ پاکستان میں صرف وہی ادارے چلتے رہے جن کے بانی مسلمان تھے۔ ان اسکول اور کالجوں کی کل تعداد یہ تھی۔

صوبہ	تعداد ہائی اسکول	تعداد کالج
۱۔ بلوچستان	۲	×
۲۔ سرحد	۸	۱
۳۔ سندھ	۸	۱
۴۔ پنجاب	۱۳	۱
۵۔ بنگال	۲۴	۴

(ان کالجوں میں ۴۔ انٹرمیڈیٹ کالج تھے جن میں تین سرکاری تھے)

ھندو اساتذہ کے ھندو طلبہ بھی بھارت چلے گئے اس وجہ سے سرکاری اور ھندوؤں کے ادارے تقریباً ویران ہو گئے۔ لیکن مہاجرین کی آمد سے مسلمان لڑکے ان اداروں میں داخل ہوئے۔ لیکن اساتذہ کی کمی برقرار رہی جو مسلمان اساتذہ باقی تھے ان کو ترقی دے دی گئی۔ رفتہ رفتہ بھارت کے مختلف حصوں سے مسلم اساتذہ آتے رہے اور اس طرح خالی جگہوں کو پُر کرتے گئے۔

پہلی تعلیمی کانفرنس ۱۹۴۷ء
First Educational Conference 1947.

۲۷ نومبر ۱۹۴۷ء کو وزارت داخلہ (شعبہ تعلیم) کی جانب سے کراچی میں ایک تعلیمی کانفرنس منعقد کی گئی اس میں تعلیم سے متعلق تمام ماہرین نے شرکت کی۔ یہ کانفرنس ۲۷ نومبر سے یکم دسمبر تک جاری رہی جس کی صدارت وزیر داخلہ، اطلاعات براڈکاسٹنگ اور تعلیم جناب فضل الرحمٰن مرحوم نے کی تھی۔

اس کانفرنس کے مقاصد:

۱۔ تعلیمی حالات کا بغور جائزہ لیا جائے۔
۲۔ تعلیمی خامیوں کی دور کرنے کے لئے اقدامات کا تعین کیا جائے۔
۳۔ پاکستانیوں کی تعلیم کے لئے ایک مناسب راہ عمل تعین کیا جائے۔

اس کانفرنس کے مقاصد، ان کی اہمیت، تعلیمی نظام اور تعلیم کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کے ایجنڈے کو نقل کر دیں تاکہ ناظرین اس سے بخوبی واقف ہو سکیں۔

ایجنڈا:

۱۔ پاکستان کے لئے ایک مشاورتی بورڈ آف ایجوکیشن کا قیام
۲۔ پاکستان میں ایک بین الجامعاتی مجلس (انٹر یونیورسٹی بورڈ) کے قیام۔ اس کے مقاصد۔ آئین اور متعلقہ امور پر غور و خوض
۳۔ سائنٹیفک تحقیق، اس کے طریقوں اور ذرائع پر غور

۴۔ پاکستان میں ٹیکنیکل ایجوکیشن کا جائزہ۔ اس کے لئے ٹیکنیکل ایجوکیشن کونسل کے قیام کی ضرورت۔

۵۔ ٹیکنیکل مضامین میں تربیت کے لئے سمندر پار وظائف کے منصوبے پر غور۔

۶۔ شیڈولڈ کاسٹ کے وظائف اور دوسرے امور پر غور وخوض

۷۔ دوسرے ممالک سے تمدنی تعلقات قائم کرنے کے طریقوں اور ذرائع پر غور

۸۔ تعلیم بالغاں کے لئے مناسب سہولتوں پر غور

۹۔ چیئرمین کی اجازت سے کسی اور امر پر بھی غور

مندرجہ بالا امور کے علاوہ ایک دوسرا ایجنڈا بھی تیار کیا گیا۔ جو اضافی ایجنڈے کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی خاص خاص باتیں مندرجہ ذیل ہیں :

اضافی ایجنڈا

۱۔ تعلیم کی نظریاتی بنیاد کیا ہونی چاہیئے ؟ کیا عالمگیر اخوت کے اسلامی نظریہ۔ سماجی جمہوریت اور سماجی انصاف کو اس نظریے کی بنیاد بنایا جائے۔ جو ان قدروں پر مشتمل ہو۔ رواداری۔ اپنے قوت بازو پر بھروسہ۔ ایثار۔ مہربانی۔ باہمی شہریت کا احساس جس سے صوبائی علیحدگی پسندی کی نفی ہوتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ

۲۔ تمام سطحوں پر لازمی جسمانی تربیت اور کالجوں میں لازمی فوجی تربیت

۳۔ کیا مذہبی تعلیم اسکولوں میں ہونی چاہیئے ؟

۴۔ تعلیم کے روحانی۔ سماجی اور پیشہ ورانہ اجزار کا ارتباط

۵۔ رجحان کے مطابق تعلیم دینے کے اصول پر عمل تاکہ طلبہ کو اسی قسم کی تعلیم۔ تجارتی۔ ٹیکنیکل یا کتابی دی جاسکے جس کے لئے وہ موزوں ہوں۔

اس کانفرنس کی اہمیت وافادیت کا اندازہ اس سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ

یہ پاکستان کی سب سے پہلی تعلیمی کانفرنس تھی اور جس میں قائداعظم کا پیغام پڑھ کر سنایا گیا تھا۔ وہ پیغام یہ ہے:

"مجھے خوشی ہے کہ آج کراچی میں پاکستان ایجوکیشن کانفرنس شروع ہو رہی ہے۔ میں آپ لوگوں کو پاکستان کے دارالحکومت آنے پر خوش آمدید کہتا ہوں اور غور و فکر میں آپ لوگوں کی کامیابی کا متمنی ہوں۔ جس کے نتائج مجھے خلوص دل سے یقین ہے مفید اور عملی ہوں گے۔"

آپ جانتے ہیں کہ تعلیم اور صحیح تعلیم کی اہمیت پر جتنا زور بھی دیا جائے کم ہے ایک صدی سے اوپر غیر ملکی راج میں تعلیم پر مناسب توجہ نہیں دی گئی۔ اب اگر ہم حقیقی تیز رفتار اور زیادہ ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس مسئلہ کو مستعدی سے حل کرنا پڑے گا اور اپنی تعلیمی پالیسی اور منصوبے کو عوام کی افتادِ طبع کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے تمدن اور تاریخ کی روشنی میں اور ان تمام جدید تبدیلیوں اور ترقیوں کو سامنے رکھ کر جو دنیا میں ہوئی ہیں مرتب کرنا پڑے گا۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ملک کا مستقبل، اس تعلیم اور تربیت پر منحصر ہو گا جو ہم اپنے بچوں کو ایک پاکستانی شہری بنانے کے لئے دیں گے تعلیم کا مقصد صرف کتابی تعلیم ہی نہیں ہے۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ہمارے عوام کو ٹیکنیکل اور سائنسی تعلیم دی جائے تاکہ مستقبل میں ہماری اقتصادی زندگی کی تعمیر کی جاسکے اور لوگ سائنس، تجارت اور خاص طور پر صحیح طور پر منظم کی ہوئی صنعتوں میں حصہ لے سکیں۔ ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیئے کہ ہمیں دنیا سے مقابلہ کرنا ہے۔ جو اس سمت میں تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔

ساتھ ہی ساتھ ہمیں اپنی آئندہ نسلوں کی کردار سازی بھی کرنی ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم صحیح تعلیم سے ان میں عزت نفس۔ راست بازی۔ ذمہ داری اور قوم

کے لئے ایثار کا جذبہ پیدا کریں اور ہم کو یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ انھیں قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنا کردار ادا کرنے کے لئے اچھی مہارت اور تربیت حاصل ہو تاکہ اس سے پاکستان کو سربلندی حاصل ہو۔"

قائداعظم محمد علی جناح

پہلی تعلیمی کانفرنس نے بہت سی تجاویز منظور کیں۔ ان تمام کو قلم بند کرنا مشکل ہے۔ اس لئے خاص خاص باتوں کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے :

تجاویز

Suggestions.

۱۔ ایک بین الجامعاتی مجلس پاکستان (انٹر یونی ورسٹی بورڈ) قائم کیا جائے۔

۲۔ ایک مجلس مشاورت تعلیم پاکستان (ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن) بھی قائم کیا جائے۔

۳۔ تعلیم کی نظریاتی بنیاد۔ پاکستان کے نظام تعلیم کی اساس اسلامی نظریہ پر رکھی جائے جس میں بہت سی بنیادی باتوں کے علاوہ عالمگیر اخوت۔ رواداری اور انصاف پر زور دیا جائے۔

۴۔ اردو کو پاکستان کی رابطہ کی زبان قرار دیا جائے۔

۵۔ مسلمان بچوں کے لئے اسکول اور کالجوں میں مذہبی تعلیم لازمی کی جائے یہی مراعات دوسرے فرقوں کو بھی مہیا کی جائے جو اس کے خواہش مند ہوں۔

۶۔ مدارس میں جسمانی تربیت اور کالجوں میں فوجی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔

۷۔ قومی کتب خانہ اور عجائب گھر قائم کئے جائیں۔

۸۔ تاریخی دستاویزات اور تاریخی دستاویزات کے محافظ کا کمیشن قائم کیا جائے

۹۔ اسلامی تحقیق کا ایک مرکزی ادارہ قائم کیا جائے۔

۱۰۔ تعلیم بالغان کی ضرورت، اس کے ذرائع اور متعلقہ امور پر کانفرنس نے ۶ تجاویز منظور کیں۔

۱۱۔ ابتدائی تعلیم لازمی اور مفت کی جائے۔ جس کی مدت ۵ سال ہو۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کو ۸ سال کر دیا جائے۔

۱۲۔ تربیتی اداروں میں تحقیقی شعبے قائم کئے جائیں۔ جہاں تعلیم سے متعلق مسائل پر تحقیق کی جائے۔

۱۳۔ مدارس کو عام نظام تعلیم کے طرز پر لایا جائے۔

۱۴۔ کانفرنس نے تعلیم نسواں پر بھی کافی زور دیا۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم سے متعلق مسائل پر کانفرنس نے ۱۸ تجاویز پاس کیں۔ جن میں ایک تجویز یہ بھی تھی کہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں لڑکیوں کے لئے ایک ایک میڈیکل کالج قائم کیا جائے۔

۱۵۔ ابتدائی اسکولوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک ساتھ تعلیم دی جائے۔ لیکن ثانوی اسکول اور کالج لڑکے اور لڑکیوں کے لئے الگ الگ قائم کئے جائیں۔

۱۶۔ ایک ٹیکنیکل ایجوکیشن کونسل کو قائم کی جائے۔

۱۷۔ دوسرے ممالک سے سامان خریدتے وقت ان پر پابندی لگائی جائے کہ وہ پاکستانیوں کی مقررہ تعداد کو اپنے یہاں تربیت دیں گے۔

۱۸۔ سائنٹیفک اور انڈسٹریل ریسرچ کونسل قائم کی جائے۔

مندرجہ بالا چند تجاویز کی صحت، افادیت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اگر ان پر صدق دل سے عمل کیا جاتا تو آج پاکستان عملی میدان میں دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں شمار کیا جاتا۔ بانی پاکستان قائد اعظم کو اتنا وقت ہی نہیں ملا کہ وہ ان پر عمل کرا سکتے۔ کیوں کہ ان کو خالق حقیقی نے جلد ہی اپنے پاس

بلالیا۔ ان کے بعد کی حکومتوں نے کونسلیں وغیرہ تو ضرور قائم کیں۔ جن کا مقصد تعلیمی اصلاحات کی بجائے عزیز واقارب کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کرنا تھا۔ لیکن باقی باتوں پر صرف غور وخوض ہی ہوتا رہا۔ اور اس طرح اس کانفرنس سے وہ نتائج حاصل نہ ہو سکے جن کی امید تھی۔

چھ ۶ سالہ تعلیمی منصوبہ

چار سال کے مسلسل غور وفکر کے بعد ایک چھ سالہ تعلیمی منصوبہ تیار کیا گیا۔ اس منصوبے کی رپورٹ برائے ۱۹۴۷ء، ۱۹۵۷ء میں اس کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا گیا۔

"یہ منصوبہ ملک میں موجودہ تعلیمی مراعات کا پہلا اور مکمل منصوبہ ہے جس میں آئندہ چھ برسوں میں تعلیم کی ترقی و ترویج کے لئے ایک متوازن اور جامع پروگرام پیش کیا گیا ہے لیکن جب اس پر عمل شروع ہوا تو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اس کی بعض شقیں پوری نہیں کی جا سکتیں۔ کیوں کہ یہ منصوبہ کسی ایسے جامع منصوبہ کا حصہ نہیں تھا جس میں زندگی کے تمام شعبوں کی ترقی کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہو۔ جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ ملک کے اقتصادی ذرائع کے صحیح تجزیہ پر مبنی نہ تھا۔ اور اب اس کی جگہ پہلے پنج سالہ منصوبہ ۱۹۵۵-۶۰ء نے لی ہے"

یعنی پہلا چھ سالہ منصوبہ اس لئے ناکام ہوا کہ ملک کی اقتصادی حالت اچھی نہیں تھی۔ لیکن پہلا پنج سالہ منصوبہ جو زندگی کے تمام شعبوں کی ترقی کا لحاظ رکھ کر تشکیل دیا گیا تھا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری سے ملک میں تعلیم اور خواندگی کے جو اعداد و شمار جمع ہوئے تھے ان کی رو سے پاکستان کی آبادی کا ۹ء۱۸ فی صد خواندہ تھا۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں یہ خواندگی بڑھ کر ۲ء۱۹ فی صد ہو گئی۔ گویا ۱۹۵۲ء تا ۱۹۶۱ء کا ۳ء فی صد خواندگی میں اضافہ ہوا۔ حالاں کہ

آزادی کے بعد جس تیزی سے ملک میں تعلیمی اداروں کی تعداد میں اضافہ ہوا اس کے نتیجہ میں دس سال میں اس سے کہیں زیادہ خواندگی میں ترقی ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن آزادی کے بعد زندگی کی دوسری سہولتوں میں بھی کافی اضافہ ہوا اور ساتھ ہی ساتھ آبادی میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ یہ امر قابل افسوس ہے کہ خواندگی میں صرف اعشاریہ تین فی صد کا ہی اضافہ ہوا۔ اتنا اضافہ تو ہر حال میں ہی ہوتا۔ پہلا پنج سالہ منصوبہ خواہ بنتا یا نہ بنتا۔

ہماری رائے میں تعلیم میں ترقی نہ ہونے کی وجہ صرف یہ تھی کہ یا تو اس وقت کا حکمران طبقہ تعلیم کو ترقی دینا نہیں چاہتا تھا۔ یا اس میں قوت ارادہ کی کمی تھی۔

پہلا پنج سالہ منصوبہ ۱۹۶۰-۱۹۵۵ء

اس منصوبے کے چند بنیادی مقاصد مقرر کئے گئے تھے۔ ان میں سے خاص خاص درج ذیل ہیں :

۱۔ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسروں کو مالی امور میں زیادہ اختیار دے کر اسکول نظام کی مرکزیت کو کم کیا جائے۔

۲۔ ماہرین کی جماعتیں تیار کی جائیں۔ جو تعلیم کا سامان اور اسکول کی عمارتوں کے نقشے تیار کریں۔

۳۔ اسکولوں کی مقامی انتظامی کمیٹیاں اور ضلعی مشاورتی کمیٹیاں قائم کی جائیں۔

۴۔ زبانوں کی تعلیم کے لئے جدید طریقے اختیار کرنے کے انتظامات کئے جائیں اور زبان کے اساتذہ کو بہتر تربیت دی جائے۔

۵۔ انگریزی میں تعلیم کے طریقوں کو بہتر بنایا جائے اور اسے کالج کی سطح پر اختیاری مضمون قرار دیا جائے۔

۶۔ ٹیکنیکل ایجوکیشن کی ایک نظامت قائم کی جائے۔

۷۔ یونی ورسٹی گرانٹ کمیشن قائم کیا جائے۔ تاکہ اعلیٰ تعلیم کی بہتر نگرانی کی جا سکے اور اعلیٰ تعلیم کو مناسب مالی امداد دی جا سکے۔

۸۔ اس منصوبہ میں جن امور پر زیادہ توجہ کی سفارش کی گئی تھی ان میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) اساتذہ کی تربیت کو بہتر کیا جائے اور اساتذہ کی کمی کو پورا کیا جائے۔

(۲) پیشہ ورانہ اور ٹیکنیکل تعلیم پر خصوصی توجہ دی جائے۔

(۳) عمارتیں تعمیر کی جائیں اور لیبارٹریز کے لئے آلات اور سامان مہیا کیا جائے۔

(۴) اسکول اور کالجوں کی تعلیم کا معیار بہتر کیا جائے۔

اس سلسلہ میں یہ تحریر کر دینا نامناسب نہ ہوگا کہ بین الاقوامی تعلیمی کانفرنس کے ۳۳ ویں اجلاس میں پاکستان کی طرف سے جو رپورٹ سنہ ۱۹۷۱ء میں پیش کی گئی تھی۔ اس میں پہلے پانچ سالہ منصوبہ کی کارروائی کے بارے میں حسب ذیل رائے ظاہر کی گئی تھی۔

"پہلے پانچ سالہ منصوبہ کی کامیابی امید سے بہت کم رہی۔ ابتدائی مدارس میں طلبہ کی تعداد میں اتنا اضافہ نہیں ہوا۔ جتنا کہ منصوبہ میں اندازہ لگایا گیا تھا۔ لیکن ثانوی اسکولوں میں طلبہ کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ معیار تعلیم میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں آئی۔ انجینیرنگ گریجویٹس اور ٹیکنیشین افراد کی تعداد میں خاصہ اضافہ ہوا۔ لیکن منصوبہ کے اندازہ سے بہت کم۔ اعلیٰ تعلیم میں منصوبہ کے پانچ سال میں طلبہ کی تعداد دگنی ہو گئی۔ لیکن ان اداروں میں تعلیمی سہولتوں میں اس تناسب سے اضافہ نہ ہو سکا جس کی امید تھی۔"

حکومت کی مندرجہ بالا رائے سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ پہلا پانچ سالہ منصوبہ بالکل ناکام رہا۔ جو تھوڑی بہت کامیابی اس پانچ سال میں حاصل ہوئی اس کو بھی منصوبہ کی کامیابی نہیں کہا جا سکتا۔ چھ سالہ منصوبہ کے سلسلہ میں تحریر کیا جا چکا ہے کہ سنہ ۱۹۵۱ء تا سنہ ۱۹۶۱ء کے دس سالہ دور میں صرف صفر اعشاریہ تین فی صد کی ترقی ہوئی جو بہت ہی کم ہے۔

پہلے منصوبے کے تعلیمی اخراجات

پہلے پانچ سالہ منصوبے کے لئے جو رقم مخصوص کی گئی تھی۔ وہ بالکل نامناسب تھی۔ پاکستان کی اسی فی صد آبادی ناخواندہ تھی۔ اس لئے ہر ممکن کوشش عوام کو قریب لانے کے لئے کرنی چاہیئے تھی۔ اور اس مقصد میں کامیابی کے لئے ابتدائی تعلیم پر توجہ دینی ضروری تھی۔ لیکن منصوبے میں ثانوی و اعلیٰ ثانوی تعلیم کو فوقیت دی گئی تھی۔ ابتدائی تعلیم کے لئے دس کروڑ پچاس لاکھ روپے مخصوص کئے گئے تھے۔ جب کہ ثانوی تعلیم کے لئے پندرہ کروڑ پچاس لاکھ اور اعلیٰ تعلیم کے لئے سولہ کروڑ پچاس لاکھ روپے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد دوسری قابل توجہ بات تربیت اساتذہ کا مسئلہ تھا۔ لیکن اس کو بھی نظر انداز کر دیا گیا جس کا اندازہ اس رقم سے بخوبی ہو سکتا ہے جو اس کے لئے مخصوص کی گئی تھی۔ تین کروڑ اسی لاکھ لیکن اس سے زیادہ ستم ظریفی کیا ہو گی کہ اس مد پر صرف ۹ لاکھ روپیہ ہی صرف کیا گیا۔ پاکستان میں ماہرین تعلیم کی کمی ہے۔ اس کمی پر قابو پانے کے لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ یہاں پر ایک ایسا مرکز قائم کیا جاتا جہاں جرمنی، جاپان فرانس۔ انگلستان اور امریکہ سے ماہرین کو بلایا جاتا۔ اور وہ پاکستانیوں کو تربیت دے کر اس قابل بناتے کہ وہ اپنے ملک میں جدید رجحانات کے اساتذہ پیدا کر سکتے۔ ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ پاکستان کے اساتذہ کو وظائف دے کر بیرون ملک بھیجا جاتا۔ وظائف کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ

حکومت نے اس کے لئے صرف ایک کروڑ بیس لاکھ روپے مخصوص کئے تھے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ اس رقم میں سے بھی صرف چالیس لاکھ روپے صرف کئے گئے۔ درج ذیل گوشوارے پہلے پنج سالہ منصوبہ کو بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے:

مد	مخصوص کی ہوئی رقم	رقم جو خرچ کی گئی	مخصوص رقم کا فی صد
ابتدائی تعلیم	۱۰ کروڑ پچاس لاکھ	۷ کروڑ ۴۰ لاکھ روپے	۷۰
ثانوی تعلیم	۱۵ کروڑ پچاس لاکھ	۷ کروڑ ۱۰ لاکھ روپے	۴۶
تربیت اساتذہ	۳ کروڑ اسی لاکھ	۹ لاکھ روپے	۲۳
ٹیکنیکل	۵ کروڑ	۲ کروڑ ۲۰ لاکھ روپے	۴۳
میڈیکل	اعداد و شمار نہیں دیئے گئے۔		×
زراعت	اعداد و شمار نہیں دیئے گئے۔		،
کالج کی تعلیم	۷ کروڑ ۷۰ لاکھ روپے	۴ کروڑ ۶۰ لاکھ روپے	۶۰
یونی ورسٹی	۸ کروڑ ۸۰ لاکھ روپے	۵ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے	۶۳
وظیفے	۱ کروڑ ۲۰ لاکھ روپے	۴ لاکھ روپے	۳۲

قومی تعلیمی کمیشن

COMMISSION ON NATIONAL EDUCATION

شریف کمیشن (۱۹۵۹ء)

Sharif's Commission 1959.

تعلیم قوم کی ترقی و تنزلی میں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے کیونکہ اسی سے قومیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ ہر دور کی خصوصیات ہوتی ہیں ان روایات کی بدولت تعلیم میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہنی چاہئیں۔ تعلیم میں یہ تبدیلیاں ایک محرک کا درجہ رکھتی ہیں۔ جب ہم پاک و ہند کی تعلیم پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سلسلہ ۱۸۸۲ء کی کمیشن رپورٹ سے شروع ہوا۔ جو آج تک جاری و ساری ہے۔ تعلیم میں وقت کے مطابق تبدیلیاں ہوتی رہنی چاہئیں ورنہ ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ تعلیم کو بہتر بنانے کے لئے جتنی زیادہ کوششیں کی جاتی ہیں۔ اتنا ہی معیار تعلیم بہتر ہوتا جاتا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ قومی تعلیمی کمیشن کے ان الفاظ سے بخوبی لگایا جا سکتا

ہے۔ جو اس نے تعلیم کی از سرِنو تنظیم کے بارے میں کہے تھے۔

" تعلیم ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ جس کے لئے ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو نہ صرف تعلیمی نظم ونسق سے واقف ہوں۔ بلکہ تعلیمی امور کو سمجھنے کی قابلیت بھی رکھتے ہوں۔ ایک ناظم تعلیم کو تدریس کے اصولوں۔ نصاب کی ضرورتوں اساتذہ و طلبہ کی قدر و قیمت اور دیگر ممالک کے تعلیمی نظم ونسق سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیئے۔ ان میں قابلیت کے علاوہ قیادت کی صفات بھی ہونی چاہئیں سب کو وہی تنخواہ وہی مواقع اور ترقی دی جائے جو کہ سول سروس کے ملازمین کو دی جاتی ہے۔ اس طرح محکمہ میں اعلیٰ دماغ کے لوگ آئیں گے۔

صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں مرحوم نے جب یہ محسوس کیا کہ جو تعلیم ہم اپنے نو ن چمن کو دے رہے ہیں۔ وہ وقت کا حال اور ہمارے قومی تقاضوں کے مطابق نہیں ہے۔ تو انھوں نے ۳۰ دسمبر ۱۹۵۸ء کو قومی تعلیم کی اصلاح کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا۔ جس کے چیئرمین جناب ایس۔ ایم شریف تھے۔ اور درج ذیل حضرات اس کمیشن کے ممبر تھے۔

۱۔ ایم۔ رضی الدین صدیقی	۲۔ ایم۔ کے۔ آر۔ فریدی
۳۔ ایس حامد شاہ	۴۔ اے۔ الیف۔ ایم عبدالحق
۵۔ اے۔ الیف۔ اطوار حسین	۶۔ مختار احمد
۷۔ محمد خان	۹۔ ایم۔ اے۔ رشید
۸۔ آر۔ ایم۔ الیونگ۔	

صدر پاکستان نے کمیشن کے ممبران سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

" اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ موجودہ نظام تعلیم کی تشکیل و تنظیم از سرِنو کی جائے۔ تاکہ ایسی قوم جنم لے۔ جو ہماری روحانی۔ اخلاقی اور ثقافتی

اقدار کی عکاسی کر سکے۔ نظام تعلیم ایسا ہونا چاہیئے جو قوم کے روز افزوں تقاضوں اور ضرورتوں کو پورا کر سکے ۔ اور زرعی ۔ فنی اور عملی ترقی میں مدد دے ۔ ہمارے نظام تعلیم کی یہ بھی خصوصیت ہو کہ وہ اعلیٰ کردار کی تشکیل کرے اور محنت کی عظمت و قدر لوگوں کے دلوں میں پیدا کرے "

اس سے بیشتر قائداعظم نے بھی نومبر ۱۹۴۷ء کو تعلیمی کانفرنس بلائی تھی جس سے ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں ۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد سے ہی تعلیم پر خاطر خواہ توجہ دی جا رہی ہے ۔

پرائمری تعلیم PRIMARY EDUCATION

پس منظر : حکومت انگلستان کو ہندوستانیوں کی ابتدائی تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔ ان کا تعلیمی لائحہ عمل ان کی سیاسی پالیسی کا عکس تھا ۔ ابتدا میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور انگریزی حکومت کا بڑا مقصد تجارت کی ترقی و ترویج تھا ۔ اور یہ جب ہی ممکن ہو سکتا تھا جبکہ پاک و ہند کے عوام جاہل اور ناخواندہ رہیں ۔ ان کو صرف ان لوگوں کی تعلیم و تربیت سے دلچسپی تھی جو ان کے معاون اور مددگار رہیں ۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیم پر زیادہ توجہ دی ۔ اس طرح انگریزوں نے ملک کے اونچے طبقے میں ایک ایسا گروہ تیار کر لیا جو ان کے لئے مددگار و معاون ثابت ہو ۔ لازمی اور ابتدائی تعلیم کو سب سے بیشتر پروفیسر گوکھلے اور قائداعظم نے ملک اور قوم کے سامنے پیش کیا ۱۹۱۲ء

تک یہ دونوں مل کر اس کے لئے کوشاں رہے لیکن ناکام رہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد انگریزوں نے اصلاحات نافذ کرنے کی کوشش کی جو ۱۹۱۹ء جو مونٹیگو جیمس فورڈ کی اصلاحات کے نام سے مشہور ہیں۔ اس کے مطابق چند صوبوں کی وزارتیں منتخب شدہ ممبروں کو دی گئیں۔ اس طرح "قلمدان وزارت" ایک منتخب شدہ ممبر کو دیا گیا۔ اس طرح ابتدائی تعلیم میں دلچسپی پیدا ہوئی ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۲ء تک مختلف صوبوں میں لازمی تعلیم کے قانون پاس کئے گئے۔ ان قوانین کی رو سے "مقامی خود اختیاری حکومتیں" اس بات کی مجاز تھیں کہ وہ اپنے علاقوں میں لازمی تعلیم کے قوانین نافذ کرسکیں لیکن ان کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ کیونکہ ترقی یافتہ ممالک میں لازمی تعلیم کو لوکل باڈیز کے سپرد نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ حکومت نے اس کو خود اپنی ذمہ داری قرار دیا ہے۔ اور ان کی تعلیمی پالیسی میں اس بات کو واضح کر دیا گیا ہے کہ کوئی حکومت لازمی تعلیم کو اس کی مقررہ مدت کے اندر اندر کامیاب نہ بنائے گی تو اس کو عوام کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ ہمارے ملک میں یہ ناقص تعلیم لازمی تعلیم کے قانون کمیشن رپورٹ تک برابر جاری رہی۔ اس کمیشن نے سب سے پہلے اس اصول کو تسلیم کیا کہ ابتدائی لازمی تعلیم کی ذمہ داری حکومت پر ہونی چاہیئے۔

۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے بعد ابتدائی تعلیم میں توسیع ہونی شروع ہوئی لیکن ساتھ ساتھ اس کے نظام میں بنیادی کمزوریاں بھی پیدا ہوگئیں۔ ۱۹۲۹ء میں جب انگریزی حکومت نے نئی اصلاحات کرنے کا ارادہ کیا تو انھوں نے "ہارٹگ کمیٹی" کے ذریعہ تعلیمی ترقی کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ اس کمیٹی نے دو

نقائص کی نشان دہی کی۔

۱۔ ضیاع WASTAGE

طلبہ کی اکثریت جو پہلی جماعت میں داخلہ لیتی ہے۔ ابتدائی تعلیم کی تکمیل سے پہلے مدرسہ چھوڑ دیتی ہے۔ اس کمیٹی کی تحقیقات کے مطابق صرف ایک صوبہ میں ۳۸% بچے پہلی جماعت کے بعد تعلیم کو خیرباد کہہ دیتے ہیں کچھ کو تو مالی مشکلات ایسا کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں لیکن بیشتر ویسے ہی پڑھائی سے بھاگ جاتے ہیں۔ محض ۱۸% بچے پانچویں جماعت تک پہنچتے ہیں۔ اس طرح سو میں سے ۸۲ بچے کسی نہ کسی جماعت سے مدرسہ چھوڑ دیتے ہیں۔ جو ملکی اور تعلیمی نقصان ہے۔

۱۔ جمود STAGNATION

اس کا مطلب یہ ہے کہ بچہ ایک جماعت میں کئی کئی سال گزار دیتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ابتدائی جماعتوں میں طلبہ کی تعداد کثیر ہو جاتی ہے۔ بچہ کے ناکام ہونے سے والدین اور بچہ خود تعلیم سے دل برداشتہ ہو جاتا ہے یہ بھی ایک بڑا سبب ہے۔ جس سے تعلیم میں جمود قائم ہو جاتا ہے۔

۱۸۵۴ء کے مراسلے کے بعد سارجنٹ کمیٹی جو ۴۴ - ۱۹۴۲ء میں قائم کی گئی تھی۔ اس نے ابتدائی تعلیم کے سلسلہ میں اہم سفارشات پیش کیں سارجنٹ کمیٹی نے لوکل باڈیز کے نظم و نسق پر شدید نکتہ چینی کی۔ اس کے مطابق لوکل ادارے مقامی اور لازمی تعلیم کے قانون کو عملی جامہ پہنانے سے قاصر رہے ہیں۔ اور حکومت نے یہ ذمہ داری ان اداروں کے سپرد کر کے سخت

غلطی کی ہے۔ لازمی تعلیم سے اگر عوام کو فائدہ پہنچانا مقصود ہے تو پھر یہ خود حکومت کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے۔ حکومت کو یہ بھی اعلان کر دینا چاہیئے کہ ایک خاص مدت میں وہ سو فی صدی لازمی تعلیم کے قانون کو نافذ کرے گی۔

سارجنٹ کمیٹی نے لازمی تعلیم کا ایک جامع منصوبہ تیار کیا۔ جس کی رو سے ۲۵ سال کی مدت میں سو فی صدی خواندگی کی ضمانت دی گئی اور اس سلسلے میں اس کمیٹی نے تمام تفصیلات کو بھی مدنظر رکھا۔ لیکن سیاسی تبدیلیوں کی بنا پر اس کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔

قیام پاکستان کے بعد کراچی تعلیمی کانفرنس ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۹ء میں بھی ابتدائی تعلیم کے مسئلہ پر غور و خوض کیا گیا اور چھ سالہ تعلیمی منصوبہ تیار کیا گیا۔ ان چھ سالوں میں ۲۴۰۲۷۔ ابتدائی اسکول قائم کرنے کی تجویز رکھی گئی اور یہ بھی امید کی گئی کہ اس سے تقریباً ملک کے دو تہائی بچوں کے لئے جن کی عمر ابتدائی مدرسے اور تعلیم کے لئے ضروری ہے۔ تعلیم کا انتظام ہو سکے گا اس کے بعد جو اہم سفارشات تعلیمی کمیشن نے کی ہیں۔ ان پر عمل کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔

تعلیمی کمیشن نے ان تمام حقائق کو جو مندرجہ بالا سطروں میں بیان کئے گئے ہیں۔ اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ کیونکہ ہم دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر ہی اپنے لئے عمدہ اور درخشندہ مستقبل کی بنیاد ڈال سکتے ہیں۔ ایک جمہوری نظام میں ہر فرد کو ملکی حالات۔ سیاسی جماعتوں کے نظریات، اور اخبارات کا مطالعہ کرنے کا موقع ملنا چاہیئے اور یہ تب ہی ممکن ہے۔ جب ہم اپنے افراد کو زیور تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کریں۔ اس لئے ابتدائی تعلیم مت اہم اور ضروری ہے۔

پاکستان کا موجودہ نصاب پانچ سال ہے لیکن آئندہ پندرہ سال میں جب پرائمری تعلیم لازمی بنائی جائے گی تو اس کی مدت ۸ سال کردی جائے گی۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے میں ۱۵۰۲۰۰ نئے اسکول کھولے گئے اور تیسرے پنج سالہ منصوبے کے تحت پرائمری سطح تک خواندگی کا معیار ۴۵ فی صدی سے بڑھ کر ۷۰ فی صدی تک کرنا ہے۔ پرائمری سطح پر ہی بچوں کو عملی فنون کی طرف بھی راغب کیا جائے گا اور پرائمری تعلیم کے فروغ کے لئے حکومت ساٹھ کروڑ روپیہ صرف کرے گی۔

نقائص
Weaknessess of the Present Primary Education

متوازن نظام تعلیم میں ابتدائی مدرسے کی تعلیم کو مفت، لازمی اور ہمہ گیر ہونا چاہیئے۔ ہمارے ملک میں نہ تو یہ لازمی ہے۔ نہ مفت اور نہ ہی ہمہ گیر۔ مفت تعلیم کا تصور ترقی یافتہ ممالک میں یہ ہے کہ طلبہ کو محض معافی فیس کی رعایت نہیں ہوتی بلکہ کاپیاں، کتابیں، پنسلیں اور دیگر تعلیمی سہولتیں بھی مفت مہیا کی جاتی ہیں بعض ممالک میں دوپہر کا کھانا یا دودھ کا انتظام بھی کیا جاتا ہے۔ مصر میں ابتدائی تعلیم کے مدرسوں میں دوپہر کا کھانا حکومت کی طرف سے مفت ملتا ہے۔ جس کا بچوں کی صحت اور حاضری پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ یورپ میں اور خصوصاً جرمنی میں لازمی تعلیم کے قانون کو شروع ہی سے نہایت سختی سے نافذ کیا گیا ہے اگر ایک مزدور خاندان ایک شہر سے دوسرے شہر میں جاتا ہے تو سب سے پیشتر اس کو پولیس اسٹیشن جاکر یہ اطلاع دینی پڑتی ہے کہ اس نے اپنے بچوں کو کس اسکول میں داخل کرایا ہے۔ اس مثال سے پرائمری تعلیم کی اہمیت وافادیت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ جبکہ ہمارے ملک میں بچوں کو داخلہ تک نہیں ملتا

والدین کی اقتصادی حالت
PARENTS, FINANCIAL POSITION

ملک میں غربت اور افلاس کا عالم یہ ہے کہ والدین کو اپنے بچوں کو بھی مجبوراً کام پر بھیجنا پڑتا ہے کسان کے بچے زراعت میں اس کی مدد کرتے ہیں اور شہر کے

غریب طبقے کے بچے شروع ہی سے کوئی نہ کوئی کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس لئے یا تو وہ اسکول میں داخل ہی نہیں ہوتے اور اگر داخل ہو بھی جائیں تو باقاعدہ حاضر نہیں ہوتے۔ اور اگر استاد حاضری پر مجبور کرتا ہے تو والدین ان کو مدرسے سے اٹھا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض پس ماندہ ملکوں میں "جز وقتی" اسکول کھولے جاتے ہیں۔ مصر میں یہ تجربہ کیا گیا ہے کہ ابتدائی اسکول صبح کے وقت بہت پہلے شروع کر دیئے جاتے ہیں اور بچوں کو جلد ہی چھٹی دے دی جاتی ہے تاکہ وہ کھیتوں میں اپنے والدین کی مدد کر سکیں۔

ابتدائی تعلیم کا نصاب CURRICULUM OF PRIMARY EDUCATION

پرائمری تعلیم کے نصاب اور معاشرے کے اقتصادی ڈھانچے میں توازن نہیں ہے۔ اگر بچہ ابتدائی تعلیم کو مکمل بھی کر لیتا ہے تو وہ اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ معاشرے میں کوئی کام کر سکے۔ نصاب تعلیم بچہ کو اپنے آبائی پیشے سے متنفر کر دیتا ہے اور اس میں کچھ ایسے رجحانات پیدا ہو جاتے ہیں کہ وہ بجز ملازمت اور کچھ نہیں کر سکتا۔ ساتھ ہی ساتھ ملک میں ایسے مواقع کی بھی کمی ہے اگر معاشرے میں بنیادی طور سے اقتصادی تبدیلی ہو اور صنعتی انقلاب زیادہ ہمہ گیر انداز میں ملک کی حالت کو بہتر بنا سکے تو اس حالت میں یہ ممکن ہے کہ ملازمتوں کا میدان بھی وسیع ہو سکے لیکن موجودہ اقتصادی حالت میں اس مشکل کو دور کرنے کی عملی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ نصاب تعلیم میں ایسے مضامین کو شامل کیا جائے جن کا تعلق بچے کے آبائی پیشے سے ہو۔ تاکہ دوران تدریس اس کو اس سے دلچسپی ہو سکے اور بعد میں وہ اس کو اپنا کر خاطر خواہ ترقی کر سکے۔

یہ نظام تعلیم مہنگا سست اور مسرفانہ ہے COSTLY SLOW & USELESS

یہ نظام مہنگا اس وجہ سے ہے کہ اگر پہلی جماعت میں دیہاتوں میں سو لڑکے اسکول میں داخل ہوتے ہیں تو آخری جماعت تک صرف ۱۵ بچے رہ جاتے ہیں۔ اس طرح ۸۵ فی صد طلبہ پر جو روپیہ صرف ہوا۔ وہ یقیناً اسراف بے جا ہے۔ اس لحاظ سے یہ نظام تعلیم مسرفانہ ہے۔ اور چونکہ سو میں سے پندرہ بچوں نے اسے مکمل کیا ہے۔ اس لئے یہ مہنگا بھی ہے۔ ہمارے ملک میں خواندگی کی رفتار بہت سست ہے۔ موجودہ خواندگی کی تعداد ۱۹،۲ ہے جس کی اہم وجہ تعلیم کا زندگی سے بُعد ہے۔ دنیا کے تمام ممالک میں تعلیم سے افراد میں اوصاف حمیدہ پیدا کئے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی روزی مناسب طور سے کمانے کے قابل بھی ہوتے ہیں۔ جبکہ پاکستان میں ایسا نہیں ہے۔

لوکل باڈیز کی ذمہ داری RESPONSIBILITY OF LOCAL BODIES

پرائمری تعلیم کا انتظام اور ذمہ داری لوکل باڈیز کے ذمہ رہی ہے جن کی اہلی بے قاعدگی اور اخراجات کے بارے میں ہمیشہ ہی بہت سی باتیں مشہور رہی ہیں ان اداروں نے کبھی خلوص سے تعلیم پر توجہ نہیں دی۔ آج بھی ان کے ادارے بڑی کسمپرسی کے عالم میں ہیں۔ یہ بھی ایک بڑی وجہ ہے کہ ہماری ابتدائی تعلیم بہت ہی پسماندہ ہے۔

ضیاع اور جمود WASTAGE & STAGNATION

ہارڈنگ کمیٹی نے ابتدائی تعلیم کے دو بڑے نقائص "ضیاع اور جمود" قرار دیئے تھے۔ کمیٹی کے مطابق پہلی جماعت کے بعد ۳۸٪ بچے مدرسہ چھوڑ دیتے ہیں۔ محض ۱۸٪ بچے پانچویں جماعت تک پہنچتے ہیں اور عام طور پر پورے ملک میں ہر چار بچوں میں ایک بچہ مدرسہ چھوڑ دیتا ہے اور تقریباً ۳۸٪ طلبہ جو ابتدائی تعلیم کو پورا کر لیتے ہیں۔ پانچ سال کے بعد لکھنا پڑھنا بھول جاتے ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ تعلیم کا زندگی سے کوئی واسطہ نہیں رہتا۔

جمود سے مراد ایک بچہ کا ایک ہی جماعت میں سالہا سال تک پڑے رہنا ہے ترقی یافتہ ممالک میں ابتدائی مدرسہ کا بچہ تعلیمی ضابطے کے لحاظ سے فیل نہیں کیا جاسکتا۔ تعلیمی کمیشن نے بھی اس سلسلے میں تجاویز پیش کی ہیں۔

داخلہ اور حاضری کی بے قاعدگی ADMISSION & ABSENTEES

ابتدائی مدارس میں داخلہ سارے سال ہوتا رہتا ہے۔ معاشرے کی خرابیوں اور دیگر برائیوں کی وجہ سے اس میں کوئی قاعدہ یا قانون نہیں اپنایا جاتا۔ ظاہر ہے کہ جو بچہ بعد میں داخل ہوگا۔ وہ پہلے داخل ہونے والے سے کمزور ہوگا۔ اس کمزوری کی وجہ سے اس میں مختلف برائیاں مثلاً غیر حاضر رہنا احساس کمتری کا پیدا ہونا وغیرہ پیدا ہوجاتی ہیں۔ اور جو کمزوریاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ وہ بڑھتے بڑھتے اس کو مدرسہ چھوڑنے پر مجبور کردیتی ہیں۔

طریقہ تدریس METHOD OF TEACHING

ابتدائی تعلیم کے طریقہ تدریس۔ نظم وضبط وغیرہ میں کچھ ایسی خامیاں ہیں جن کی وجہ سے ہمارا معیار تعلیم ترقی کرنے سے قاصر ہے۔ دیہاتوں میں ۷۶ % اسکول ایسے ہیں۔ جہاں صرف ایک استاد ہی پڑھاتا ہے۔ اساتذہ غیر تربیت یافتہ ہیں۔ اس لئے ان کا طریقہ تدریس خامیوں سے پُر ہے۔

مدارس کا معائنہ INSPECTIONS

پاکستان کی تقریباً ۸۰ % آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے۔ وہاں کے مدارس کے معائنہ کا کوئی مناسب انتظام نہیں ہوتا۔ معائنہ کرنے والے حضرات میں ہمدردی اور رہنمائی کی بجائے عیب جوئی کے جذبات زیادہ پائے جاتے ہیں۔ محکمہ پولیس کی طرح ان کے آفیسر بھی برائیوں سے پُر ہوتے ہیں۔ جن کا ردِ عمل الٹا ہوتا ہے۔

مقامی لوگوں کی عدم دلچسپی NON COOPERATION OF THE MASSES

مقامی لوگوں کو تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ دنیا کے اکثر ممالک میں امیر لوگ اس میں کافی مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن پاکستان میں اس جذبے کا فقدان ہے جس کی اہم وجہ قومی جذبات اور ملکی ترقی سے لاپروائی بھی ہے۔

مذہبی جذبات کا فقدان LACK OF RELIGIOUS FEELINGS

پاکستان مذہبی نظریات پر وجود میں آیا ہے جس کی وجہ سے معاشرے پر بھی اس کے گہرے اثرات ہیں۔ اس لئے مذہبی جذبات کو بھی ابتدائی تعلیم کی ترقی و ترویج اور توسیع کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے "مکتب اسکیم" اس کی بہترین مثال ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ مذہبی لوگ اپنے اغراض و مقاصد کی وجہ سے بجائے مذہبی خدمات کے سیاست میں زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں جس سے قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے۔ پاکستان میں اس قسم کی تحریکیں بھی نہیں ہیں جو تعلیم و تربیت کے فروغ کے لئے کوشاں ہوں۔

ہمہ گیر تعلیم کی اہمیت IMPORTANCE OF UNIVERSAL EDUCATION

ایک متوازن نظام تعلیم کی بنیادیں نہایت مضبوط، وسیع اور اعلیٰ ہونی چاہئیں۔ ایک اچھا نظام تعلیم معیاری بنیادوں کے بغیر مستحکم نہیں رہ سکتا اس لئے ہر اچھے نظام تعلیم میں زیادہ توجہ اور خرچ ابتدائی تعلیم پر کیا جاتا ہے اور جوں جوں تعلیم کی بلند منازل آتی جاتی ہیں۔ ایک طرف تو طلبہ کی تعداد میں کمی ہوتی جاتی ہے اور دوسری طرف خرچ بھی کم ہوتا جاتا ہے۔ لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ملک میں معاملات اس کے برعکس ہیں۔ ثبوت یہ ہے کہ تعلیمی کمیشن نے سب سے زیادہ اہمیت اعلیٰ تعلیم کو دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی ابتدا پہلے باب

سے کی گئی ہے۔ جبکہ ابتدائی تعلیم پہ پانچویں باب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ حالانکہ ہمارے خیال میں پہلے باب میں ابتدائی تعلیم پر بحث کی جاتی کیونکہ یہی سب سے اہم زینہ ہے ایک ماہر تعلیم کا مقولہ ہے "بچے کے ابتدائی چھ سال مجھے دے دیجئے اور پھر اس کی ساری زندگی آپ لے لیجئے۔" اس قول سے ابتدائی تعلیم کی اہمیت و افادیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ ابتدائی تعلیم کو گزشتہ سو سال سے مغربی ممالک میں بہت اہمیت دی جا رہی ہے۔ جرمنی کے بادشاہ "فریڈرک اعظم" نے اپنی قوم کے لئے ۱۷۶۰ء میں لازمی اور جبری ابتدائی تعلیم کا حکم نافذ کیا تھا۔ جبکہ انگلستان نے ۱۸۸۰ء میں ایسا کیا تھا۔

ابتدائی تعلیم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بچہ اپنے گرد و نواح کو سمجھے اور اسے اپنی قدرتی صلاحیتوں کا علم ہو سکے۔ اس کی مخفی صلاحتیں اس ہیرے کی مانند ہوتی ہیں جو سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں پنہاں ہوتا ہے۔ اور پھر اپنی روشنی سے دنیا کو منور کرتا ہے۔ ہم بچوں کی صلاحیتوں کو ابتدائی تعلیم میں ہی اجاگر کر سکتے ہیں۔ اگر ہم بچے کی ابتدائی تعلیم پر توجہ نہیں دیں گے۔ تو اس کی مثال ایک لوہے کے ٹکڑے کی سی ہو گی۔ جسے ہم پھینک دیں تو کچھ عرصہ بعد خود بخود زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہم کو چاہیئے کہ اپنے بچوں کے ذہنوں کو کسی صورت میں بھی زنگ آلود نہ ہونے دیں کیوں کہ وہ قوم کا سرمایہ۔ قوم کی حیات اور قوم کی روح ہوتے ہیں۔

دورِ جدید میں پرائمری تعلیم Primary Education اور لازمی تعلیم Compulsory Education میں تھوڑا سا فرق ہے۔ لازمی تعلیم کی مدت پرائمری تعلیم کے مقابلہ میں زیادہ ہوتی ہے۔ بعض ممالک میں یہ مدت بارہ برس تک کر دی گئی ہے۔ جبکہ پرائمری تعلیم کی مدت کم ہوتی ہے۔

پرائمری تعلیم کے مقاصد
AIMS OF PRIMARY EDUCATION

۱۔ ملک کے تمام بچوں کی اخلاقی جسمانی اور ذہنی نشو و نما ہونی چاہیئے۔
۲۔ بچوں میں تجسس۔ محنت اور دیانت داری جیسی قابل قدر عادات کی بنیاد ڈال دی جائے۔
۳۔ بچے اپنے گرد و نواح کے سمجھنے کے قابل بنا دیئے جائیں۔
۴۔ بچوں کو حقوق و فرائض سے آگاہ کیا جائے۔
۵۔ اس صنعتی دور میں بچوں کو ایسی تعلیم دی جائے۔ جس سے وہ بہتر کارکن بن سکیں۔

اس سلسلہ میں تعلیمی کمیشن نے جو سفارشات کی ہیں۔ وہ مندرجہ ذیل ہیں :
۱۔ ایسی تعلیم مہیا کی جائے جو بچوں کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کی نشو و نما کر سکے۔
۲۔ بچے کو ایسی تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کیا جائے جو اس کی صلاحیتوں اور رجحانات کے مطابق ہو۔
۳۔ بچوں میں شہری ذمہ داری کے احساس کا جذبہ پیدا کرنا اور وطن سے محبت اور اس کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا۔
۴۔ خود اعتمادی اور جذبہ تجسس کی نشو و نما۔
۵۔ جسمانی فعالیتوں کے لئے بچوں میں پسندیدگی پیدا کرنا اور جسمانی نشو و نما کے لئے کھیلوں کی اہمیت سے آگاہی۔
۶۔ سائنسی طرز فکر پیدا کرنا۔
۷۔ بین الاقوامی افہام و تفہیم پیدا کرنا اور ان میں عالمی بھائی چارہ کا جذبہ پیدا کرنا۔
۸۔ قومی اور مادری زبان پر خاص توجہ دینا۔

کمیشن رپورٹ کے مطابق پہلے پانچ سال کی تعلیم سارے ملک میں

رائج کی جائے گی تقریباً ۱۹۷۰ء تک اور اس کے بعد لازمی تعلیم کی مدت ۸ سال کی جائے گی۔ اور اس کی تکمیل مزید پانچ سال میں ہو گی یعنی ۱۹۷۵ء تک۔

نصاب CONTENT

۱۔ اردو، بنگالی، سندھی، اور پنجابی میں سے کوئی ایک مادری زبان۔
۲۔ غیر مادری زبان۔ اردو۔ غیر ملکی زبان انگریزی بطور زائد مضمون۔
ابتدائی اور روزمرہ حساب۔
۳۔ عام سائنس
۴۔ سوشل سائنس
۵۔ جسمانی تعلیم
۶۔ مذہبی تعلیم اور عملی فنون۔

اسکولوں کا آغاز قومی ترانہ سے ہوگا۔ ہر جماعت میں دستی کام لازمی ہوگا۔ قومی زبان پر خاص توجہ دی جائے گی اور بچوں کا نصاب ایسا ہوگا جو اخلاقی تعمیر کے علاوہ ان کی شخصیت کے مخفی پہلوؤں کو بھی اُجاگر کرے گا۔

جب ہمارے سامنے یہ حقائق ہیں کہ ہم اپنی ابتدائی تعلیم سے بچے کے ہر پہلو کی نشوونما کریں گے اور پھر ان مقاصد کو بھی پیش نظر رکھیں گے۔ جو ابتدائی تعلیم کے روح رواں ہوں تو پھر کوئی ذی فہم ابتدائی تعلیم کی اہمیت سے انکار نہیں کرسکتا۔

SUGGESTIONS FOR IMPROVEMENT

ہمہ گیر تعلیم کے مسائل اور اصلاحی تجاویز

منصوبہ کتنا ہی بہتر کیوں نہ ہو جب تک معاشرہ کا اشتراک و تعاون حاصل نہیں ہوگا۔ کامیابی ناممکن ہے اگر ہم کو ابتدائی تعلیم کو فروغ دینا ہے تو مندرجہ ذیل باتوں پر توجہ دینی لازمی ہے۔

معاشرے کا تعاون COOPERATION FROM THE SOCIETY

ابتدائی تعلیم کی کامیابی کا انحصار معاشرے کے تعاون پر ہے۔ اس کو ہم کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ابتدائی تعلیم کا کتنا ہی عمدہ اور اچھوتا منصوبہ کیوں نہ تیار کریں۔ جب تک معاشرہ کا تعاون حاصل نہ ہوگا وہ منصوبہ کبھی بھی کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔

ناخواندگی کا مسئلہ PROBLEM OF ILLITERACY

انیسویں صدی سے پہلے مغربی اقوام کی بھی یہی حالت تھی جو آج ہماری ہے۔ ان کے معاشرے کا اقتصادی، معاشرتی اور مادی پہلو ہمارے ماحول سے بھی بدتر تھا۔ لیکن انیسویں صدی کے آخر میں جو نمایاں ترقی انھوں نے کی اس کی اہم وجہ قومیت پرستی کا احیا ہے ہر قوم کو احساس تھا۔ کہ اگر ان کو بین الاقوامی حیثیت حاصل کرنی ہے تو ملک سے ناخواندگی کا خاتمہ ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں جرمن قوم سب سے آگے تھی۔ چنانچہ جب ۱۸۷۰ء میں جرمن اور فرانس کی جنگ میں جرمنی کو کامیابی نصیب ہوئی۔ تو کسی نے جرمنی کے سپہ سالار سے سوال کیا کہ اس فتح کا سبب کیا تھا۔ تو اس نے جواب دیا کہ اس جنگ کو جرمنی کے فوجیوں نے نہیں بلکہ اس کے ابتدائی اسکولوں کے اساتذہ اور ان کی تعلیم نے کامیاب کیا ہے۔ یہی جذبہ ہم بھی اپنی قوم میں پیدا کر سکتے ہیں۔ اس ضمن میں قرآن پاک اور احادیث کے حوالوں کی اہمیت سے بھی آگاہ کیا جا سکتا ہے۔ ہماری ترقی اور کامرانی اسی میں ہے کہ ہم خواندگی کے مسئلہ کو اوّلیت دیں۔ اور قوم کے ہر فرد کو اس کی اہمیت اور افادیت سے آگاہ کریں۔

معاشی مسئلہ FINANCIAL PROBLEMS

پاکستان میں اقتصادی مسئلہ تعلیم میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے حالانکہ

قوم کی فلاح و بہبود کا دارومدار معاشی حالت پر ہوتا ہے۔ کیونکہ معاشیات ہی پوری زندگی کا محور ہوتی ہے۔ ہم کو ابتدائی تعلیم کے لئے کثیر سرمائے کی ضرورت ہے۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے کے مطابق ابتدائی مدارس کے طلبہ کی تعداد ستر لاکھ سے بڑھا کر ایک کروڑ چالیس لاکھ کر دی جائے گی جس کی کامیابی کے لئے ایک لاکھ سولہ ہزار مزید اساتذہ کی ضرورت ہوگی۔ حکومت اس میں جب ہی کامیاب ہو سکتی ہے۔ جب کہ مقامی آبادی بھی ساتھ دے اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ہم کو نصاب میں بھی تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔ جس سے بچہ اقتصادی لحاظ سے اچھا شہری بن سکے۔ والدین کو بھی اس بات کا پورا یقین ہو جائے کہ تعلیم سے فراغت کے بعد ان کا بچہ کوئی مناسب پیشہ اختیار کر سکتا ہے۔ اشتراکی ممالک میں یہ نظریات کافی مقبول ہیں۔

پاکستان میں ابھی تک کوئی ایسا تجربہ نہیں کیا گیا۔ جس میں نصاب کو کسی پیشے کے ساتھ مربوط کیا جا سکتا۔ ایسے حالات میں جبکہ ہمارا ملک بتدریج صنعتی ترقی کر رہا ہے۔ ہم کو یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ زراعت کا پیشہ بھی صنعتی اور میکانکی اصولوں پر استوار ہو سکے۔ تاکہ ہم اپنے بچوں کو زیادہ سے زیادہ زندگی کے مسائل سے واقف کرا کر ان کو بہترین شہری بنا سکیں۔ جس کے لئے بنیادی چیز اقتصادی مسائل کا حل ہے۔

اساتذہ کا مسئلہ TEACHER's PROBLEM

پرائمری تعلیم کی کامیابی کے لئے ایسے اساتذہ کی ضرورت ہے جو کہ تربیت یافتہ ہوں۔ چنانچہ اساتذہ کی تربیت کے لئے مناسب انتظام ہونا چاہیئے۔ جہاں وہ درس و تدریس کے جدید طریقوں کو سیکھ سکیں۔ میٹرک کی تعلیم کے بعد انھیں دو سالہ تربیتی کورس کرنا ہوگا۔ اس طرح سے حکومت کو تربیت یافتہ افراد کے لئے بھی روپیہ خرچ کرنا ہوگا۔

نظام کی تنظیم نو
RECONSTRUCTION OF ADMINISTRATION

حکومت نے ابتدائی تعلیم کی ذمہ داری کو قبول کر لیا ہے۔ جس سے لوکل باڈیز کے تحت تمام نقائص دور ہو جائیں گے۔ حکومت کی یہ بھی کوشش ہے کہ قوم بھی اس سلسلہ میں اس کی خاطر خواہ مدد کرے اور تعلیمی کمیشن کی سفارشات کے مطابق ممبران بنیادی جمہوریت کا فرض ہے کہ وہ مدرسے کی عمارت فرنیچر۔ تدریسی اشیاء وغیرہ کا انتظام کریں، ہر پرائمری اسکول کی ایک مشاورتی کمیٹی ہو جس میں والدین کو بھی شریک کیا جائے تاکہ ان کا اشتراک و تعاون حاصل ہو۔ صوبہ کا حاکم تعلیم ہر قسم کے تعلیمی امور مثلاً نصاب۔ درسی کتاب اور اساتذہ کی تربیت وغیرہ کا بندوبست کرے گا۔

انسپکٹران کو خاص طور پر ہدایات دی جائیں گی کہ وہ افسر شاہی کی بجائے ایک راہ نما کی حیثیت سے تعلیم کی بہتری کی کوشش کریں۔



ثانوی و اعلیٰ ثانوی تعلیم

SECONDARY & HIGHER SECONDARY EDUCATION

تجربہ شاہد ہے کہ پاکستان میں موجودہ ثانوی نظام تعلیم بالکل ناکام ہو چکا ہے جس کی اہم وجہ یہ ہے کہ آج تک یہ اسی ڈگر پر چل رہا ہے جس کی داغ بیل انگریزوں نے ڈالی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ یہ تعلیم ہمارے نونہالان چمن کی فنی، صنعتی اور قومی ضروریات کی تکمیل کرنے سے بھی قاصر ہے۔ اس تعلیم کی اصلاح کے لئے لاتعداد منصوبے تشکیل کئے گئے۔ لیکن ان پر صدق دل سے عمل نہیں کیا گیا۔ ہم کو تاریخ کا یہ سبق یاد رکھنا چاہیئے کہ علم بغیر عمل اور عمل بغیر علم بے کار ہے کیونکہ عمل ہی ایک ایسا نسخہ کیمیا ہے جو قوموں کو ترقی و خوشحالی کی راہ دکھاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ آپ نے ہمیشہ عمل کو ہی اولیت بخشی اور یہی وہ جذبہ تھا جس نے عرب جیسی جاہل قوم کو متمدن بنا دیا۔ افسوس کا مقام ہے کہ ہماری ثانوی تعلیم ابھی تک ذہنی اور ادبی ہی ہے۔ جس میں وقت کے تقاضوں کو بالکل فراموش کر دیا گیا ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو فنی اور زرعی تعلیم دے کر قومی ترقی کے لئے تیار کریں۔ موجودہ زمانہ گذشتہ زمانے سے بالکل مختلف ہے۔ اس لئے ہم کو جدید تقاضوں کو مدنظر رکھ کر ثانوی تعلیم کے فرسودہ نظام کو بدل کر اس کو اس قابل بنانا ہے کہ ہم بچے کے کردار کی تشکیل پختگی کار کی مہارت اور لیڈرشپ کے اوصاف پیدا کریں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ہمیں آئندہ زندگی کا لائحہ عمل تیار کرنا ہے اگر ہم کو اپنی اور اپنی قوم کی بقا منظور ہے

توہم کو میکالے اور اس کے پرستاروں کے نظام تعلیم کو خدا حافظ کہنا ہی ہوگا کیونکہ آج ہم آزاد ہیں۔

ایسے ممالک جو تعمیری لحاظ سے انقلابی دور سے گزر رہے ہوں ان کے لئے ثانوی تعلیم کی بہت اہمیت وافادیت ہوتی ہے یونی ورسٹی کی تعلیم تعمیری انقلاب کے لئے لیڈر اور قائدین پیدا کرتی ہے۔ جبکہ ابتدائی تعلیم کا تعلق نئی نسل کے اس طبقے سے ہوتا ہے جن کی عمر اتنی کم ہوتی ہے کہ وہ تعمیری انقلاب میں مدد کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ لیکن ثانوی تعلیم اس انقلاب کے لئے ایسے افراد مہیا کرسکتی ہے جو اس کے ڈھانچے کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا کام دے سکتے ہوں اور جن کی امداد کے بغیر کوئی تعمیری منصوبہ یا پروگرام کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ہم کو ثانوی تعلیم پر سب سے زیادہ توجہ دینی چاہیئے۔ کیونکہ یہ تعلیم ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کی درمیانی کڑی ہے۔ پانچ سال کی ابتدائی تعلیم کے بعد تین سال تک مڈل اور اس کے بعد دو سال ہائی اسکول کی تعلیم ہے۔

تعلیم	مدت	عمر
ابتدائی	۵ سال	۵ سال + تا ۱۰ + سال
مڈل	۳ سال	۱۰+سال +تا ۱۳ + سال
ثانوی	۲ سال	۱۳ + سال تا ۱۵ + سال

ثانوی تعلیم کے مقاصد
AIMS OF SECONDARY EDUCATION

ثانوی تعلیم قوم کی افرادی قوت کو مختلف فنون کی عملی تربیت دینے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ یونی ورسٹی کے لئے خام مال مہیا کرنا بھی اسی کا فرض ہے کردار کی تعمیر اور قیادت کی صلاحیتوں کی نشوونما کا یہ اہم دور ہے بچے کی زندگی کا یہ وہ دور ہے جب اس کو ذہنی، جسمانی اور اخلاقی طور سے معاشرہ اور ملک کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ آئندہ ترقی و تنزلی کا دارومدار اسی تعلیم پر منحصر ہوتا ہے۔ ثانوی تعلیم

کے تمام مقاصد کا احاطہ کرنا دشوار اور مشکل ہے۔ پھر بھی خاص خاص مقاصد درج ذیل ہیں:

۱۔ تعلیم کو بچے کی ضروریات اور دلچسپیوں سے مربوط کرنا۔
۲۔ بچے میں تجسس کا مادہ اور آزادانہ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں پیدا کرنا
۳۔ تدریسی مشاغل کی اس طرح تنظیم کرنا کہ بچے میں قیادت کی صلاحیتیں اُجاگر ہو سکیں۔
۴۔ بچوں میں جمالیاتی ذوق اور ثقافتی قدروں کی تعریف و توصیف کرنے کا جذبہ پیدا کرنا۔
۵۔ جسمانی تربیت۔ ورزش اور کھیلوں کے ذریعہ بچے میں عملی کام کا شوق پیدا کرنا۔
۶۔ بچوں میں محنت۔ نظم و ضبط اور دیانت داری کے اوصاف حمیدہ پیدا کرنا۔
۷۔ ذمہ داری کا احساس۔ معاشرتی کاموں میں حصہ لینے کا جذبہ اور خدمت خلق کے لئے تیار کرنا۔
۸۔ تعلیم کو عملی زندگی اور ماحول سے ہم آہنگ کرنا۔
۹۔ دستی۔ فنی اور ٹیکنیکل کاموں کی عظمت کا احساس پیدا کرنا۔
۱۰۔ بچوں کی مناسب پیشوں اور ان سے متعلقہ نصاب کی طرف رہنمائی کرنا۔
۱۱۔ ایسی تعلیم دینا جس کی بنیادیں قومی ثقافت اور اسلامی اقدار پر مبنی ہوں۔
۱۲۔ ملک اور قوم کی عظمت۔ اس کی تاریخ اور امنگوں سے واقف کرانا، اور ملک و ملت کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا۔
۱۳۔ عالمگیر برادری۔ انسانی بھائی چارہ اور بین الاقوامی مفاہمت کے جذبات بیدار کرنا۔

وغیرہ وغیرہ

ثانوی تعلیم کے نقائص

ثانوی تعلیم میں ویسے تو لاتعداد نقائص ہیں لیکن ہم ان میں سے چند پر اختصار سے روشنی ڈال رہے ہیں۔

۱۔ نصاب

ثانوی تعلیم کا نصاب بہت ہی ناقص ہے۔ اس میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ زیادہ تر ادبی ہے۔ ایک متوازن نظام تعلیم میں ثانوی منزل کا مقصد طالب علم کے لئے ایسا نصاب مقرر کرنا ہے جو اس کو معاشرے میں مناسب مقام دلا سکے۔ لیکن ہمارے نصاب میں ایسے مضامین کی کثرت ہے جن کا زندگی سے کوئی تعلق نہیں نصاب میں پاکستان کی ضروریات کا خیال نہیں رکھا گیا ہے اور علم کو عمل سے محروم کر دیا گیا ہے۔ جس سے طلبہ میں وہ اوصاف پیدا نہیں ہوتے جن کا معاشرے کو ضرورت ہے۔ زیادہ توجہ کتابی علم پر دی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے بچہ کی عملی قوت اور استعداد بے کار ہو جاتی ہے ذہنی اور نفسیاتی پہلوؤں پر بھی توجہ نہیں دی جاتی۔

منزل کا تعین نہیں

ثانوی تعلیم کو ہمیشہ سے یونی ورسٹی میں داخلہ کی ایک سیڑھی سمجھا گیا ہے۔ جس کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ہمارے یہاں میٹرک کے امتحان کو مدتوں سے انٹرنس کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا تھا جس سے ظاہر ہے کہ طلبہ بجز یونی ورسٹی میں داخلہ کے اور کسی چیز کے لئے تیار نہیں کئے جاتے تھے۔ انگریزی حکومت نے اس طرف کبھی توجہ نہیں دی۔ کیونکہ ان کو ایسے افراد کی ضرورت تھی جو ان کے حامی ہوں اس لئے ایسے نصاب کو تشکیل دیا گیا جو محض کتابی ہوتا تھا اور جس کا بنیادی

مقصد کلرک تیار کرنا تھا۔ مقام افسوس ہے کہ آج بھی ثانوی تعلیم کی منزل وہی ہے جب کہ پاکستان کو وجود میں آئے ہوئے تقریباً اٹھائیس سال کا عرصہ گذر چکا ہے ثانوی تعلیم کا مقصد یونی ورسٹی کے لئے خام مال کی تیاری تھا۔ اس لئے عرصہ تک اس کا انتظام و انصرام بھی یونی ورسٹیوں کے ہاتھ میں رہا۔ امتحانات۔ نصاب بندی۔ داخلہ کے قواعد و ضوابط وغیرہ تمام کام یونی ورسٹی کے ارباب واقتدار ہی انجام دیتے تھے۔ چنانچہ اب اس کی منزل کو مقرر کرنے کی کوشش کی جارہی ہیں۔ دیکھئے انجام کیا ہوتا ہے۔

خارجی امتحانات EXTERNAL EXAMINATIONS

ثانوی تعلیم پر خارجی امتحانات نے بھی بہت ہی خراب اثرات ڈالے ہیں ایک متوازن نظام تعلیم میں خارجی امتحانات کو تعلیمی نصاب اور اسکولوں کے طریقہ کار کا آئینہ دار ہونا چاہیئے۔ جبکہ ہماری ثانوی تعلیم پر خارجی امتحانات کے اثرات کی وجہ سے لاتعداد برائیاں مثلاً اسکولوں میں لاپروائی۔ ناقص تدریسی طریقے نصاب کے بعض حصوں کی رٹائی۔ اور سب سے بری بات یہ ہے کہ امتحان میں کامیابی ہی حصول مقصد قرار دی جاتی ہے۔

ہماری ثانوی تعلیم نتائج کی خرابی کی وجہ سے بہت بدنام ہے۔ ہمارے ناکام طلبہ کی تعداد دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے۔ اور ابھی تک ہم ان برائیوں کو دور کرنے سے قاصر ہیں۔ بلکہ کہنا یوں پڑتا ہے کہ دن بدن طریقہ امتحان بد سے بدتر ہوتا جارہا ہے اتنا ہی نہیں بلکہ طلبہ کی کاپیاں جانچنے کا جو ناقص طریقہ ہے وہ بھی اصلاح طلب ہے۔ یہی وہ وجوہات ہیں جن سے طلبہ میں بے چینی بڑھ رہی ہے لیکن افسوس ہے کوئی بھی اس طرف توجہ نہیں دیتا۔

طریقہ ہائے تدریس METHODS OF TEACHING

نظام تعلیم کی کامیابی کا دارومدار طریقہ تدریس پر ہوتا ہے۔ ہماری

STAGES & PERIODS OF SECONDARY EDUCATION

ثانوی تعلیم کی مدت اور ادوار

درجہ	مدت	عمر	جماعتیں
پرائمری	۵ سال	۵ تا ۱۰ سال	پہلی سے پانچویں جماعت
مڈل	۳ سال	۱۰ تا ۱۳ سال	چھٹی سے آٹھویں جماعت
ثانوی	۲ سال	۱۳ تا ۱۵ سال	نویں دسویں
اعلیٰ ثانوی	۲ سال	۱۵ تا ۱۷ سال	گیارھویں بارھویں

ثانوی جماعتوں کا نصاب

CURRICULUM FOR SECONDARY EDUCATION

لازمی مضامین COMPULSORY SUBJECTS

۱۔ بنگالی یا اردو
۲۔ انگریزی
۳۔ روزمرہ حساب
۴۔ معاشرتی علوم
۵۔ جنرل سائنس
۶۔ اسلامیات

اختیاری مضامین OPTIONAL SUBJECTS

ان لازمی مضامین کے علاوہ طلبہ Humanities Group گروپ میں سے ریاضی یا امور خانہ داری (لڑکیوں کے لئے) تاریخ جغرافیہ

سائنس گروپ Science Group

ریاضی۔ فزکس۔ کیمسٹری (لازمی) فزیالوجی۔ ہائی جین جغرافیہ میں سے کوئی ایک۔

ثانوی تعلیم میں طریقہ تدریس فرسودہ ہے۔ بچے کے رجحان طبع۔ استعداد اور ذہانت پر مطلق توجہ نہیں دی جاتی۔ بلکہ رٹائی پر کافی توجہ دی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے میں اختراع۔ ذاتی قابلیت اور قوت فکر ختم ہو جاتی ہے۔

تربیت یافتہ اساتذہ کا فقدان
LACK OF TRAINED TEACHERS

ثانوی تعلیم میں تربیت یافتہ اساتذہ کا فقدان ہے۔ ہمارے یہاں ذہین اور تعلیم یافتہ طبقہ اس میں آنا پسند نہیں کرتا۔ جس کی لاتعداد وجوہات ہیں چونکہ اساتذہ غیر تربیت یافتہ ہیں۔ اس لئے دوران تدریس جدید طریقوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ پھر اشیاء امدادی اور دیگر سہولتوں کی بھی کمی ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسکول کم ہیں جس کی وجہ سے طلبہ کی تعداد جماعتوں میں کافی ہوتی ہے۔ اس لئے اساتذہ ان پر توجہ دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ پاکستان میں جو فرد ہر جگہ سے ناکام ہو جاتا ہے وہ معلم بن جاتا ہے۔ اس کو نہ تو پیشہ سے دلچسپی ہوتی ہے۔ اور نہ اس کی عزت و عظمت کا خیال رہتا ہے وہ طلبہ سے ذاتی کام لیتا ہے اور پھر امتحان میں اس کو نوازتا ہے جس سے دیگر طلبہ میں بددلی پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معیار تعلیم دن بدن گرتا جا رہا ہے۔ معاشرے میں بھی معلم کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔

ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ تعلیم کا فقدان
TECHNICAL & PROFESSIONAL SIDES NEGLECTED

جیسا کہ پیشتر تحریر کیا جا چکا ہے کہ ثانوی تعلیم درمیانی کڑی ہے۔ فرد کو جیسا بنانا ہے اس کی بنیاد اسی منزل پر پختہ کی جاتی ہے۔ چنانچہ ہمارے ملک میں ثانوی تعلیم میں ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ مضامین پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی جاتی۔ اوّل تو ان مضامین کی تدریس کے لئے انتظام ہی نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو وہ نہ ہونے

کے برابر ہے اتنا ہی نہیں بلکہ نصاب میں بھی "تنوع" کے اصول کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم معاشرے کی ضروریات اور اس کے تقاضوں کی تکمیل میں بری طرح سے ناکام ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے اور فرد میں دن بدن خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی ہے۔

EXPERTS NEGLECTED ماہرین تعلیم سے لاپروائی

ہماری بدقسمتی ہے کہ اول تو ہمارے ملک میں ماہرین تعلیم کا فقدان ہے اور جو تھوڑے سے بہت ہیں بھی تو ان کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے چنانچہ جب بھی مشاورت کا موقع آتا ہے۔ تو ایسے لوگوں کو شامل کیا جاتا ہے۔ جن کا تعلیم سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ اساتذہ کو خاص طور سے شریک نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ دوران تدریس سب سے زیادہ وہی ان مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ جب بھی نظام تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت ہو تو ماہرینِ تعلیم، اساتذہ اور مقامی لوگوں سے مشاورت حاصل کی جائے تاکہ ٹھوس بنیادوں پر تبدیلیاں کی جا سکیں۔ جس سے ملک و قوم کو خاطر خواہ فائدے پہنچیں۔

خامیوں کو دور کرنے کے لئے تجاویز:-

SUGGESTIONS FOR IMPROVEMENT

میٹرک کا امتحان ۱۸۵۸ء میں شروع ہوا۔ کیونکہ حکومت برطانیہ نے اسی دور میں کلکتہ۔ بمبئی اور مدراس میں یونی ورسٹیاں قائم کی تھیں۔ سب سے پہلے ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن نے اس بات کی کوشش کی کہ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیم پر سرکاری کنٹرول ہو۔ چنانچہ اس نے ایک کمیشن مقرر کیا۔ لارڈ کرزن کے مقاصد سیاسی تھے۔ اس لئے اس کو ان میں کامیابی ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۱۷ء میں

کلکتہ کمیشن مقرر کیا گیا جس نے یونی ورسٹی کی تعلیم کا جائزہ لیا۔ اور بہت اہم سفارشات پیش کیں۔

اس کمیشن نے انٹرمیڈیٹ کو یونی ورسٹی سے الگ کرنے کی پرزور سفارش کی۔ ساتھ ہی ساتھ انٹرمیڈیٹ کالج قائم کرنے پر بھی زور دیا۔ جن میں نہم سے لیکر دوازدہم تک کی جماعتیں رکھی جائیں۔ اس کمیشن نے یہ بھی سفارش کی کہ انٹرمیڈیٹ بورڈ قائم کئے جائیں۔ تاکہ یونی ورسٹی سے اس تعلیم کو الگ کر دیا جائے۔ ۱۹۴۴ء میں سارجنٹ اسکیم پیش کی گئی جس نے انٹرمیڈیٹ کالجوں کی ناکامی پر روشنی ڈالی اور ان کی بجائے ہائیر سیکنڈری اسکول کھولنے کی سفارش کی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان اداروں میں تین سالہ ڈگری کورس نافذ کرنے کی بھی سفارش کی۔

پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد سے ہی تعلیم کی ترقی و توسیع کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ چنانچہ قائد اعظم نے خود ایک کانفرنس طلب کی جس کا مقصد حالات کے مطابق تعلیم میں ردوبدل کرنا تھا۔ ان کی وفات کے بعد بھی مختلف کمیٹیاں وقتاً فوقتاً مقرر ہوتی رہیں۔ لیکن ۱۹۵۸ء میں جب ایوب خاں مرحوم برسر اقتدار آئے تو انھوں نے تعلیم کی طرف خاص توجہ دی۔ چنانچہ اپنے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مرحوم نے ۳۰ دسمبر ۱۹۵۸ء کو شریف صاحب کی سرکردگی میں ایک کمیشن مقرر کیا۔ جو ملک اور بیرون ملک کے ماہرین تعلیم پر مشتمل تھا۔ اس کمیشن کو تین ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔

National Commission on Education.

Sharif Commission.

Education Commission.

کمیشن نے عوام سے اپیل کی کہ وہ تعلیمی پالیسی کو کامیاب بنانے میں حکومت سے تعاون کریں۔ چنانچہ کمیشن نے تعلیم کے ہر پہلو پر غور و خوض کر کے ۳۵۸ صفحات پر مشتمل ایک جامع رپورٹ پیش کی۔ اس نے ثانوی تعلیم کے اغراض و مقاصد

پر بھی سیر حاصل بحث کی ساتھ ہی ساتھ ثانوی تعلیم کی اصلاح کے لئے بھی تجاویز پیش کیں۔ جن میں سے خاص خاص یہ ہیں۔

۱۔ ہم کو سب سے پہلے ثانوی تعلیم کے مقاصد کی اصلاح کرنی چاہیئے کیونکہ آج تک وہی مقاصد ہیں جن کو انگریزوں نے مقرر کیا تھا۔ انگریزوں کے مقرر کردہ مقاصد کے مضر اثرات اب تک ہماری تعلیم کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔

۲۔ معاشرہ دن بدن تیزی سے بدل رہا ہے۔ ثانوی تعلیم کو اس تبدیلی کا ساتھ دینا چاہیئے۔ اس لئے معاشرہ اور تعلیم میں مطابقت ضروری ہے

۳۔ ثانوی تعلیم ایک مکمل منزل ہونی چاہیئے۔ اس منزل کو محض تعلیمی لحاظ سے نہیں بلکہ انتظام کے لحاظ سے بھی الگ ہونا چاہیئے۔

۴۔ ثانوی تعلیم طلبہ کی دلچسپیوں۔ رجحانات اور استعداد کے مطابق ہونی چاہیئے۔ ان کو کسی فن یا پیشے کی تربیت دینا چاہیئے۔ تاکہ وہ زندگی اچھی طرح بسر کر سکیں۔

۵۔ نصاب تعلیم ایسا ہونا چاہیئے۔ جو طلبہ کو ان کے تعلیمی سلسلے کے مکمل ہونے کا احساس دلائے۔

۶۔ طریقہ ہائے تدریس میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے۔

۷۔ طلبہ میں قومی جذبے کی تربیت پر خاص زور دیا جانا چاہیئے۔

۸۔ بچوں میں بین الاقوامی جذبہ۔ عالمگیر برادری۔ اور بھائی چارہ کا احساس پیدا کیا جائے۔

۹۔ بچوں کو جسمانی تعلیم دے کر صحت مند بنایا جائے۔

۱۰۔ بچوں میں تعاون۔ خدمت اور محنت کی عظمت کا احساس پیدا کیا جائے

۱۱۔ بچوں میں سماجی ذمہ داری کا احساس بیدار کیا جائے۔

۱۲۔ امتحانات کے خراب نتائج سے تعلیم کو آزاد کیا جائے۔

۱۳۔ ہر تعلیمی ادارے میں طلبہ کی رہنمائی کے لئے رہنمائی اور مشاورت کے ادارے قائم کئے جائیں۔

۱۴۔ اساتذہ کا معیار زندگی بلند کیا جائے ان کی تربیت کا بندوبست کیا جائے۔

۱۵۔ معاشرے اور مدرسے کے درمیان مستحکم اور خوشگوار تعلقات قائم کئے جائیں۔

۱۶۔ بچے کو اس کی صلاحیت، استعداد اور دلچسپی کے لحاظ سے کسی نہ کسی پیشے یا فن کی تربیت دی جائے۔

جامع مدارس اور کثیر المقاصد مدارس

COMREHENSIVE & MULTIPURPOSE SCHOOLS

تعلیمی کمیشن نے سفارش کی ہے کہ ہائی اسکولوں کو واحد المقصد اسکولوں کی بجائے کثیر المقاصد اسکولوں میں تبدیل کر دیا جائے، اور نصاب کے اختیاری مضامین کو کئی گروپوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ مثلاً آرٹ گروپ سائنس گروپ زراعت گروپ۔ کامرس گروپ وغیرہ۔ لڑکیوں کے واسطے امور خانہ داری سے متعلق مضامین کا گروپ۔ کثیر المقاصد اسکولوں میں سب گروپوں یا کچھ گروپوں کی پڑھائی کا انتظام کیا جائے اور طلبہ کو آزادی ہو کہ وہ جس گروپ کو چاہیں منتخب کریں پاکستان میں پائیلٹ اسکول قائم کئے جائیں۔ چنانچہ صوبے کے مختلف حصوں میں چند اسکولوں کو اس مقصد کے لئے چنا گیا ہے۔ ان مدارس میں ٹیکنیکل زراعت اور دوسرے مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ عملی کام کے لئے ورک شاپ اور ساز و سامان مہیا کیا جا رہا ہے۔ ان مدارس میں درس و تدریس کرنے والے اساتذہ کو خصوصی تربیت دی جا رہی ہے۔ صنعتی پیشہ ورانہ تعلیم کے لئے علیحدہ علیحدہ ڈائریکٹریٹ قائم کئے گئے ہیں۔

کمیشن نے تعلیمی انتظام کے لئے چند نئے بورڈ قائم کرنے کی تجویز پیش

کی ہے۔ ان کی ذمہ داریاں درج ذیل ہیں :

۱۔ ثانوی تعلیم کا کنٹرول اور ترقی
۲۔ نصاب سازی
۳۔ تعلیمی پالیسی کا تعین
۴۔ اخبارات کا انتظام
۵۔ ثانوی تعلیم کے اداروں کی منظوری اور الحاق

کمیشن نے موجودہ نصاب کے بارے میں مندرجہ ذیل خیالات ظاہر کئے ہیں :

۱۔ نصاب کتابی اور نظری ہے۔ جو فرد اور معاشرے کی ضروریات پوری کرنے سے قاصر ہے۔
۲۔ امتحانات کے نظام نے تعلیم پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔
۳۔ مضامین کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ ان کی گروہ بندی بھی نہیں کی گئی ہے۔

اس ضمن میں مندرجہ ذیل تجاویز پیش کی گئی ہیں۔

۱۔ ہر بچے کو ثانوی اسکول کی تعلیم مکمل کرنے پر کم از کم دس یا بارہ مضامین کی معلومات ہونی چاہئیں۔
۲۔ مضامین کو آپس میں مربوط کر کے زندگی کے مسائل سے ہم آہنگ کیا جائے۔ معاشرتی علوم میں تاریخ جغرافیہ اور شہریت کو شامل کر دیا جائے
۳۔ نصاب ایسا ہو کہ پرانی قدروں سے واقف کرائے اور نئی قدروں کی طرف رہنمائی کرے۔

کامرس گروپ Commerce Group
اصول تجارت ۔ تجارتی جغرافیہ ۔ حساب ۔ بک کیپنگ اور ٹائپ رائٹنگ ۔
انڈسٹریل گروپ Industrial Group
حساب ۔ فزکس ۔ کیمسٹری ۔ دھات کا کام ۔ لکڑی کا کام ۔ برتن بنانا
چمڑے کا کام ۔ خیاطی
گھریلو سائنس یا زراعت گروپ Home Economic Group
بیالوجی ۔ فزکس ۔ کیمسٹری ۔ ارضی سائنس ۔ نباتات کا علم علم حیوانات
ماہی گیری ۔ باغبانی وغیرہ ۔

رہنمائی اور مشاورت COUNSELLING & GUIDANCE

چونکہ ہر طالب علم کی ذہنی و جسمانی ۔ صلاحیت اور استعداد دوسرے سے مختلف ہوتی ہے ۔ اگر ایک مضمون تمام طلبہ کو ایک ہی معیار کے مطابق پڑھایا جائے ۔ تو نتائج خطرناک ہو سکتے ہیں ۔ اس لئے ضروری ہے کہ طلبہ کو مناسب موقعوں پر مشورہ اور رہنمائی حاصل ہو جس کا نتیجہ یہ ہوگا ۔ کہ وہ مضامین کے انتخاب میں سوجھ بوجھ سے کام لیں گے ۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ وہ یہ مضامین کا انتخاب کر لیتے ہیں ۔ جن سے اُن کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور اس طرح ان کی خداداد صلاحتیں ضائع ہو جاتی ہیں ۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کند ذہن اور ناقابل طلبہ اپنے اثر و رسوخ سے بہتر مواقع حاصل کر لیتے ہیں ۔ اس سائنسی اور مشینی دور میں فنی اور سائنسی میدان میں خصوصی مہارت درکار ہے ۔ انجنیرنگ ۔ میڈیکل اور ٹیکنیکل پیشے اختیار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ طلبہ ابتدائی جماعتوں سے ہی ان مضامین سے واقفیت رکھتے ہوں اس لئے ان کے ذہنی رجحان، دلچسپی اور صلاحیتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے ۔
تعلیم مکمل کرنے کے بعد ملازمتوں کی تلاش میں افراد مارے مارے پھرتے

ہیں۔ ان کے لئے ملازمتوں کی فراہمی اور پیشوں کی رہنمائی کے لئے تعلیمی اداروں میں انتظام کرنا ضروری ہے اس مقصد کے لئے ماہر نفسیات تربیت یافتہ۔ ہمدرد اور قابل اساتذہ کا تقرر ہونا چاہیئے۔

مشاورت اور رہنمائی کی ضرورت چار موقعوں پر پیش آتی ہے۔

۱۔ مڈل پاس کرنے کے بعد جب طلبہ دستکاریاں سیکھنے کے لئے پیشہ ورانہ اسکولوں میں داخلہ لیتے ہیں۔

۲۔ میٹرک کرنے کے بعد جب طلبہ کالج میں داخلہ لیتے ہیں۔ میڈیکل انجینئرنگ یا کامرس کے مضامین لیتے ہیں یا پولی ٹیکنیک مدارس میں داخلہ لیتے ہیں۔

۳۔ جامع اور کثیر المقاصد اسکولوں میں مضامین کی کثرت کی وجہ سے طلبہ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہوتے ہیں کہ ان کو کون کون سے مضامین لینے چاہئیں۔

۴۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد جب کچھ طلبہ میڈیکل اور انجینئرنگ میں داخلے لیتے ہیں۔ یا اعلیٰ تعلیم کے لئے یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہیں تمام تعلیمی اداروں میں تعلیمی رہنمائی کے لئے اصولِ نفسیات پر مبنی پروگرام مرتب ہونے چاہئیں۔

یہ پروگرام پہلی جماعت سے اعلیٰ تعلیم تک جاری رہنا چاہئیے۔ اس میں طلبہ کے انتخاب اور گروہ بندی، ان کی تعلیمی ترقی، معاشرتی مطابقت، صلاحیت، تعلیمی استعداد کا جائزہ لینے کے لئے ذہانت اور خصوصی استعداد کے آزمائشی پرچے تیار ہونے چاہئیں۔ کمیشن نے سفارش کی ہے کہ ہر اسکول، کالج اور یونیورسٹی صنعتی اور پیشہ ورانہ اسکولوں میں رہنمائی و مشاورت کے ماہروں کا تقرر ہونا چاہیئے۔ رہنمائی اور مشاورت کے لئے موزوں آزمائشیں مرتب کی جائیں۔ مغربی ممالک میں ایسے کام ہو رہے ہیں۔ اگر تعلیم سے فائدہ حاصل کرنا ہے تو اس طرف خاص توجہ دینی ہوگی۔

ثانوی و اعلیٰ ثانوی تعلیمی بورڈ کراچی

BOARD OF INTERMEDIATE & SECONDARY EDUCATION KARACHI

قومی تعلیمی کمیشن ۱۹۵۹ء نے اپنی رپورٹ میں یہ سفارش کی کہ ثانوی تعلیم اعلیٰ تعلیم سے علیحدہ ایک مکمل منزل ہونی چاہیئے۔ اس مقصد کے تحت یازدہم اور دوازدہم جماعتیں جو انٹرمیڈیٹ کے نام سے یونی ورسٹی کے دائرہ اختیار میں تھیں۔ ثانوی تعلیم کی منزل میں شامل کردی گئیں۔ اس لئے حکومت مغربی پاکستان نے ۸ رجنوری ۱۹۶۲ء کو ایک آرڈیننس جاری کیا۔ جس کے تحت مغربی پاکستان کے موجودہ ثانوی تعلیمی بورڈوں کو انٹرمیڈیٹ اور ثانوی تعلیمی بورڈوں کی حیثیت عطا کی گئی۔ کمیشن نے ان کی تعداد میں اضافہ کی بھی سفارش کی ہے۔ تاکہ ثانوی تعلیم کا معیار بھی بلند ہوسکے۔ اس وقت مغربی پاکستان میں مندرجہ ذیل بورڈ ہیں:-

۱۔ انٹرمیڈیٹ اور ثانوی تعلیمی بورڈ، لاہور
۲۔ انٹرمیڈیٹ اور ثانوی تعلیمی بورڈ، کراچی
۳۔ انٹرمیڈیٹ اور ثانوی تعلیمی بورڈ، حیدرآباد
۴۔ انٹرمیڈیٹ اور ثانوی تعلیمی بورڈ، پشاور
۵۔ انٹرمیڈیٹ اور ثانوی تعلیمی بورڈ، ملتان
۶۔ انٹرمیڈیٹ اور ثانوی تعلیمی بورڈ، سرگودھا
۷۔ انٹرمیڈیٹ اور ثانوی تعلیمی بورڈ، کوئٹہ

مندرجہ بالا بورڈوں کی تشکیل آرڈیننس کے تحت عمل میں آئی اور کم و بیش یکساں ہے ان کے وظائف، دائرہ کار اور اختیارات بھی اسی آرڈیننس کے تحت متعین کئے گئے ہیں۔

فنی اور

پیشہ ورانہ تعلیم

PROFESSIONAL & TECHNICAL EDUCATION

دورِ جدید سائنس کا زمانہ ہے۔ اس دور میں وہی ملک و قوم ترقی کر سکتی ہے جو اپنی پیشہ ورانہ تعلیم کی طرف خاطر خواہ توجہ دیتی ہے۔ اس تعلیم سے ہم ایک طرف تو افراد کو بے روزگاری کی مصیبت سے نجات دلاتے ہیں تو دوسری طرف وہی لوگ قوم و ملت کے تعمیری کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اسلامی معاشرے میں پیشہ ورانہ تعلیم کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ حضور مقبول ؐ نے پیشہ تجارت کو ہی اپنایا تھا اور یہی وجہ ہے کہ آپ نے کسی نہ کسی پیشے کو اپنانے کی بار بار تلقین کی ہے۔ کہا جاتا ہے، کہ فیروز شاہ تغلق نے اپنے عہد میں غلاموں کی تعلیم و تربیت کے لئے صنعتی ادارے قائم کئے تھے۔ عہدِ مغلیہ میں بھی اس قسم کا سلسلہ جاری و ساری رہا لیکن انگریزی حکومت نے ہند و پاک کی صنعتی تعلیم کو نیست و نابود کر دیا۔ لیکن اب ہم آزاد ہیں۔ چنانچہ ہماری بقاء کا دار و مدار پیشہ ورانہ تعلیم پر ہی ہے یہی وجہ ہے کہ ہم اپنی روایات کو از سرِ نو قائم کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ لیکن ابھی تک ہم کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ جس کی اہم وجہ ہمارے اقتصادی مسائل ہیں۔ کیونکہ پاکستان اقتصادی لحاظ سے ابھی اتنا مستحکم نہیں ہے کہ وہ صنعتی اور پیشہ ورانہ تعلیم پر زرِ کثیر صرف کر سکے۔ بہر حال مالی وسائل کے مطابق اس طرف توجہ دی جا رہی ہے۔

آج پاکستان میں صنعتی اور پیشہ ورانہ درج ذیل شعبے ہیں :

۱۔ زرعی تعلیم Agricultural Education
۲۔ انجنیئرنگ کی تعلیم Engineering Education
۳۔ قانون کی تعلیم Legal Education
۴۔ کامرس کی تعلیم Commercial Education
۵۔ طبی تعلیم Medical Education
۶۔ اساتذہ کی تعلیم Teacher Education

زرعی تعلیم AGRICULTURAL EDUCATION

پاکستان زرعی ملک ہے۔ جس کی بیشتر آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے اور اس کا پیشہ زراعت ہے دنیا کے ترقی یافتہ ممالک نے مشینوں اور دیگر سائنسی طریقوں سے زراعت کی پیداوار میں بہت اضافہ کرلیا ہے۔ لیکن ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے کاشتکار آج بھی وہی پرانے اور فرسودہ کاشت کے طریقوں کو اپنائے ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کی ضرورت پوری کرنے کے لئے کافی اناج پیدا نہیں ہوتا اور ہر سال دوسرے ممالک سے غلہ درآمد کرنا پڑتا ہے! اس طرح بہت سا زرمبادلہ ضائع ہوجاتا ہے۔ ہمیں زراعتی تعلیم کے ماہرین کی بہت ضرورت ہے۔ جو ہمارے ملک کے کاشتکاروں کو مفید مشورے دے سکیں۔ تاکہ ملک کی غذائی قلت دور ہوسکے۔ زرعی زمین کی عمر کے مطابق پانی کی سپلائی وکنٹرول سیم وتھور زمین کی حفاظت، اور ضائع شدہ زمینوں کی آبادکاری کے سلسلے میں ماہرین اپنی تحقیق اور تجربات سے کاشتکاروں کو بہتر پیداوار کے طریقوں سے روشناس کرسکتے ہیں۔ زرعی تعلیم کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ مدارس میں اس کو لازمی قرار دیا جائے۔ یونی ورسٹی کی تعلیم میں اس سے بڑی مدد مل سکتی ہے ثانوی مدارس میں اساتذہ اور شعبہ تحقیق کے واسطے ہمیں زراعت کے ماہرین کی ضرورت

ہے۔ ہمارے زراعتی کالج سے فارغ التحصیل طلبہ کو زراعت کے جدید طریقوں اور جدید زرعی مشینوں کے استعمال سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے۔ ان کو پاکستان میں پیدا ہونے والی فصلوں کو ترقی دینا ہوگی۔ اور نئی فصلوں کی کاشت کے تجربے بھی کرنا ہوں گے۔ کسان اور مویشی لازم و ملزوم ہیں۔ مویشیوں کی اعلیٰ نسلوں کا تحفظ اور افزائش کے اصولوں سے کسانوں کو واقف کرانا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں حیوانات کے شفاخانے اور انیمل ہسبینڈری کالجوں سے استفادہ کرنا لازمی ہے۔ اس لئے ملک کے تمام صوبوں میں اس طرح کے شفاخانے اور کالج کھولنے کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مویشیوں کے علاج معالجہ میں بھی ریسرچ کی بہت اہمیت ہے۔ اعلیٰ قسم کے مویشیوں کی افزائش نسل وقت کی اہم ضرورت ہے۔ حکومت پاکستان کو اس کی اہمیت اور افادیت کا علم ہے۔ اسی لئے ہر سال ملک کے بڑے بڑے شہروں میں گھوڑوں اور مویشیوں کے میلے منعقد کئے جاتے ہیں۔ عمدہ اور اعلیٰ نسلوں کے مویشیوں پر انعامات دیئے جاتے ہیں۔ ڈیری فارم اور پولٹری فارم بھی خوراک کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں اپنا حصہ ادا کر رہے ہیں۔ ملک کی زرعی حالت کو بہتر بنانے کے لئے زرعی یونی ورسٹیاں قائم کی گئی ہیں۔ ان یونی ورسٹیوں کے ساتھ ورکشاپوں میں زرعی آلات تیار کئے جاتے ہیں۔ قومی تعلیمی کمیشن نے تجویز پیش کی ہے کہ زرعی یونی ورسٹیوں کے کام کو بہتر بنانے اور ترقی دینے کے لئے کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ COUNCIL OF AGRICULTURAL RSEARCH قائم کی جائے جس کا کام تحقیقی کاموں میں طلبہ کی رہنمائی کرنا ہو۔ زرعی یونی ورسٹیوں کو آزادانہ کام کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔ تاکہ ان کو زرعی تحقیق و دریافت میں دقت نہ ہو۔

پاکستان میں بمقام لائل پور ایک زرعی یونی ورسٹی کا قیام عمل میں آچکا ہے جس میں غیر ملکی ماہرین بھی کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح ٹنڈو جام میں بھی زرعی کالج قائم کیا گیا ہے۔ جس کا مقصد کاشتکاری کی ترقی و توسیع ہے اتنا ہی نہیں

بلکہ کمیشن نے اسکول کی سطح پر مضامین کا زرعی گروپ بھی قائم کرنے کی سفارش کی ہے تاکہ ابتدا ہی سے بچّے کو اس کی تعلیم و تربیت مل سکے۔

انجنیئرنگ کی تعلیم ENGINEERING EDUCATION

جیسا کہ بار بار تحریر کیا جا چکا ہے کہ دورِ جدید سائنس اور ٹیکنولوجی کا زمانہ ہے۔ اس دور میں اگر ہم کو اپنی فلاح و بہبود، ترقی و خوشحالی مقصود ہے تو ہم کو انجنیئرنگ کی تعلیم پر بھی بہت زور دینا ہوگا۔ اس تعلیم کا مقصد طلبہ کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ ریاضی اور طبعی سائنس کے اصولوں کے ذریعہ ان مسائل کا حل تلاش کریں جو قدرتی ذرائع کے استعمال میں اور قدرتی طاقتوں کی تسخیر میں معاون و مددگار ثابت ہوں۔ نیز طلبہ میں اپنے ملک کی مصنوعات پیدا کرنے اور استعمال کرنے کا جذبہ بیدار ہو۔ اس سلسلہ میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایسی فنی تعلیم کا انتظام و انصرام کیا جائے جو ملک کی معاشرتی اور اقتصادی حالات بہتر بنانے میں ملک اور قوم کی رہبری کر سکے۔ کیوں کہ ملک کی بقا کا انحصار اس بات پر ہے کہ تمام پیشوں کو خاطر خواہ اہمیت دی جائے۔ اس کے لئے ہر فن کے ماہرین کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر بچے کا رجحان طبع بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اس لئے طلبہ میں اپنے پسندیدہ پیشے سے لگاؤ پیدا کرنا بھی بے حد ضروری ہے۔ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا اور ان میں قیادت کی صلاحیتیں پیدا کرنا۔

صنعتی ترقی کے لحاظ سے پاکستان ابھی ابتدائی منازل سے گزر رہا ہے اسے اقتصادی لحاظ سے خود کفیل بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ملک میں انجنیئرنگ کی تعلیم کا مؤثر انتظام کیا جائے تاکہ پاکستان کے لوگوں کو طاقت کے قدرتی وسائل کو کام میں لانے کے قابل بنا سکیں۔ اسی طرح سے ملک کی معاشی حالت بہتر ہو سکتی ہے ملک کے انجنیئر اپنی تخلیقی سرگرمیوں کو بروئے کار لاکر خام اشیاء مہیا کر کے مشین

تیار کر سکتے ہیں اور افراد سے بھی خاطر خواہ کام لے سکتے ہیں۔ ہمیں ایسے انجنیئروں کی ضرورت ہے جو قیادت کی صلاحیتوں کے حامل ہوں، جو اپنے فن میں ماہر ہوں۔ جو اپنے فن میں مہارت کے ساتھ ساتھ ہمارے فنی مسائل کو بھی حل کر سکتے ہوں۔ پاکستان میں انجنیئرنگ کی تعلیم وہی ہونی چاہیئے جو طلبہ میں تخلیقی کام کرنے کی صلاحیتیں بیدار کر سکے۔ ان انجنیئروں میں قومی وسائل سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیتیں ہوں۔ انھیں صرف کتابی معلومات پر ہی اکتفا نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ مشینوں کی عملی صورت سے بھی آگاہ ہونا چاہیئے۔

جہاں تک نصاب کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں:

تمام انجنیئرنگ کالجوں میں ان طلبار کو داخلہ دیا جائے۔ جنھوں نے سائنس اور ریاضی کے ساتھ انٹرمیڈیٹ پاس کیا ہو۔ یہ طلبہ چار سال تک انجنیئرنگ کی تعلیم حاصل کریں گے۔

تمام انجنیئرنگ کالجوں میں کیمیکل و الیکٹریکل کورسوں کے علاوہ کیمیکل اور کان کنی کی بھی تربیت دی جائے۔ دھات کا کام۔ پٹرولیم۔ منرالوجی سیرامک کو بھی شامل کیا جائے۔

طلبہ میں وسعت نظری پیدا کرنے کے واسطے ایسا نصاب تشکیل دیا جائے جس میں معاشرتی علوم بھی شامل ہوں۔ عملی کام پر خاص طور سے زور دیا جائے اور طلبہ کو کتابی تعلیم کے علاوہ ملوں اور ورکشاپوں میں عملی تربیت بھی دی جائے۔

انجنیئرنگ کی تعلیم کا مقصد محض انجنیئر پیدا کرنا ہی نہیں بلکہ ایسے ماہر پیدا کرنا ہے جن میں اہلیت و فنی مہارت کے ساتھ ساتھ قیادت کی صلاحیتیں بھی ہوں۔ ایسے انجنیئر جو مقامی وسائل سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں۔ افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے انجنیئروں کی طرح مسلسل اور انتھک کام کرنا چاہیئے۔ ان کو ریسرچ میں خاص طور سے دل چسپی لینی چاہیئے۔ انجنیئرنگ کی تعلیم پائیدار اور ہمہ وقتی ہونی چاہیئے۔

عوام کا معیار زندگی بلند کرنے اور پاکستان کا مستقبل روشن کرنے کے لئے انجنیئرنگ
کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ جس کے لئے ہم کو سائنسی تجربہ گاہیں
اور ساز و سامان کی ضرورت ہے۔

قومی تعلیمی کمیشن نے سفارش کی ہے کہ پاکستان میں
انجنیئرنگ یونی ورسٹیاں قائم کی جائیں۔ لاہور کے انجنیئرنگ کالج کو وسعت دے
کر یونی ورسٹی کا درجہ دیا جا چکا ہے۔ پشاور اور کراچی یونی ورسٹی کے ساتھ انجنیئرنگ
کالج منسلک ہیں۔ ان انجنیئرنگ یونی ورسٹیوں میں ریسرچ کے لئے خاطر خواہ
انتظامات ہونے چاہئیں۔ قائد اعظم نے قیام پاکستان کے موقع پر فرمایا تھا۔

"قدرت نے تمہارے ساتھ بڑی فیاضی کا سلوک کیا ہے تمہیں
ہر وہ چیز دی ہے جس کی تمہیں اپنی قومی زندگی کی تعمیر میں ضرورت
ہے۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم قدرت کے ان عطیات کو صحیح طور پر کام
میں لا کر ملک کو مضبوط اور ترقی یافتہ بناؤ۔"

قومی تعلیمی کمیشن نے کہا ہے کہ ہمیں انجنیئرنگ کے طلبہ کو مقامی مواد کے
استعمال کرنے کے طریقے بتانے چاہئیں۔ تاکہ وہ مقامی مواد کو تعمیری کاموں میں
استعمال کر سکیں۔

قانون کی تعلیم LEGAL EDUCATION

ملک و قوم کی ترقی اور استحکام کے لئے ضروری ہے کہ شہریوں کو قانون
کے مفہوم اور اہمیت سے آگاہی ہو۔ ان کو معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ ان کے حقوق اور
فرائض کیا ہیں؟ ان میں قانون کے احترام کا جذبہ ہونا بھی شرط ہے۔ جس کے
لئے قانون کی تعلیم بہت ضروری ہے۔ بی۔ اے کرنے کے بعد قانون کی تعلیم
یعنی ایل۔ ایل۔ بی کا دو سال کا کورس ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم کو ایسے قانون دان
حضرات کی ضرورت ہے جو نہ صرف اپنے پیشے میں مہارت رکھتے ہوں بلکہ معاشرے

سے بھی ان کو دلچسپی ہو تاکہ وہ معاشرے کی برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کر سکیں۔ قانون کی تعلیم میں ریسرچ کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ دیگر فنون میں موجودہ سیاسی و معاشی تقاضوں کو سمجھنے کے لئے ہمیں قانونی ماہرین کی اشد ضرورت ہے ہم کو ایسے ماہر قانون دانوں کی بھی ضرورت ہے جن میں زبردست پیشہ ورانہ مہارت، عظمت اور رواداری ہو۔ قانون کا کورس اگر دو سال سے تین سال کر دیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا پہلے دو سال قانون کے اصولوں اور تاریخ کے مطالعہ پر صرف کئے جائیں۔ تیسرے سال میں عملی مضامین پر زور دیا جائے ایل۔ ایل۔ بی کی سند حاصل کرنے کے بعد قانون میں ایم۔ اے کی ڈگری کے لئے دو سال کا کورس ہو۔ اور ڈاکٹریٹ کے لئے مزید تین سال کی مدت مقرر کی جائے قابل اور ماہر افراد کی نگرانی میں تحقیق کا کام سرانجام دیا جائے۔ قانون کی تعلیم میں اساتذہ کے تقرر کے سلسلے میں خاص احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے جس کے لئے ملک کے قابل اور ماہر قانون دانوں کی خدمات حاصل کی جائیں۔

کامرس کی تعلیم COMMERCIAL EDUCATION

پاکستان کو کامرس کی تعلیم کی بھی بے حد ضرورت ہے ہمارے ملک کا شمار دنیا کے ترقی پذیر ممالک میں ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں ترقی ہو رہی ہے اور نئے نئے ادارے وجود میں آ رہے ہیں جن کا انتظام سنبھالنے کے لئے ماہرین کی ضرورت ہے چنانچہ کمرشل تعلیم کے ذریعہ ہم مناسب افراد پیدا کر سکتے ہیں۔ انتظامیہ کے دفتر جو اشیاء کی پیداوار کو فروغ دے سکیں بینکنگ۔ اکاؤنٹنگ سیکرٹری۔ پبلسٹی۔ خرید و فروخت۔ ٹیکسٹائل۔ گورنمنٹ دفاتر کے انتظامات و اسلوب سے واقفیت صنعتی و پبلک نظم و نسق و بزنس میں تجربہ کار افراد ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کر سکتے ہیں۔ اس قسم کی تعلیم کے لیے Commercial Institutes اور کامرس کالجوں کا قیام وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ان اداروں سے نکلنے والے

طلبہ اپنی تعلیمی و فنی مہارت کے اعتبار سے کاروباری شعبوں میں نوکریاں حاصل کر سکیں گے۔ کمرشیل تعلیم کو مقبول بنانے کے لئے شبینہ کلاسوں کا بندوبست ہونا چاہیئے۔ ان جماعتوں سے وہ لوگ بھی فائدہ اٹھا سکیں گے۔ جو صنعتی و تجارتی اداروں میں کام کر رہے ہیں اور اپنی پیشہ ورانہ اہلیت میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں کمرشیل تعلیم کے امیدواروں کو پیشہ ورانہ مہارت کو پرکھنے کے لئے Technical Education کے ادارے پاکستان میں قائم ہو چکے ہیں۔ جن کے فرائض میں امتحانات لینے کے علاوہ کمرشیل تعلیم کے نصاب کی تشکیل اور ملک کے مختلف کاروباری حلقوں سے گہرا رابطہ اور ان کے مسائل سے واقفیت حاصل کرنا بھی شامل ہے۔ کمرشیل تعلیم کا نظم و نسق *Director of Technical Education* کے سپرد ہے جو صوبائی محکمہ تعلیم کی پالیسی پر عمل کرتا ہے۔

طبی تعلیم MEDICAL EDUCATION

یہ پیشہ انسانی علوم میں سب سے زیادہ مقدس اور باوقار ہے اس سے منسلک افراد بلاشبہ بنی نوع انسان کے سچے بہی خواہ کہے جا سکتے ہیں۔ طبی ماہرین کا کام انسانیت کی خدمت ہے اور مریضوں کو تکالیف سے نجات دلانا ان کا اولین فرض ہے یہ انسانی دلوں کی دھڑکن سننے والے زخموں پر مرہم رکھنے والے اور زندگی کی آخری سانس لینے والے انسانوں کے لئے زندگی کے پیغام بر ہیں حکومت پاکستان عوامی صحت کے مسائل سے بخوبی واقف ہے اس نے عوام کو طبی سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے ملک میں شفاخانے کھول رکھے ہیں۔ لیکن ملک میں ابھی تک تربیت یافتہ ڈاکٹروں کی قلت ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے بڑے بڑے شہروں میں میڈیکل کالج کھولے گئے ہیں۔ پاکستان میں لاہور، ملتان، پشاور، کراچی، حیدرآباد میں میڈیکل کالج کام کر رہے ہیں اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے مریضوں کی تعداد کے پیش نظر زیادہ

اسپتال قائم کرنا ضروری ہے اس کے علاوہ دوا سازی کے کارخانے۔ ڈاکٹروں اور نرسوں کی تعلیم کے لئے کالج اور اسکول۔ امراض کی تحقیق و علاج کی ریسرچ کے لئے انتظامات و ساز و سامان کی بھی ضرورت ہے۔ حکومت اس سلسلے میں جو کچھ اس سے ہو سکا کر رہی ہے۔ بعض طبی تحریکیں تو قومی سطح پر شروع ہو چکی ہیں وبائی و موسمی امراض کی روک تھام کے لئے عالمی ادارہ صحت کی طرف رجوع کیا گیا ہے۔ چیچک، ملیریا اور ہیضہ کی روک تھام کے لئے بہت سے افراد کام کر رہے ہیں۔ ملک میں پوسٹ گریجویٹ اور میڈیکل ریسرچ کے لئے مراعات کی کمی اب تک محسوس کی جا رہی ہے۔ ادویات اور سرجری میں ماہرین نہ ہونے کے برابر ہیں۔ موجودہ میڈیکل کالجوں میں، لائبریوں اور ریسرچ کے سامان کی کمی ہے اعلیٰ ترین کلاسوں کے لئے بہترین اور معیاری کورسوں کا اہتمام وقت کا تقاضہ ہے طبی تعلیم ملک بھر میں مقبول ہو رہی ہے اور میڈیکل کالجوں میں داخلے کے لئے امیدواروں کی روز افزوں تعداد اس طرف عوام کی توجہ و دلچسپی ظاہر کرتی ہے امیدواروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر حکومت نے پرانے میڈیکل کالجوں میں توسیع کر دی ہے۔ کئی نئے میڈیکل کالج بھی کھولے جا رہے ہیں۔ ان کے علاوہ دانتوں اور آنکھوں کے اسپتال بھی کام کر رہے ہیں۔ نرسنگ کا پیشہ بھی ترقی کر رہا ہے ملک میں میڈیکل یونی ورسٹیوں کے قیام کی بھی ضرورت ہے حکومت کو اس سلسلے میں قدم اٹھانا چاہیئے۔

جسمانی تعلیم Physical Education

تاریخ شاہد ہے کہ ہر ترقی یافتہ قوم نے جسمانی تعلیم پر ضرور توجہ دی ہے کیونکہ جسمانی تعلیم ہی فرد کی صحت کی ضامن ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی افادیت سے انکار ناممکن ہے۔ صحت مند جسم میں صحت مند دماغ ہوتا ہے۔ اس لئے طلبہ کو جسمانی تعلیم کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے

اسکولوں میں .P.T.I اور کالجوں میں .D.P.I کام کر رہے ہیں۔ ملک کے مختلف حصوں میں جسمانی تعلیم کے لئے تیرہ کالج کھولے جا چکے ہیں ان کالجوں میں اساتذہ کو جسمانی تربیت کے اصول بتائے جاتے ہیں۔ تاکہ وہ اسکولوں اور کالجوں میں ان اصولوں کو مدنظر رکھ کر طلبہ کی جسمانی تربیت کر سکیں جسمانی تعلیم کو کالجوں میں بطور مضمون پڑھائے جانے کی بھی کمیشن نے سفارش کی ہے

اساتذہ کی تعلیم Teacher Education

اساتذہ کو اسلامی معاشرے میں ایک اہم مقام حاصل رہا ہے۔ اس کو معمار قوم کے معزز لقب سے نوازا جاتا ہے کسی ملک کے نظام تعلیم میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے انقلابی قسم کے اساتذہ کا ہونا لازمی ہے معلم کے عظیم منصب کی شہادت قرآن پاک کی آیات، احادیث نبوی اور بزرگوں کے اقوال سے جا بجا ملتی ہے۔ اسلامی دور حکومت میں استاد کی حیثیت ایک ذہنی لم روحانی قائد کی تھی۔ انگریزی تعلیم نے اس کی حیثیت کو ختم کر دیا۔ قومی تعلیمی کمیشن نے اس مقولے کے پیش نظر کہ کسی قوم کا معیار تعلیم اس کے اساتذہ کی تربیت پر ہے، اساتذہ کی اعلیٰ تعلیم اور بہتر تربیت پر بہت زور دیا ہے اور اس نے اس کو تعلیم کا محور قرار دیا ہے۔ جہاں تک تربیت اساتذہ کا سوال ہے و اس پر بھی کمیشن نے تفصیل سے بحث کی ہے۔

ابتدائی جماعتوں کے اساتذہ میٹرک کے بعد دو سال کا تربیتی کورس کریں گے۔ جو جے۔ وی یا پی۔ ٹی۔ سی کہلاتا ہے۔

ثانوی جماعتوں کے اساتذہ ایف۔ اے پاس کرنے کے بعد سی ٹی کریں گے جس کی مدت ۹ ماہ ہوگی۔ نویں دسویں جماعتوں کے اساتذہ بی۔ اے کے بعد گیارہ ماہ کی ٹریننگ کر کے بی۔ ایڈ کی ڈگری حاصل کریں گے۔

اعلیٰ ثانوی جماعتوں کے اساتذہ جو کسی مضمون میں ایم۔ اے ہوں گے

ان کے لئے ریفریشر کورس کی سفارش کی گئی ہے۔

ڈگری کلاسوں کے اساتذہ ایم۔ اے، بی۔ ایڈ یا ایم۔ ایڈ کے مالک ہوں گے۔

زراعت کے اساتذہ۔ بی۔ ایس۔ سی (زراعت) بی۔ ایڈ ہوں گے۔

ہوم اکنامکس بی۔ اے، بی ایڈ

ٹیکنیکل ٹیچر۔ ٹیکنیکل تعلیم کا ڈپلوما۔ آرٹ اور کرافٹ کا دو سال کا کورس یا تین ماہ کا مختصر کورس یا ایم۔ ایڈ ٹیکنیکل ہوں گے۔ ان کے علاوہ ملازمت کے دوران تربیت اور ریفریشر کورسوں کا بھی انتظام ہوگا۔

ہیڈ ماسٹروں اور انسپکٹروں کے واسطے توسیعی مراکز - *Extension Centres.* کا انتظام کیا جائے گا۔ ملک میں معلمین کی بہت کمی ہے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے نارمل اسکول اور ٹریننگ کالجوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ وقتی طور پر ہائی اسکولوں کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً مختصر کورس *Short Courses* کا بھی انتظام کیا جائے گا۔ کمیشن نے آرٹ، کرافٹ اور زرعی تعلیم پر بھی خاطر خواہ توجہ دی ہے۔ ان شعبوں میں اساتذہ کی تربیت کے لئے بھی مناسب انتظامات کئے گئے ہیں زرعی تعلیم کے لئے تین تین ماہ کا مختصر نصاب مقرر کیا گیا ہے۔ اس کے لئے لائل پور زرعی یونی ورسٹی اور ٹنڈ وجام میں انتظامات کئے گئے ہیں۔ بی۔ ایس۔ سی ایگریکلچر کے ساتھ بی۔ ایڈ زراعت کی ڈگری بھی دی جارہی ہے جس کا اہتمام لائل پور یونی ورسٹی کرتی ہے اس طرح گھریلو سائنس *Home Economics* میں بھی بی۔ ایڈ کا ڈگری کورس شروع کیا گیا ہے۔ ٹیکنیکل معلمین کا بھی انتظام کیا گیا ہے *PILOT SCHOOLS* کے لئے ٹیکنیکل اساتذہ کو جو پہلے سے تربیت یافتہ ہیں۔ ٹیکنیکل تعلیم کا ڈپلوما دیا جاتا ہے آرٹ اور کرافٹ کے لئے دو سال کا کورس ہے اور ساتھ ہی ساتھ تین تین ماہ کے مختصر کورس کا بھی انتظام ہے۔

کمیشن نے اس بات پر زور دیا ہے کہ طلبہ میں اتنا ذہنی شعور ثانوی تعلیم میں پیدا کر دیا جائے کہ وہ خود اپنے لئے پیشے کا انتخاب کریں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے کیریر ماسٹر Carrier Master کا انتظام کیا جائے جو طلبہ میں سوجھ بوجھ پیدا کریں۔ ان کی وقتاً فوقتاً رہنمائی کریں۔ اور ان میں استاد بننے کی رغبت پیدا کریں تاکہ لوگ اس طرف بھی آنے کی کوشش کریں۔ کمیشن نے پرزور سفارش کی ہے کہ نصاب تعلیم میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ تمام تربیتی اداروں میں ایک ہی قسم کا نصاب مناسب نہیں۔ ہر علاقے کی ضروریات اور حالات کے تحت نصاب تشکیل دیا جائے۔ البتہ مقاصد میں یکسانیت ہونا شرط ہے چنانچہ نصاب میں تعلیمی نظریات، تدریسی طریقے، دربچوں کی نفسیات پر خاص طور سے توجہ دی جا رہی ہے۔

اعلیٰ تعلیم

UNIVERSITY EDUCATION

دورِ جدید تحقیق و جستجو کا زمانہ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آج زندگی کے مختلف شعبوں اور علوم کی مختلف شاخوں میں تیزی سے ترقی ہو رہی ہے۔ آج کا انسان چاند پر کمندیں پھینک رہا ہے۔ اس نے زندگی کے ہر شعبے میں اتنی ترقی کر لی ہے کہ اگر گزشتہ دور کا انسان اس دنیا کو دیکھے تو یقیناً ورطۂ حیرت میں گم ہو کر رہ جائے۔ لیکن ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی مسائل بھی دن بدن پیچیدہ سے پیچیدہ ہوتے جا رہے ہیں۔ جن کو عام لوگ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ لہٰذا ہمیں زندگی کے ہر شعبے اور علوم میں ایسے افراد کی ضرورت ہے جو قوم کی رہنمائی کر سکیں۔ ایسے افراد ہمیشہ اعلیٰ تعلیم سے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ذہنی استعداد کو بروئے کار لاتے ہوئے مختلف شعبوں میں تحقیقات کرتے ہیں اور آنے والی نسلیں ان سے مستفید ہوتی ہیں۔

اعلیٰ تعلیم سے ہی ترقی یافتہ ممالک نے ترقی کی ہے کیونکہ وہاں اس تعلیم کے لئے ہر قسم کی سہولتیں میسر ہوتی ہیں اور ہر شخص اپنے اپنے رجحانات کے مطابق علم حاصل کر سکتا ہے۔ علم ہی ہے جو ان میں تحقیق و جستجو کا مادہ پیدا کرتا ہے۔ اور انھیں، زندگی کے مسائل سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ علم ہی کی بدولت انسان نے چاند کو مسخر کر لیا ہے۔ یہ سلسلہ اعلیٰ تعلیم کی بدولت ہے۔

اگر ہم مغربی ممالک کی ترقی پر طائرانہ نظر ڈالیں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ ان

نے یہ ترقی صرف اعلیٰ تعلیم کی ہی بدولت حاصل کی ہے۔ وہاں اعلیٰ تعلیم کے انتظامات ...ندگی سے اب ہم دیئے جاتے ہیں کہ افراد میں تحقیق و جستجو کا مادہ پیدا ہوتا ہے ہم کو بھی اگر ترقی کرنی ہے تو ہم کو اعلیٰ تعلیم کو اہمیت دینی ہوگی کیونکہ اعلیٰ تعلیم کے ادارے ہی قوم کو لیڈر مہیا کرتے ہیں۔ اور پھر یہی قوم کی اصلاح کرتے ہیں۔ علی گڑھ کالج کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اعلیٰ تعلیم کی ہی بدولت ہم نے لوگوں کے جذبات کو ابھارا اور پاکستان حاصل کیا۔ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہی پاکستان کو مضبوط اور مستحکم بنا سکتے ہیں۔

اعلیٰ تعلیم ہی کی بدولت ہم انسانیت کی بہتر خدمت کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اسی تعلیم کی بدولت تحقیقات کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور اسی کی وجہ سے معاشرہ کی خدمت کا موقع ملتا ہے۔ اسی تعلیم کی بدولت مختلف ایجادات ہوتی ہیں جو انسانیت کی بقاء کی محافظ ہیں میڈیکل میں اعلیٰ تعلیم ہی کی وجہ سے ایسی ایسی دوائیاں ایجاد ہوئی ہیں جن کے استعمال سے ہم انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں۔

اعلیٰ تعلیم ہی خوش حالی کی ضامن ہوتی ہے۔ پاکستان نئی مملکت ہے۔ جس کے قدرتی ذخائر سے تب ہی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ جب ہم اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ کیونکہ اس تعلیم سے افراد میں سوچ و بچار کا وہ مادہ پیدا ہوگا۔ جس سے وہ قدرتی ذخائر کا پتہ لگا سکیں گے۔ جس سے ملک کی اقتصادی، زرعی اور فنی ترقی بھی ہوگی۔

ملک کا قیمتی سرمایہ افراد ہوتے ہیں۔ جو اپنی صلاحیتوں سے نت نئے طریقے دریافت کرتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان میں ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ اجاگر کر دیا جائے۔ اس مختصر سی بحث کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ

اعلیٰ تعلیم؛ قوم کے لئے رہنما تیار کرتی ہے۔ ایسے رہنما جو نہ صرف نوجوانوں کے اخلاق و کردار کو سنوارتے ہیں۔ بلکہ قوم کی خدمت کا جذبہ بھی بیدار کرتے ہیں۔

اعلیٰ تعلیم : انسانیت کی بقا کے لئے لازمی و ناگزیر ہے۔
اعلیٰ تعلیم : تحقیقات اور ترقی کی پہلی سیڑھی ہے۔
اعلیٰ تعلیم : انسان کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ زمین کا سینہ چیر کر اس کے خزانے تلاش کر سکے۔
اعلیٰ تعلیم : کے بغیر قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ یہی تعلیم قوم کی خوش حالی کی ضامن ہے اس لئے ہمیں ہر صورت ہر حالت اور ہر قیمت پر اپنے افراد کو اعلیٰ تعلیم سے سجانا چاہیئے۔

ملت کی تعمیر میں یونیورسٹی ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ وہ ملت کی تعمیر کے لئے ڈاکٹر، انجنیئر، معلم اور لیڈر تیار کرتی ہے۔ جو اپنی مساعی جمیلہ سے ملت کو مضبوط و مستحکم کرتے ہیں۔ اقتصادی اور صنعتی تعلیم کی بدولت معیار زندگی بلند ہوتا ہے زرعی و معدنی وسائل کا احسن طریق سے استعمال کرنے کے لئے ٹیکنیکل ماہرین پیدا کرتا ہے۔ ہماری یونیورسٹی کی تعلیم میں پیشہ ورانہ اور ٹیکنیکل تعلیم پر زور نہیں دیا جاتا۔ اس تعلیم میں ریسرچ کی بھی بہت اہمیت ہے کیونکہ ہم اسی کی بدولت ایسے افراد پیدا کرتے ہیں جن میں تحقیق و جستجو کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور پھر وہ آئندہ زندگی میں بھی انہیں تجربات کو بروئے کار لاتے ہوئے معاشرے کی خدمت کرتے ہیں تعلیمی کمیشن نے اس سلسلے میں کہا ہے:

"ہم نے ہمیشہ اس بات پر اصرار کیا ہے کہ تحقیق اور ریسرچ یونیورسٹی تعلیم کا ایک اہم و لازمی حصہ ہو۔ یہ ہماری اقتصادی ترقی کے لئے ضروری ہونے کی وجہ سے نہ صرف قومی اہمیت کا حامل ہے۔ بلکہ اس سے معلمین ذہنی طور پر بیدار اور علوم میں نئی نئی راہوں سے آشنا بھی ہو جائیں گے۔ اور ریسرچ کی بدولت اپنے طلبہ میں تحقیق و جستجو کا جذبہ بھی پیدا کر سکیں گے ریسرچ کا کام ہر اس ملک کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے جو ترقی و مضبوطی اور خوشحالی کا خواہاں ہو۔"

ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے۔ اس لئے ہمیں ان معلومات سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ جن کی ہم کو ضرورت ہے یونی ورسٹیاں اس سلسلے میں قوم وملت کی بڑی خدمات انجام دے سکتی ہیں۔

یونی ورسٹی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عوام سے زیادہ سے زیادہ نزدیک رہیں اور اس خلیج کو کم کرنے کی کوشش کریں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے اور عوام میں پیدا ہو گئی ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل اصولوں کو یونی ورسٹی کو اپنانا چاہیئے

۱۔ سب سے پہلے مقامی آبادی کا ایک معاشرتی سروے کیا جائے۔ جس میں یونی ورسٹی کے طلبہ حصہ لیں۔ یونی ورسٹی کے سوشل ورک و عمرانیات کے شعبے اس سلسلے میں خاص امداد دے سکتے ہیں۔ ایسے سروے کے ذریعہ سے مقامی آبادی کے اقتصادی، ثقافتی، مالی اور ذہنی معیار کا اندازہ ہو سکے گا۔

۲۔ ان مسائل کو حل کرنے کے سلسلے میں غور وخوض کیا جائے۔ تاکہ آبادی اور عوام کی حالت بہتر ہو سکے۔

۳۔ اس کام میں یونی ورسٹی کے طلبہ کو عملی طور پر شریک کیا جائے۔ اس سلسلے میں کمیشن نے سفارش کی ہے کہ ہر کالج کے اسٹاف میں کم از کم ایک ممبر کو یہ کام سپرد کیا جائے کہ وہ معاشرتی سروے کا منصوبہ تیار کرے اس کو مشتہر کرے اور اس کے لئے طلبہ اور اساتذہ کا تعاون حاصل کرے۔ ایسے منصوبوں کی صرف معاشرتی اہمیت ہی نہیں بلکہ یہ عملی قسم کا کام ان کی ذہنی صلاحیت کی بھی نشو ونما کرتا ہے چنانچہ اب یونی ورسٹی اس قسم کے نہ صرف منصوبے تیار کرتی ہے بلکہ انھیں عملی اہمیت بھی دی جاتی ہے اس طریقے سے بھی یونی ورسٹی ملت کی تعمیر میں حصہ لیتی ہے۔

مندرجہ بالا حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ یونی ورسٹی ایک ایسا سرچشمہ ہے جہاں سے ملت کی تعمیر کے منصوبے پھوٹتے ہیں۔

اعلیٰ تعلیم کے نقائص
DRAWBACKS OF UNIVERSITY EDUCATION

ویسے تو اعلیٰ تعلیم میں لاتعداد نقائص ہیں۔ لیکن ہم مندرجہ ذیل سطروں میں چند کا تذکرہ کر رہے ہیں۔

۱۔ یونی ورسٹی کی تعلیم کا قومی زندگی سے بہت کم تعلق ہے۔ داخلے کا معیار لیاقت نہیں بلکہ اثر اور رسوخ ہے۔ موجودہ حالات میں غریب لیکن ذہین طلبہ یونی ورسٹیوں میں داخلہ نہیں لے سکتے۔ اس وجہ سے ہمارا یونی ورسٹی کا نظام نہ تو جمہوری ہے نہ اسلامی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یونی ورسٹی میں داخلے قابلیت کی بنیاد پر دئیے جائیں۔ تاکہ ہر کس و ناکس کو تعلیم میں مساوی مواقع مل سکیں۔

۲۔ تعلیم زندگی کا معیار بلند کرنے میں کوئی مدد نہیں کرتی اور اس سے مالی فوائد بھی حاصل نہیں ہوتے۔

۳۔ یونی ورسٹی کے گریجویٹ عموماً بے کاری کا شکار رہتے ہیں۔ سنہ ۱۹۴۲-۴۳ء میں سارجنٹ رپورٹ کے مطابق محض ۳۰٪ کو صحیح ملازمت ۲۰٪ بے کار اور ۵۰٪ کو ان کی لیاقت کے مطابق ملازمت نہیں مل سکتی تھی۔ آج حالات اس سے بھی زیادہ بدتر ہیں۔

۴۔ امتحانات کا طریقہ طالب علموں کی غور و فکر کی صلاحیت کی نشو و نما نہیں ہونے دیتا۔

۵۔ یونی ورسٹی تعلیم میں ایسے طلبہ کے لئے کوئی آسانیاں نہیں جو برسرِ روزگار ہوں اور شام کو تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہوں۔

۶۔ طلبہ کی اکثریت بحث و تمحیص کی بجائے صرف لیکچر پر ہی اکتفا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ٹیوٹوریل سسٹم پر بھی سختی سے عمل نہیں ہوتا۔

۷۔ استاد اور شاگرد میں روحانی یا ذہنی رشتہ نہیں قائم ہوتا۔

۸۔ فیس زیادہ ہے اور دارالاقامہ کا معیار بھی اچھا نہیں ہے۔

۹۔ یونی ورسٹیوں کی مالی حالت کمزور ہے صرف گورنمنٹ گرانٹ اور فیسوں کی آمدنی ہوتی ہے۔ اس لئے مالی حالت کو بہتر بنانے کے لئے زیادہ طلبہ کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ یونی ورسٹیاں داخلے کا کوئی معیار نہیں رکھتیں۔

۱۰۔ غریب طلبہ کی مالی امداد کے مواقع بہت کم ہیں۔

۱۱۔ علمی اعتبار سے معیار گر گیا ہے۔ کالجوں کی توسیع کے ساتھ علم میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔

۱۲۔ اعلیٰ تعلیم میں نظم وضبط کا معیار بھی بہت پست ہے۔

۱۳۔ یونی ورسٹیوں کی تعلیم محض کتابی ہو کر رہ گئی ہے۔ عملی زندگی سے اسے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

۱۴۔ تحقیقات اور تجربات کے بارے میں مناسب سہولتیں میسر نہیں۔

۱۵۔ معیاری کتب خانوں کا بھی فقدان ہے۔

قومی تعلیمی کمیشن کی اصلاحی تجاویز

SUGGESTION OF THE NATIONAL COMMISSION

۱۔ اعلیٰ تعلیم کا اہتمام ابتدائی اور ثانوی تعلیم سے بالکل علیحدہ ہونا چاہیئے۔ اعلیٰ تعلیم ایک الگ منزل ہے جس کے لئے ۱۵ یا ۱۶ سال کا طالب علم اپنی ذہنی ناپختگی کی وجہ سے بالکل غیر موزوں ہے۔ اعلیٰ تعلیم کا آغاز انٹرمیڈیٹ کے بعد ہوتا ہے۔ اس وقت طلبہ کی عمر ۱۸ سے ۱۹ سال کے درمیان تک پہنچ جاتی ہے۔

تمام اعلیٰ تعلیمی اداروں میں موزوں ترین اساتذہ کا تقرر کیا جائے داخلے کے وقت یونی ورسٹیوں اور کالجوں کے سربراہوں کو اپنی مخصوص ضروریات کے مطابق طلبہ کو داخلہ دینا چاہیئے اور ان کے قوانین داخلہ

یکساں اور متوازن ہونے چاہئیں۔

اعلیٰ تعلیم کی تین منزلیں مقرر کی جا سکتی ہیں۔ پہلی منزل میں طلبہ میٹرک کا امتحان پاس کر کے داخل ہوں۔ دوسری منزل بی۔ اے اور تیسری ایم۔ اے ہو جس کے بعد طلبہ تحقیقی نقطۂ نظر سے علم کی کسی خاص شاخ میں کمال حاصل کریں اور یونی ورسٹی انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دے۔ بی۔ اے آنرز کا بھی انتظام کیا جائے۔ ایم۔ اے میں داخلہ کے وقت مضمون کی شرط ہو۔ اسی مضمون میں داخلہ ملے گا جو اس نے بیشتر جماعتوں میں پڑھا ہو۔

یونی ورسٹیوں کا نصاب فرسودہ ہو چکا ہے اس میں قومی اور ملکی تقاضوں کے مطابق تبدیلی ہونی چاہیئے۔ ہماری یونی ورسٹیوں میں وہ تمام مضامین پڑھائے جا رہے ہیں جن کا زیادہ حصہ ادبی ہے۔ انگریزی زبردستی ٹھونس دی گئی ہے۔

ذریعۂ تعلیم اردو یا بنگالی ہونا چاہیئے (کیوں کہ اس وقت مشرقی پاکستان بھی تھا) تحقیقات کے ذریعہ ان دونوں زبانوں میں اضافہ کر کے انھیں ترقی دی جائے۔ نصابی کتب تیار کی جائیں تدریس کے ایسے طریقے اپنائے جائیں جو قومی زبانوں کے دامن کو وسیع تر کر سکیں۔

۷۔ دوسری مشرقی زبانوں مثلاً عربی۔ فارسی کی تعلیم پر توجہ دی جائے ان زبانوں سے ہماری ثقافت کا گہرا تعلق ہے۔ دنیا کی دوسری زبانیں بھی پڑھائی جائیں ان کی تدریس کے لئے ایک الگ ادارہ قائم کیا جائے

۸۔ علم اقتصادیات اور اس کے ماہرین کی ملک کو بہت ضرورت ہے ہمارا ملک اقتصادی اعتبار سے دنیا کے دیگر ممالک سے بہت پست ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے ماہرین اقتصادیات پیدا کئے جائیں جو ملکی وسائل کو پیش نظر رکھ کر اقتصادی منصوبہ بندی کریں۔

اس طرح افراد کی اقتصادی حالت بہتر ہوگی اور ان کا معیار زندگی بھی بہتر ہوگا۔

۹۔ ہمارے ملک کو بڑے بڑے شاعروں اور مفکروں کی بھی ضرورت ہے یہ لوگ سماجی اقدار کو زندہ رکھنے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں۔

۱۰۔ سائنس کی اعلیٰ تعلیم ہمارے ملک کے نوجوانوں کے لئے بہت ضروری ہے صرف سائنس کی تعلیم ہی نئی ایجادات اور انکشافات کے لئے راہیں کھول سکتی ہے۔

۱۱۔ موجودہ طریقہ امتحان ناقص ہے اس کی وجہ سے ہماری تعلیم بھی مہمل ہو کر رہ گئی ہے۔ طلبہ علم حاصل کرنے کی بجائے امتحان میں پاس ہونے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اس طرح ان کا علم سطحی رہتا ہے۔

تعلیمی کمیشن نے یونی ورسٹیوں کے داخلی، خارجی امتحانات کے سلسلے میں کہا ہے کہ یہ ماہرین تعلیم کے لئے بے شمار مسائل پیدا کر رہے ہیں۔ اگر صرف داخلی طریقہ امتحانات کو اپنالیا جائے۔ تو ان میں ممتحن کا غیر جانبدار رہنا بہت مشکل ہے۔ نتائج میں اس کی پسند و ناپسند کو بہت دخل ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں میانہ روی سب سے بہتر ہے داخلی و خارجی امتحانات کے نتائج کو ملا کر طلبہ کی قابلیت کا اندازہ لگایا جائے داخلی امتحانات تعلیمی سال کے دوران مناسب وقفوں کے بعد لئے جائیں۔ ان کا ریکارڈ محفوظ رکھا جائے۔ ان کی سالانہ ترقی کا دارومدار اس ریکارڈ پر مبنی ہونا چاہیئے جب تک طالب علم اپنے تعلیمی ادارے کا ریکارڈ بہتر نہ بنائے۔ اس کو سالانہ امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ کمیشن نے ۲۵٪ نمبر داخلی امتحانات اور ۷۵٪ نمبر خارجی امتحانات کے لئے تجویز کئے تھے۔ اس تجویز پر عمل کیا گیا۔ لیکن کامیابی نہ ہو سکی اس کی وجہ طلبہ کا عدم تعاون تھا۔ ویسے تجویز بہتر تھی کیونکہ اس میں کہا گیا تھا۔ کہ اگر

امیدوار کے داخلی وخارجی امتحانات کے نتائج میں غیر معمولی تفاوت نظر آئے تو متعلقہ افراد سے جواب طلبی بھی کی جا سکتی ہے۔ ہر طالب علم کو کامیاب ہونے کے لئے چالیس فی صد نمبر ہر مضمون میں لیکن پچاس فی صد مجموعی طور پر حاصل کرنے ضروری ہیں۔ سیکنڈ ڈویژن کے لئے ساٹھ فی صدی اور فرسٹ ڈویژن کے لئے ستر فیصد نمبر لانے ہوں گے (اس تجویز پر بھی عمل نہ ہو سکا) آنرز اور ایم۔ اے کے طلبہ کا تحریری امتحان کے علاوہ زبانی امتحان بھی لیا جائے۔

۱۲۔ زیادہ سے زیادہ افراد کو اعلیٰ تعلیم کے لئے مناسب سہولتیں دی جائیں۔

۱۳۔ علمی افق کو وسیع کرنے کے ساتھ ساتھ انسانی ارتقاء کی سمت بھی متعین کی جائے اور قومی منصوبہ بندی کی جانب بھی صحیح رہنمائی کرنے کا فریضہ انجام دے۔

۱۴۔ مختلف یونیورسٹیوں کے درمیان قریبی روابط ہونے چاہئیں تاکہ وہ سب ہی ایک ہی منصوبے پر عمل نہ کریں۔ بلکہ تقسیم کار کے اصول پر عمل کریں۔

۱۵۔ مناسب ساز وسامان، عمارت، تجربہ گاہیں، کتب خانے، کھیل کے میدان اور دیگر سہولتیں مہیا کی جائیں۔

۱۶۔ علاقے کی ضروریات کے مطابق مضامین نصاب میں شامل کئے جائیں۔

۱۷۔ طریقہ تدریس میں لیکچر کے علاوہ ٹیوٹوریل، سیمینار اور بحث ومباحثہ کا اضافہ کیا جائے۔ انفرادی توجہ اور رہنمائی کا بھی اہتمام ہونا چاہیئے۔

۱۸۔ اساتذہ کے لئے تدریس کے علاوہ ذاتی مطالعہ کی رہنمائی، ریسرچ وغیرہ طلبہ سے رابطہ، ان کی غیر تدریسی مشاغل کی رہنمائی اور نگرانی کو بھی شامل کیا جائے۔

۱۹۔ اساتذہ کے لئے اصول تعلیم سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اس مقصد

کے لئے وقتاً فوقتاً ریفریشر کورسوں کا انتظام ہونا چاہیئے۔

۲۰۔ زراعت، انجنیئرنگ اور میڈیکل تعلیم کے لئے الگ یونی ورسٹیاں ہونی چاہئیں۔

وغیرہ وغیرہ ،

مقاصد AIMS OF UNIVERSITY EDUCATION

یونی ورسٹی کی تعلیم ملک و ملت میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس لئے قومی تعلیمی کمیشن نے اس سلسلہ میں بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ یونی ورسٹی کی تعلیم دیتے وقت مندرجہ ذیل مقاصد کو پیش رکھنا چاہیئے۔

۱۔ قوم و ملک کی تعمیر کے لئے عظیم منصوبے۔

۲۔ قومی معیار زندگی بلند کرنا۔

۳۔ قومی یک جہتی و اتحاد پیدا کرنا۔

۴۔ تحقیق و جستجو کا مادہ پیدا کرنا۔

۵۔ ملکی ثقافت کی ترقی و ترویج

یونی ورسٹی کو معاشرتی زندگی کا آئینہ دار ہونا چاہیئے۔ معاشرتی فلاح و بہبود کے لئے سوشل ورک اور سوشیالوجی مضامین کو نصاب میں شامل کیا جائے ساتھ ہی ساتھ یونی ورسٹی کی تعلیم کو ثقافتی اور عملی زندگی کے ساتھ مربوط ہونا چاہیئے۔ آج کل ملک میں اچھے اساتذہ کا فقدان ہے اس لئے جو غیر ممالک میں پاکستانی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ان کو بلا کر یونی ورسٹی میں تدریس پر متعین کیا جائے۔ اور جو اساتذہ غیر ممالک میں ملازم ہیں انھیں ترغیب دی جائے کہ وطن واپس آکر ملک و قوم کی خدمت کریں۔ جہاں تک طلبہ کا سوال ہے تو ذہین اور قابل طلبہ کی ہمت افزائی کرنی چاہیئے اور ان کو قومی وظائف دینے کا انتظام بالالتزام ہونا چاہیئے۔

اعلیٰ تعلیم کے لئے ذریعہ تعلیم

MEDIUM OF INSTRUCTION AT UNIVERSITY LEVEL

تعلیمی کمیشن نے قومی زبان کی اہمیت و افادیت پر بہت زور دیا ہے۔ کیونکہ اس کی بدولت ہی ہم اپنے افراد میں تحقیق و جستجو کا جذبہ پیدا کر سکتے ہیں۔ ہمارے سامنے عربوں کی مثال موجود ہے۔ انھوں نے اہل یونان اور اہل روم کے جام و سبو سے اپنے ترسے ہوئے ہونٹوں کو ترکیا تھا انھوں نے یہ سب کچھ اپنی ہی زبان میں کیا، اور صرف دو سو سال کے قلیل عرصے میں وہ صحرا نشین سے استادِ زمانہ بن گئے۔

پروفیسر حمید مرحوم کے یہ الفاظ ہمارے لئے مشعل راہ ہیں اور رہیں گے۔

> " پاکستان میں جس قدر جلد ہم اردو زبان کو قومی زبان کا درجہ دیں گے۔ اتنا ہی زیادہ ہمارے اور ہمارے ملک کے لئے بہتر اور سود مند ہوگا۔"

امام غزالی اور ابن خلدون نے بھی تعلیم میں مادری زبان کی اہمیت ہمارے سامنے پیش کی ہے۔ اردو زبان کی وجہ سے یقیناً ہم معیارِ تعلیم کو بہتر بنا سکیں گے اور طلبہ نہ صرف اپنے مسائل کا حل بہتر طور پر کر سکیں گے۔ بلکہ اُس ذہنی غلامی سے بھی نجات حاصل کریں گے۔ جو عرصے سے ہمارے ذہنوں پر مسلط ہے۔

ہمارے ملک کی ثقافت کی بنیاد اسلامی روایات پر مبنی ہے اس کی وجہ سے پورے ملک میں ثقافتی یگانگت اور ہم آہنگی کا رنگ جھلکتا ہے۔ یونی ورسٹیوں کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ وہ ثقافت کی حفاظت کریں۔ اس لحاظ سے انھیں قومی زبان کو تعلیمی درجہ دینا چاہیئے۔ ساتھ ہی ساتھ علاقائی زبانوں کے ادب کی ترقی و نشو و نما کے لئے بھی پوری پوری کوشش کرنی چاہیئے۔ اس طرح سے ہم مختلف

علاقوں کو ایک دوسرے کے قریب لا سکتے ہیں۔ اور اردو کی وجہ سے مختلف حصّوں کے درمیان وحدت و یگانگت قائم کی جا سکتی ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ اردو زبان کو اپنانے میں سب سے بڑی دقت اس زبان میں درسی کتب کی کمیابی ہے۔ جو لاعلمی اور کوتاہ بینی پر مبنی ہے۔ ہم کو اگر ترقی کرنی ہے، تو قومی زبان پر خاطر خواہ توجہ دینی ہوگی۔ انگریزوں کو گئے ہوئے عرصہ ہوا لیکن آج تک ہم ذہنی طور سے غلام ہیں اور یہ غلامی اس وقت تک دور نہیں ہو سکتی جب تک ان کی زبان سے چھٹکارا حاصل نہ کر لیا جائے۔ جس کا واحد حل یہ ہے کہ اپنی زبان میں ہر قسم کی کتابوں کی تصنیف و تالیف پر توجہ دی جائے۔

مغربی پاکستان میں اردو بولی جاتی ہے۔ اگرچہ اس حصے میں مختلف زبانیں بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ لیکن علاقہ میں لسانی اتحاد اردو کی ہی وجہ سے قائم ہے۔ کمیشن کی رائے میں اردو زبان میں یہ خوبی ہے کہ اس میں بیگانگی نہیں ہے یہ دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ دوسری زبانوں کے الفاظ اس میں شامل کئے جائیں۔ تاکہ یہ پورے ملک کی عوامی زبان بن سکے۔ کمیشن نے اردو کو قومی زبان کی حیثیت دی ہے یہی وجہ ہے کہ کمیشن نے انٹر تک اس کو لازمی قرار دیا ہے۔ کمیشن نے زبان کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل سفارشات کی ہیں :

۱۔ قومی زبانوں (اردو ۔ بنگالی) کے لئے دو بورڈ قائم کئے جائیں جو ان زبانوں کو لسانی اور ادبی پہلوؤں پر ترقی کے منصوبے بنائیں۔
۲۔ ایک بورڈ سائنسی علوم کی اصطلاحات کو معیاری بنائے۔ مستند مصنفین کی امداد سے کتابیں۔ رسالے اور ان سائیکلوپیڈیا تیار کرائے۔
۳۔ اساتذہ کو خصوصی تربیت دی جائے۔

کمیشن کی سفارشات کی وجہ سے بی۔ اے اور ایم۔ اے میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا ہے۔ لیکن پیشہ ورانہ کالجوں اور سائنسی مضامین میں قومی زبان کو ذریعہ تعلیم بننے میں ابھی وقت لگے گا۔

نور خاں رپورٹ

جولائی ۱۹۶۹ء

NOOR KHAN S REPORT 1969

اقتدار سے ایوب خاں کی علیحدگی کے بعد شریف کمیشن کو غیر ضروری سمجھا گیا حالاں کہ اس کمیشن کی رپورٹ کے بہت سے ایسے حصے تھے جن پر عمل درآمد ہونا چاہیئے تھا اور اس میں حالات کے لحاظ سے مناسب ترمیم ہونی چاہیئے تھی۔ اس وقت کے نئے صدر یحییٰ خاں نے برسر اقتدار آنے کے بعد نور خاں صاحب کی سرکردگی میں ایک کمیشن مقرر کیا جس کے سیکریٹری ڈاکٹر عثمانی تھے۔ حکومت پاکستان کے ایجوکیشن ڈویژن میں ملک کے تعلیمی مسائل پر غور وخوض کے بعد کمیشن نے اپنی تجاویز مرتب کیں۔ ان تجاویز کو مرتب کرتے وقت اس بات کا پورا خیال رکھا گیا کہ اگر تعلیم کو قومی ترقی میں مؤثر کردار ادا کرنا ہے تو اس میں انقلابی تبدیلیاں لانی ہوں گی۔ رپورٹ کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں دلائل کے ساتھ تبدیلیوں کی ضرورت کا احساس دلایا گیا ہے۔ اور دوسرے حصے میں نئی تعلیمی پالیسی اور ایک تعلیمی منصوبہ پیش کیا گیا ہے۔ ان کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

پاکستان میں دو نظام تعلیم رائج ہیں۔ ایک[1] برطانوی طریقۂ تعلیم جس کا مقصد حکومت کے لئے ملازمین کی تیاری ہے۔ اور دوسرا[2] قدیم طریقۂ تعلیم جو اسلامی عہد حکومت کی ضرورتوں کی تکمیل کرنے کے لئے مسلمانوں نے مرتب کیا تھا اس صدی کی ابتدا ہی سے ان اداروں کی یہ کوشش رہی ہے کہ غیر ملکی اثرات سے اسلامی اقدار کی حفاظت کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مدرسوں میں مذہبی تعلیم پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے یہ مدرسے دور جدید میں پاکستان کی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔

اس لئے ضروری ہے کہ نظام تعلیم کو آج کی ضروریات کو مد نظر رکھ کر ترتیب دیا جائے
اس کے بعد کمیشن نے مروجہ تعلیم کے نقائص کی طرف توجہ دلائی ہے۔

مروجہ تعلیم کے نقائص

۱۔ تعلیم قوم میں اتفاق و اتحاد پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے۔
۲۔ تعلیم نے قومی ترقی میں مؤثر کردار ادا نہیں کیا۔
۳۔ تعلیم یافتہ لوگوں میں بے کاری پھیلی ہوئی ہے۔
۴۔ معیار تعلیم پست ہے اور بتدریج پست ہوتا جا رہا ہے۔
۵۔ مذہبی رکاوٹیں
۶۔ قومی زبان کا نہ ہونا۔
۷۔ تعلیم میں تحقیقی کام کا فقدان۔
۸۔ تعلیمی نظم و نسق کی خرابیاں۔
۹۔ تعلیمی اخراجات۔ کم اوزان کا مناسب استعمال نہیں ہونا۔

ان نقائص کی نشان دہی کرنے کے بعد کمیشن نے انھیں دور کرنے اور تعلیم کو بہتر اور مؤثر بنانے کے لئے اپنی تجاویز پیش کی ہیں:

نور خاں رپورٹ کی خاص خاص تجویزیں:

اسکول تعلیم

۱۔ اسکول کی تعلیم میں درجات ۱ تا ۱۰ شامل ہوں، درجات ۱ تا ۸ ابتدائی اسکول میں ہوں۔ ہائی اسکول میں نویں اور دسویں جماعتیں ہوں۔ ہر اسکول کی ایک انتظامیہ ہو جس کے ۳ سے ۵ تک رکن ہوں۔ جس میں اسکول کے دو اساتذہ شامل ہوں۔

۲۔ ہر ضلع میں اوسطاً ایک ہزار پرائمری اسکول ۷۵ مڈل اسکول اور

۷۵ ہائی اسکول ہوں۔ جن میں ۱۷۵,۰۰۰ طلبہ اور طالبات زیر تعلیم ہوں۔ ۱۹۸۰ء میں ایک اوسط درجہ کے ضلع میں ۲ ہزار ابتدائی اسکول اور ۱۰۰ ہائی اسکول ہوں۔ جن میں چار لاکھ بچے تعلیم حاصل کریں۔ اس حساب سے ۱۹۸۰ء میں مشرقی پاکستان میں ۷۵,۰۰۰ ابتدائی اسکول، اور مغربی پاکستان میں ۶۳,۰۰۰ ابتدائی اسکول ہوں جن میں ایک کرور چھپن لاکھ طلبہ و طالبات تعلیم حاصل کر رہے ہوں۔

فوجی تعلیم

۱۹۸۰ء تک لاکھوں معلمین کی ضرورت ہوگی۔ اس لئے طے کیا گیا ہے کہ تمام نوجوان لڑکے جنھوں نے میٹرک پاس کر لیا ہو۔ اور تمام ۱۸ سال سے ۲۲ سال تک کی لڑکیاں جنھوں نے میٹرک پاس کیا ہو۔ جبری طور سے قومی تعلیمی فوج میں بھرتی کرلئے جائیں گے۔ اور انھیں فوجی افسران کے ذریعہ ۳ ماہ تک فوجی تربیت دی جائے گی۔ اور پھر انھیں ۳ ماہ تک تعلیم دینے کی تربیت دی جائے گی۔ اس کے بعد انھیں یا تو دیہات میں ابتدائی اسکولوں میں یا خواندگی کے مراکز میں بھیج دیا جائے گا۔ جہاں انھیں ڈیڑھ سال رہنا ہوگا۔ اس عرصہ میں انھیں جیب خرچ، وردی، معمولی کھانا۔ جیسا کہ گاؤں کے لوگوں کو عموماً میسر ہوتا ہے۔ گاؤں میں رہائش کے دوران این۔ ایل۔ سی کے اراکین کو گاؤں کی زندگی سے وابستہ رہنا ہوگا۔ موجودہ اساتذہ کے تربیتی اداروں کے علاوہ آئندہ پانچ سال میں دو یا تین ادارے مزید کھل جائیں گے۔ جوان اساتذہ کو مختصر کورس کی تربیت دیں گے۔

دو سال کی لازمی سروس کے بعد این۔ ایل۔ سی کے ممبروں کو حق حاصل ہوگا کہ وہ ضروری امتحان پاس کرکے بی۔ ایڈ کی ڈگری حاصل کرلیں بہ شرطے کہ انھوں نے این۔ ایل۔ سی میں شامل ہونے سے پیشتر انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرلیا ہو۔ ان لوگوں کو بطور مستقل استاد کے پوری تنخواہ پر ملازمت پیش کی جائے گی۔ اور لازمی سروس کے دو سال بھی ترقی میں شمار کئے جائیں گے۔

کالج کی تعلیم

آج کل پاکستان میں ۵۰۰ کالج ہیں (۲۲۵ مشرقی پاکستان میں اور ۲۷۵ مغربی پاکستان میں) جن میں تقریباً تین لاکھ طلبہ اور طالبات زیر تعلیم ہیں۔ مشرقی پاکستان میں ٪ ۹۰ نجی کالج ہیں جب کہ مغربی پاکستان میں یہ تناسب ۵۰ : ۵۰ کا ہے گزشتہ دس سالوں میں کالجوں میں طلبہ کے اضافے کی رفتار ٪ ۱۵ سالانہ رہی ہے۔ لیکن آئندہ چونکہ پیشہ ورانہ اور ٹیکنیکل تعلیم پر زیادہ زور دیا جائے گا۔ اس لئے اضافہ میں کمی ہو جائے گی۔

آئندہ نئے کالج نہیں کھولنے دیئے جائیں گے اور کوشش کی جائے گی کہ موجودہ کالجوں کو ہی مستحکم کیا جائے ان کی عمارتوں میں توسیع کی جائے۔ بہتر ساز و سامان مہیا کیا جائے۔ ورکشاپ اور لیبارٹری قائم کی جائیں۔

۱۔ ہر کالج ایک انتظامیہ کے تحت آزاد ادارہ ہوگا۔ انتظامیہ میں ۹۔ اراکین ہوں گے۔

۲۔ جن نجی کالجوں کو ان کے اخراجات کا ٪ ۷۰ حکومت کو ادا کرنا پڑے گا انھیں قومیا لیا جائے گا۔

۳۔ ہر کالج میں اساتذہ کے صرف تین درجے ہوں گے۔ پروفیسر۔ اسسٹنٹ پروفیسر اور ایسوسی ایٹ پروفیسر۔

اعلیٰ تعلیم

پاکستان میں بارہ یونی ورسٹیاں ہیں۔ جن میں سات عام قسم کی۔ کراچی حیدر آباد۔ پشاور۔ لاہور۔ ڈھاکہ۔ راج شاہی اور چٹاگانگ میں واقع ہیں۔ لاہور اور ڈھاکہ میں دو انجنیئرنگ یونی ورسٹیاں ہیں۔ لائل پور اور میمن سنگھ میں زراعتی یونی ورسٹیاں ہیں۔ مرکزی یونی ورسٹی اسلام آباد میں صرف پوسٹ گریجویٹ کے لئے

ہے۔ ان میں طلبہ کی کل تعداد ۲۲ ہزار ہے۔ جن میں سترہ ہزار طلبہ عام یونی ورسٹیز میں اور دو ہزار پانچ سو زرعی یونی ورسٹیوں میں اور دو ہزار سات سو کے قریب انجنیئرنگ یونی ورسٹیوں میں ہیں۔ یونی ورسٹیوں میں ایک ہزار تین سو اساتذہ ہیں۔ جن میں اندازاً ایک تہائی پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں۔ بقیہ میں سے چوتھائی غیر ملکی ڈگریاں رکھتے ہیں۔

حکومت کو قانون کے ذریعہ یونی ورسٹیوں کی آزادی کو مان لینا چاہیئے۔ خاص طور سے مندرجہ ذیل امور میں:

(الف) مالی آزادی

(ب) انتظامی امور

(ج) انتظامیہ کو بہتر بنانے میں۔

بہت سے قدیم اور اچھے کالج ہیں۔ ان کو اختیار ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے نصاب کو خود تیار کریں اور ان کا امتحان بھی خود لیں۔ نیز ان کو ڈگریاں بھی دینے کی آزادی ہو۔

کوئٹہ۔ ملتان اور سرگودھا میں الحاقی یونی ورسٹیاں قائم کرنی چاہیئے اسی طرح مشرقی پاکستان میں ایک یونی ورسٹی کھلنا میں اور دو اور یونی ورسٹیاں وہاں ہونی چاہئیں۔ مقام کا تعین صوبائی حکومت خود کرے۔ میڈیکل کالجوں کو بھی یونی ورسٹیاں بنا دینا چاہیئے۔ لیکن لاہور میں جہاں دو میڈیکل کالج ہیں ان کو ایک ہی یونی ورسٹی میں مدغم کر دینا چاہیئے۔

ٹنڈو جام اور پشاور کے زراعتی کالجوں کو زراعتی یونی ورسٹیاں بنا دینا چاہیئے۔ اور مشرقی پاکستان میں شمالی اضلاع کے لئے ایک نئی زراعتی یونی ورسٹی قائم کرنی چاہیئے۔

کراچی ملک کا سب سے بڑا صنعتی مرکز ہے اس لئے وہاں صنعتوں کی اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ہے۔ این۔ ای۔ ڈی انجنیئرنگ کالج کو یونی ورسٹی بنا دینا چاہیئے۔ اسلام آباد کی یونی ورسٹی میں بھی گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ تعلیم کا انتظام ہونا چاہیئے اور مشرقی پاکستان میں بھی اسی طرز پر ایک یونی ورسٹی قائم ہونی چاہیئے۔

یونی ورسٹیوں کا انتظام

۱۔ ہر یونی ورسٹی میں ایک سینٹ ہو جس کے تقریباً سو رکن ہوں۔ جن میں سے نصف اساتذہ ہونے چاہئیں جن کا انتخاب بھی خود اساتذہ ہی کریں۔ پانچ طلبہ ہوں جن کا انتخاب طلبہ کریں۔ لیکن یہ ممبران صرف ان اجلاس میں ہی شرکت کے مجاز ہوں جن میں طلبہ کے مسائل زیر بحث آئیں گے۔ بقیہ رجسٹرڈ گریجویٹ اور حکومت کے نامزد ریسرچ کونسلوں کے نمائندہ ہوں گے۔

۲۔ گورنر کو چانسلر نہیں ہونا چاہیئے۔ چانسلر کا انتخاب یونی ورسٹی سینٹ کو تین سال کے لئے کرنا چاہیئے۔ تین سال کے بعد وہ شخص دوبارہ چانسلر نہیں ہو سکتا۔

۳۔ وائس چانسلر بھی تین سال کے لئے ہونا چاہیئے۔ وائس چانسلر کے لئے پروفیسروں اور ڈین میں سے ہی کسی کو منتخب کیا جائے۔

۴۔ سنڈیکیٹ میں ۱۵ اراکین ہونے چاہئیں جس میں وائس چانسلر بھی شامل ہو۔ فیکلٹی کے ڈین۔ اساتذہ کے ۸ نمائندے گورنمنٹ کے دو نامزد اراکین اور ڈگری کالجوں کے دو پرنسپل بھی ہوں۔

۵۔ اساتذہ۔ پروفیسر۔ ایسوسی ایٹ پروفیسر اور اسسٹنٹ پروفیسر کے نام سے موسوم کئے جائیں۔

۶۔ نیشنل پروفیسر شپ:

کچھ اساتذہ کو ان کی قابلیت اور تحقیق کی بنا پر نیشنل پروفیسر مقرر کیا جائے۔ اس اسکیم کا سارا صرفہ تعلیم اور سائنسی تحقیق کی وزارت کو برداشت کرنا ہوگا۔

حکومت پاکستان
کی

نئی تعلیمی پالیسی ۱۹۷۰ء

بنیادی اصولوں کا اجمالی خاکہ

۱۔ تعلیم ایک مسلسل اور متحرک عمل ہے جس میں ارتقا فطری ہے اس لئے ضروری ہے کہ وقتاً فوقتاً تعلیمی حکمت عملی کا جائزہ لیا جاتا رہے۔ ملک کی تعلیمی ضروریات ایسی ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ تعلیمی سہولتوں کی فراہمی سے تعلیم کو قومی ضروریات سے ہم آہنگ کرنا سب کے لئے یکساں تعلیم کے لئے فراہمی۔ گرتے ہوئے معیار کو بلند کرنا مختلف قسم کی تعلیم میں توازن پیدا کرنا۔ نہایت ضروری ہے۔

۳۔ قوم کے مفاد کا تقاضا ہے کہ ایک لچکدار پالیسی تیار کی جائے۔ کہ ملک کی تمام تعلیمی ضرورتوں کو پورا کیا جا سکے۔

۴۔ یحییٰ خاں کے زمانے کی اس رپورٹ میں مندرجہ ذیل اصلاحات پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے:

(الف) ملک کے اتحاد اور ترقی کے لئے اسلامی اقتدار کا تحفظ اور ان کو مقبول بنانے میں تعلیم کا حصہ۔

(ب) ملک کی اقتصادی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نظام تعلیم میں تبدیلی خاص طور پر سائنسی۔ ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ تعلیم پر زور۔

(ج) معاشرتی تبدیلیوں اور ترقی میں تعلیم کا کردار اور تعلیمی مساوات کے ذریعہ جمہوری معاشرہ کا قیام۔

(د) تعلیم میں معیار کی اصلاح۔ تعلیم کی اہمیت۔ اساتذہ کے کردار پر خاص توجہ۔

(ح) تعلیمی نظام کی مرکزیت کو ختم کرنا۔ تاکہ تعلیمی انتظام اور مالی آزادی حاصل ہو سکے جو تعلیمی اداروں کے ارتقاء بالخصوص اعلیٰ اداروں کی ترقی کے لئے ضروری ہے۔

۵۔ پالیسی کی نظریاتی بنیاد اسلامی اقدار۔ معاشرتی انصاف۔ مساوات اور جمہوریت پر رکھی گئی ہے۔

۶۔ تعلیم و تربیت ملک کی اقتصادی ترقی کے لئے ضروری ہے جب تک اس وسیع انسانی قوت کو کام میں نہیں لایا جاتا جو پاکستان میں موجود ہے یہاں کی ترقی ممکن نہیں ہے۔

۷۔ تعلیم کا عام کرنا اور سب کے لئے مساوی مواقع فراہم کرنا۔ بغیر اس کے جمہوری معاشرہ کا وجود ناممکن ہے۔

۸۔ تعلیم میں اعلیٰ معیار بے حد ضروری ہے۔ جس کے لئے اساتذہ کی تنخواہ اور حیثیت میں اضافہ بھی ضروری ہے۔

اساتذہ کی تنخواہ کا معیار وہی ہونا چاہیئے۔ جو دوسری ملازمتوں میں ہے۔

۹۔ طلبہ کے لئے بھی کچھ سہولتیں ضروری ہیں۔ مثلاً رہائش کا انتظام سستی کتابیں۔ آمد و رفت کا مناسب انتظام۔ غریب طلبہ کی امداد ان چیزوں کو بھی مستقبل کے منصوبے میں شامل کرنا ضروری ہے۔

۱۰۔ اس منصوبے میں صرف چند بنیادی اصول اور مرکزیت کو ختم کرنے کے کچھ اقدام تجویز کئے گئے ہیں تاکہ ضروری تعلیمی اور انتظامی آزادی مل سکے۔

ابتدائی تعلیم Elementry Education

۱۔ آٹھویں درجہ تک ہمہ گیر ابتدائی تعلیم کے منصوبے کو سب پر ترجیح دی جائے تاکہ ۱۹۸۰ء تک درجہ پنجم تک داخلے عام ہو جائیں۔

۲۔ پانچویں درجہ تک تعلیم مفت ہونی چاہیئے۔ صوبائی حکومتوں کو چاہیئے کہ جبری حاضری کے قواعد درجہ اوّل سے درجہ پنجم تک بتدریج رائج کریں۔

۳۔ لڑکیوں کی تعلیم کی ہمت افزائی کی جائے۔ ان کے لئے زیادہ سے زیادہ اسکول کھولے جائیں۔ اور ان میں استانیاں ملازم رکھی جائیں۔

۴۔ ابتدائی تعلیم کی اس طرح تنظیم نو کرنی چاہیئے۔ کہ جو بچے ثانوی اسکول میں داخلہ نہیں وہ مقامی طور پر آسانی سے برسر کار آسکیں۔

تعلیم بالغان Edult Education

۱۔ صوبوں میں ایسے اقدام کرنے چاہئیں۔ جن سے بالغوں اور اسکولوں سے نکلنے والے لڑکوں کو کام کی تعلیم مل سکے۔

۲۔ کارخانوں کے مالکوں کو چاہیئے کہ اپنے تمام ملازموں کو ایسی بنیادی تعلیم دیں جس سے ان کے کام میں بہتری ہو۔

۳۔ مناسب انتظام کرنے چاہئیں۔ جیسے کہ قومی تعلیمی فوج کا قیام وغیرہ تاکہ ابتدائی تعلیم کی تکمیل ہو سکے۔

۴۔ بالغوں کی تعلیم کے لئے غیر رسمی منصوبے تیار کئے جائیں تاکہ رسمی منصوبے کے کام میں مدد مل سکے۔

ثانوی تعلیم Secondary Education

۱۔ ثانوی تعلیم کے سلسلے میں عام تعلیم اور سائنسی ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ تعلیم

کی سہولتوں میں اتنا اضافہ کر دیا جائے کہ عام تعلیم اور سائنسی ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ تعلیم کا تناسب ۴۰ : ۶۰ کا ہو جائے۔

۲۔ سرکاری اور سرکاری امداد سے چلنے والے ادارے تمام لوگوں کے لئے قابلیت کی بنیاد پر کھلے ہونے چاہئیں۔

۳۔ وہ بچے جو ثانوی مدارس میں داخلہ نہیں لیتے یا دوران تعلیم گھر بیٹھ رہتے ہیں ان کی پیشہ ورانہ تربیت کے لئے مناسب منصوبہ بندی ہونی چاہئے۔ تاکہ وہ لوگ مقامی معاشرہ میں مناسب کام سے لگ سکیں۔

اعلیٰ تعلیم
Higher Education

۱۔ پوسٹ گریجویٹ تعلیم اور تحقیق کے کام میں ترقی کی جائے اور پی۔ایچ۔ڈی اور دوسرے تحقیقی کام شروع کئے جائیں۔ اس مقصد کے لئے یونیورسٹیوں کو چاہئے کہ چند منتخب مضامین میں اپنے یہاں مرکز فضیلت (Centres of Excellence) قائم کریں۔ لیکن باہمی تعاون کے ساتھ، تاکہ ایک ہی شعبہ مختلف جگہوں پر قائم کرکے وقت اور سرمایہ ضائع نہ ہو۔

۲۔ یہ بھی طے کیا گیا ہے کہ ایک قومی تحقیقی نظام (Research Fellowship) قائم کیا جائے، تحقیق کے لئے سرمایہ مہیا کیا جائے تاکہ محققین انفرادی طور پر یا جماعت میں رہ کر تحقیقی کام کریں۔ یہ بھی طے کیا گیا ہے کہ قومی پروفیسرشپ قائم کی جائے۔ ان دونوں مدوں میں سرمایہ مرکز فراہم کرے گا۔

۳۔ نصاب تعلیم کی تنظیم نو کی سخت ضرورت ہے۔ اس کو فوراً قومی ضرورتوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔

۴۔ زبان کے نئے جدید طریقہ ہائے تدریس کو اپنانے کی ضرورت ہے مرکزی حکومت کو جدید زبانوں کے دو ادارے قائم کرنے چاہئیں۔ جن میں ایک اسلام آباد یونیورسٹی میں اور دوسرا ڈھاکہ یونیورسٹی میں قائم کیا جائے۔

۵۔ نئی یونی ورسٹیوں کو قائم کرتے وقت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ ملک کے مختلف حصوں میں اعلیٰ تعلیم کے مواقع حاصل ہوسکیں۔

۶۔ تمام علاقوں میں اعلیٰ تعلیم مہیا کرنے کے لئے نئے کالج قائم کئے جائیں۔ ان میں سائنس کی تعلیم کو اولیت دینے کی ضرورت ہے۔

۷۔ یونی ورسٹیوں سے کالج کا الحاق جاری رہے۔ لیکن اچھے کالجوں کو اپنا نصاب مقرر کرنے۔ طلبہ کا امتحان لینے اور ڈگریاں دینے کی اجازت ہونی چاہیئے۔

۸۔ اساتذہ کی تنخواہوں اور شرائط ملازمت کو بہتر بنایا جائے۔ ان کو ایک سال کی چھٹی سات سال کی ملازمت کے بعد دینے کا طریقہ رائج کیا جائے تاکہ وہ اپنی قابلیت بڑھائیں۔

۹۔ یونی ورسٹی اساتذہ کی تنظیم اور کارگذاری کے قوانین پر نظر ثانی کی جائے۔ اور ان میں جو دفعات خراب ہیں ان کو نکال دینا چاہیئے۔

۱۰۔ صوبوں میں مناسب قوانین پاس کئے جائیں جس سے یونی ورسٹیوں میں سینٹ کو بحال کیا جائے، اور یونی ورسٹیوں کے دیگر اداروں میں انتخاب کا اصول رائج کیا جائے۔ ڈگریوں کی ضبطی کے قانون کی تنسیخ کی جائے اور یونی ورسٹیوں کو علوم کا مرکز بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔

سائنسی، فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم
Science, Technical & Professional Education

۱۔ ثانوی سطح سے ہی تعلیم میں ٹیکنیکل ایجوکیشن کو بھی شامل کردیا جائے اور جیسے جیسے تعلیم میں اضافہ ہو اس کو بتدریج بڑھایا جائے اس کو موجودہ اداروں میں بھی نصاب میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر ممکن ہو تو اس کے لئے علیحدہ ادارے بھی قائم کئے جاسکتے ہیں۔

۲۔ ایک مستحکم ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ منصوبے کے لئے نصاب تعلیم کی تشکیل، مشورے اور رہنمائی کی خدمت، صنعتوں کے تعاون سے عملی تربیت کے نظام

مرتب کئے جائیں۔

۳۔ تربیت یافتہ لوگوں کو ملازمت دلانے کے لئے ادارے Employment Exchange قائم کئے جانے چاہئیں۔

۴۔ ہر ضلع میں ایک سائنس کالج اور ہر تحصیل میں سائنس کا ثانوی مدرسہ بطور مرکز فضیلت (Centre of Excellence) قائم کرنے چاہئیں۔

۵۔ سائنسی آلات۔ انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن اور اسمال انڈسٹریز کارپوریشن کے تعاون سے تیار کئے جائیں۔

۶۔ صنعتوں کو بھی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ (Technical Institutes) قائم کرنے چاہئیں۔

مدرسہ کی تعلیم
Education in Madarssas

۱۔ مدرسوں کو اسلامی تعلیم کے مرکز ہونے کی وجہ سے، برقرار رکھتے ہوئے ان کے معیار کو بلند کیا جائے۔

۲۔ صوبوں میں کمیٹیاں تشکیل دی جائیں جو مدرسوں کی اصلاحات کے لئے اپنی سفارشات پیش کریں۔ تاکہ ان کا نصاب دوسرے اداروں کے مساوی ہو جائے اور ان کے اقتصادی حالات کو بہتر بنایا جائے۔

۳۔ کمیٹیاں اس مقصد کے لئے بھی قائم کی جائیں جو مشرقی پاکستان میں مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کو قانونی شکل دینے کی سفارشات پیش کریں اور مغربی پاکستان میں اس نظام کو رائج کرنے کے لئے کیا جائے۔

مذہبی تعلیم
Religious Education

۱۔ پاکستان مذہب کے نام پر وجود میں آیا ہے اس لئے عام تعلیمی نظام میں مذہبی تعلیم کو اہمیت دینی چاہیئے۔ اس کا نصاب تعلیم دوبارہ مرتب کیا

جائے تاکہ اس میں اسلامی تعلیمات اور قومی اتحاد کو بنیاد بنایا جائے۔ تعلیم سے جمہوری اقدار اور انصاف پسند معاشرہ قائم کیا جائے۔ اس کے لئے نصاب کمیٹیاں قائم کی جائیں جو مذہبی تعلیم کا نصاب تیار کریں۔ غیر مسلموں کو ان کے عقیدے کے مطابق تعلیم دی جائے۔

۲۔ یونی ورسٹیوں کے شعبۂ معارف اسلامیہ/اسلامک اسٹڈیز ڈیپارٹمنٹ کو ترقی دی جائے تاکہ اُس سے ایسے افراد پیدا ہو سکیں جو نہ صرف مذہب میں ماہر ہوں۔ بلکہ عہد جدید کے مسائل سے بھی عہدہ برآ ہو سکیں۔

نصاب تعلیم۔ درسی کتب اور امتحانات

Curriculum, Text Books and Examinations.

۱۔ نصابی کمیٹیاں تشکیل کی جائیں جو نصاب تعلیم کی تنظیم نو کریں۔ ہر صوبے میں ادارۂ ترقی نصاب (بیورو آف کری کولم ڈیولپمنٹ)، قائم کئے جائیں جو نصاب تعلیم کا مسلسل جائزہ لیتا رہے اور ان کو مربوط کرتا رہے۔

۲۔ جسمانی تربیت ہر سطح پر نصاب تعلیم کا جز ہونا چاہیئے۔

۳۔ وزارت تعلیم کو قومی سطح پر نصابی تشکیل اور ان پر عمل کرانے کی تمام کارروائیوں کو مربوط کرنا چاہیئے۔

۴۔ جن علاقوں میں جغرافیائی حالات اور آب و ہوا یکساں ہوں وہاں تعلیمی سال یکساں ہونے چاہئیں۔

۵۔ ایک مضمون پر ایک سے زیادہ درسی کتب کی ہمت افزائی کرنی چاہیئے۔ نجی پبلشرز کو درسی کتابیں چھاپنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔

۶۔ ایک کمیٹی بنائی جائے جو امتحانوں کے موجودہ طریقوں کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد اصلاحی تجاویز پیش کریں۔

۷۔ تعلیمی اداروں کے اندر اور باہر کتب خانوں اور عجائب گھر قائم کرنے کا ایک منصوبہ بنانا چاہیئے۔

۸۔ ہر ابتدائی اور ثانوی اسکول کے لئے لازم کردیا جائے کہ وہ کتب خانہ قائم کرے اور ایک مقررہ تعداد کتابوں کی اس میں رکھے۔

۹۔ تمام میونسپل اور ڈسٹرکٹ کونسلوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ عوام کے فائدے کے لئے لائبریری اور عجائب گھر قائم کریں۔

طلبہ کے لئے سہولتیں Facilities for Students

۱۔ طلبہ کو مقامی وظائف دیئے جائیں اور مشرقی و مغربی پاکستان کے وظیفوں کی تعداد چوتھے قومی ترقیاتی منصوبے میں بڑھادی جائے۔ اور فیس میں بھی رعایت دی جائے۔

۲۔ بینکوں کے ذریعے مالی امداد کا ایک پروگرام شروع کیا جائے۔ جس سے طلبہ کو قرض مل سکے۔

۳۔ تعلیمی ترقی کی نئی اسکیموں میں طلبہ کو رہائشوں کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

۴۔ تعلیمی اداروں میں کیفے ٹیریا طلبہ کو مناسب قیمتوں پر معیاری کھانے مہیا کریں۔

۵۔ ایک تدریجی منصوبے کے ذریعہ طلبہ کا طبی معائنہ ادارے کی جانب سے کرایا جائے۔

۶۔ ذرائع آمد و رفت کے نمائندوں کی ایک کمیٹی قائم کی جائے۔ جو طلبہ کے آمد و رفت کے مسائل حل کرے۔

۷۔ صوبائی حکومتوں کو رہنمائی اور مشورے کے لئے مؤثر اقدامات کرنے چاہئیں۔

۸۔ ہر قسم کی درسی کتب کے لئے مناسب انتظام کیا جائے۔

۹۔ جسمانی تعلیم اور کھیل کود کے منصوبوں کو مؤثر بنایا جائے۔ کھیل کے میدان میں ورزش گاہیں بھی مہیا کی جائیں۔

۱۰۔ حکومت ایسے تعلیمی اوقاف اور ادارے قائم کرے جو تعلیم کی ترقی میں معاون اور مددگار ثابت ہوں۔ مستحق طلبہ کی ہر ممکن مدد کی جائے۔

ذریعہ تعلیم کے متعلق پالیسی
Policy on Medium of Instructions

پاکستان کے عارضی آئین کے مطابق ۱۹۷۲ء میں ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا جو انگریزی زبان کی جگہ قومی زبان کو رائج کرنے پر غور کرے گا۔ اس کمیشن کو مقرر کر دینا چاہیئے تاکہ قومی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا مسئلہ طے کیا جا سکے۔

۲۔ اس عرصے میں ادب اور درسی کتابوں کی تیاری کا کام شروع کر دینا چاہیئے۔

تعلیم اساتذہ
Teacher's Education

۱۔ پرائمری۔ مڈل اور ثانوی مدارس کے اساتذہ کم سے کم بالترتیب ہائی اسکول انٹر اور بی۔ اے ہونے چاہئیں۔ اس کے علاوہ انھیں تعلیم دینے کی تربیت حاصل ہو۔

۲۔ اساتذہ کی تربیت کے اداروں کے علاوہ ہنگامی بنیاد پر مختصر کورس شروع کر دینے چاہئیں تعلیم کو بحیثیت اختیاری مضمون انٹر اور بی۔ اے میں شامل کر دینا چاہیئے۔

۳۔ مستورات کے لئے ان شرائط میں نرمی کر دینا چاہیئے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ استانیاں مل سکیں۔

۴۔ دوران ملازمت ایک جامع منصوبہ تیار کرنا چاہیئے۔ تاکہ اساتذہ کی قابلیت اور صلاحیت میں اضافہ ہوتا رہے۔

۵۔ تعلیم کے تحقیقی اداروں کو مؤثر بنایا جائے۔

نظم و نسق کی تنظیم نو
Re-organization of Administrative Set up.

۱۔ تعلیمی انتظام کو غیر محوری بنانے کے لئے صوبے خود مختار۔ ڈسٹرکٹ اتھارٹی

خودمختار علاقائی (Autonomous District Authority)
کالج اتھارٹی اور ایجوکیشن سروس بورڈ قائم کرنے پر غور کر سکتے ہیں۔
۲۔ ثانوی مدارس سے لے کر اعلیٰ تعلیمی اداروں تک انتظامیہ یا مشورہ دینے والی کونسل قائم کی جا سکتی ہے۔
۳۔ چند سرکاری کالجوں کی انتظامیہ کو تجربے کے طور پر پورے اختیارات کے ساتھ خودمختاری دی جا سکتی ہے۔
۴۔ تمام اداروں میں اساتذہ کی کونسلیں ہونی چاہئیں۔ جن کے چیرمین پرنسپل اور ہیڈ ماسٹر ہوں۔ یہ کونسلیں اداروں کی روزمرہ کے امور کی دیکھ بھال کریں۔
۵۔ اداروں کے سربراہ کو۔ بجٹ کے مطابق روپیہ صرف کرنے اور تقرر کرنے کے اختیارات ہونے چاہئیں۔
۶۔ ہر ادارے میں اساتذہ اور طلبہ کی کونسلیں ہونی چاہئیں جن میں اساتذہ اور طلبہ کی تعداد مساوی ہو۔ اور یہ کونسلیں طلبہ کے مفاد کی ذمہ دار ہوں۔
۷۔ تمام نجی اداروں کو قومی نظام میں شامل کرنے کے لئے ان کی انتظامیہ حکومت کے قوانین کے مطابق بنائی جائے اور وہ ہر معاملے میں سرکاری قواعد کی پابند ہوں۔
۸۔ ایک قومی کونسل برائے تعلیم بنائی جائے جو وقتاً فوقتاً تعلیمی منصوبوں کا جائزہ لے اور آئندہ کے لئے مشورہ بھی دے۔
۹۔ صوبائی حکومت کو یہ طے کرنا چاہیئے۔ کہ کسی سرکاری اسکول یا کالج کے لئے انتظامیہ ہو یا مشورہ کونسل۔

مالیات Expenditure

نئی تعلیمی پالیسی پر چوتھے قومی ترقیاتی منصوبے کے عرصے میں عمل کرنے

کے لئے ۸۔ ارب ۹۲ کروڑ روپیہ کی ضرورت ہوگی۔ جس میں موجودہ سالانہ اخراجات بھی شامل ہیں۔ موجودہ سالانہ اخراجات ۵۔ ارب ۵۲ کروڑ پر مشتمل ہیں۔ اضافی رقم جو ان اصلاحات پر خرچ کی جائے گی۔ وہ پانچ سال میں ۳۔ ارب۔ ۴۰ کروڑ روپے ہوگی۔

نئی تعلیمی پالیسی ۱۹۷۰ء میں جو تجاویز پیش کی گئی تھیں، ان پر ابھی عمل درآمد شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ ملک اپنی تاریخ کے الم ناک دور میں داخل ہوگیا۔ حکمرانوں اور سیاست دانوں کی باہمی چپقلش نے ملک کو دو نیم کردیا، ہمارا ایک اہم صوبہ ہم سے کٹ گیا اور ہم ایک نئی صورت حال سے دوچار ہوئے۔ نئے پاکستان کی از سر نو تعمیر و ترقی کا خیال پیدا ہوا اور ۱۹۷۲ء میں ایک نئی تعلیمی پالیسی کا اعلان ہوا۔ جس پر ہم آئندہ صفحات میں مختصراً روشنی ڈالیں گے۔

تعلیمی پالیسی ۱۹۷۲-۸۰ء

EDUCATION POLICY 1972-80

۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو برسر اقتدار آنے والی حکومت نے ۱۹۷۲ء میں پاکستان کی تعلیمی پالیسی کا اعلان کیا جس میں بہت سے انقلابی اقدامات تجویز کئے گئے۔ مثلاً دسویں جماعت تک فیس معاف کر دی گئی۔ تمام نجی اسکولوں اور کالجوں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا وغیرہ۔ اس تعلیمی پالیسی پر سیر حاصل بحث کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے ہم اس کی خاص خاص باتوں کو ہی قلم بند کر رہے ہیں۔

مقاصد

۱۔ پاکستان کے بنیادی نظریہ کا تحفظ۔ ترقی اور اس پر عمل اور اس کو قومی زندگی کے مطابق بنانا۔

۲۔ تعلیم کی مدد سے نظریۂ پاکستان کی بنیاد پر معاشرتی۔ اور تہذیبی ہم آہنگی کا فروغ اور اس کے ذریعہ قومی اتحاد کا استحکام۔

۳۔ تعلیم کا جامع منصوبہ پیش کرنا جس میں عام تعلیم کو ٹیکنیکل تعلیم سے مربوط کرنا۔ اور جس میں ایک سے دوسرے میں جانے کی اجازت ہو۔

۴۔ ابتدائی تعلیم کو ہمہ گیر بنانا اور تعلیم بالغان کے منصوبوں سے جہالت کا جلد از جلد خاتمہ کرنا۔

۵۔ فرد کی مکمل شخصیت کا ارتقا جس سے وہ ایک باعمل تخلیقی صلاحیتوں کا مالک اور حقیقت شناس ہو جائے۔ اس میں اس بات کی اہلیت ہو کہ معاشرتی

اور ٹیکنیکل تبدیلی کی فطرت کو سمجھ سکے اور معاشرہ کے ارتقا میں دلچسپی لے سکے۔

۶۔ جوانوں کو معاشرتی خدمت کے منصوبوں۔ ماحول کی اصلاح اور جسمانی محنت کی تنظیم کی رہنمائی کے لئے تیار کرنا۔

۷۔ عورتوں۔ غریبوں۔ دماغی طور پر کمزور۔ جسمانی طور پر مجبور بچوں اور بالغوں کے لئے ہر جگہ بالخصوص پسماندہ علاقوں میں مخصوص سہولتیں بہم پہنچا کر تعلیم کے یکساں مواقع فراہم کرنا۔

۸۔ ایک ایسا نصاب تیار کرنا جو ہمارے بنیادی نظریہ کے مطابق اور قوم کی تغیر پذیر اقتصادی ضروریات سے ہم آہنگ ہو اور جس میں عام تعلیم کی بجائے بامقصد زراعتی اور ٹیکنیکل تعلیم پر زور دیا گیا ہو۔

۹۔ اساتذہ طلبہ۔ والدین اور معاشرے کے نمائندوں کو تعلیمی معاملات میں شریک کرنا۔ اساتذہ اور طلبہ کی فلاح کے کام کرنا ان میں احساس ذمہ داری پیدا کرنا۔

۱۰۔ تعلیمی اداروں کو آزادی اور مناسب خود مختاری مہیا کرنا۔ جو قومی ضروریات اور مقاصد کے مطابق ہو۔

مفت اور لازمی تعلیم
Free and Compulsory Education

۱۔ دسویں جماعت تک تعلیم مفت اور لازمی کردی جائے گی۔ لیکن چونکہ ذرائع محدود ہیں۔ اس لئے اس کی تکمیل دو مرحلوں میں ہوگی۔ پہلے مرحلے میں یکم اکتوبر ۱۹۷۲ء سے آٹھویں جماعت تک تمام لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے تمام سرکاری اور غیر سرکاری اسکولوں میں تعلیم مفت کردی جائے گی۔ غیر سرکاری اسکولوں کو مناسب مالی امداد دی جائے گی تاکہ وہ نقصان سے نبٹ سکیں۔ دوسرے مرحلے میں یکم اکتوبر ۱۹۷۴ء

سے نویں۔ دسویں جماعتوں میں بھی تمام اسکولوں میں تعلیم مفت کردی جائے گی۔

۲۔ اگر عوام کی طرف سے اس کا ردِ عمل اچھا ہوا تو پانچویں جماعت تک تعلیم لڑکوں میں ۱۹۷۹ء تک اور لڑکیوں میں ۱۹۸۴ء تک عام ہوجائے گی اور مزید تین سالوں میں آٹھویں تک تعلیم عام ہوجائے گی۔ یعنی لڑکوں میں ۱۹۸۲ء اور لڑکیوں میں ۱۹۸۷ء تک۔

۳۔ تعلیم کو کس سطح تک اور کس طرح لازمی کیا جائے یہ بہت سنجیدہ مسئلے ہیں۔ جبر سے والدین کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اسکول بھیجیں ورنہ سزا ملے گی۔ ساتھ ہی ساتھ حکومت پر بھی تعلیم کے انتظام و انصرام کی ذمہ داری عائد ہوجاتی ہے۔ ملک کے معاشرتی اور اقتصادی حالات پر اس کا گہرا اثر پڑے گا۔ اس لئے یہ معاملہ مجلس قانون ساز کے لئے چھوڑا جاتا ہے۔

ابتدائی تعلیم (۱ تا ۸ جماعتیں) Elementary Education

یکم اکتوبر ۱۹۷۲ء سے بشمول آٹھویں جماعت تک پورے پاکستان میں سرکاری اور غیر سرکاری سب اسکولوں میں مفت تعلیم کردی جائے گی۔ اس طرح ۱۹۸۰ء تک ابتدائی جماعتوں یعنی پہلی تا پانچویں میں طلبہ کی تعداد میں پچاس لاکھ کا اضافہ ہوجائے گا۔ اور موجودہ تعداد چھیالیس لاکھ سے بڑھ کر چھیانوے لاکھ ہوجائے گی۔

مڈل اسکولوں میں آج کل طلبہ کی تعداد تیس لاکھ ہے۔ اس میں دس لاکھ کا اضافہ ہوجائے گا۔ اور اس طرح ۱۹۸۰ء تک مڈل اسکولوں یعنی جماعت ششم سے ہشتم تک میں طلبہ کی کل تعداد تینتیس ۳۳ لاکھ ہوجائے گی اور ان کا ہم عمروں سے میں تناسب پچپن فی صد ہوجائے گا۔

عمارتیں

طلبہ کے اضافے کو مدِنظر رکھتے ہوئے اڑتیس ۳۸ ہزار نئے کمرے بنائے جائیں گے۔
اسی طرح مڈل اسکولوں کے اضافے کے لئے تیئس ۲۳ ہزار نئے کمرے بنائے جائیں گے جن ابتدائی اسکولوں میں ترقی کی گنجائش ہوگی انھیں ابتدائی اسکول بنا دیا جائے گا۔ عمارتوں کے معاملے میں کفایت سے کام لیا جائے گا۔ اور تعلیمی سہولت میں اوّلیت غیر شہری علاقوں کو دی جائے گی۔ اور پھر لڑکیوں کی تعلیم کو دی جائے گی۔

اساتذہ

تعلیم کے عام کر دینے سے ابتدائی تعلیم میں ۲ لاکھ ۲۵ ہزار اساتذہ ضرورت پڑے گی۔ موجودہ تربیتی ادارے ۱۹۸۰ء تک ۷۵۰۰۰ اساتذہ تیار کریں گے۔ اتنے ہی اساتذہ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی جماعتوں میں تعلیم کا مضمون پڑھا کر سے تیار ہو جائیں گے۔ بقیہ ۷۵۰۰۰ اساتذہ ایک قومی تعلیمی فوج میں مندرجہ طبقات سے بھرتی کئے جائیں گے۔

۱۔ مقامی طور پر حاصل ہونے والے بے کار افراد۔
۲۔ ریٹائرڈ سول اور فوجی ملازمین۔
۳۔ یونی ورسٹی اور کالج کے طلبہ بذریعہ نیشنل سروس کور

پرائمری اسکولوں میں استانیوں کی تعداد بڑھائی جائے گی۔ خواہ اس کے لئے بعض علاقوں میں تقرری کے معیار میں کچھ کمی ہی کرنی پڑے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا۔ کہ پرائمری اسکولوں میں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ استانیوں سے تعلیم حاصل کر سکیں گے۔

درسی کتب اور تدریسی اعانات
Text Books and Teaching Aids

۱۔ پرائمری اداروں کے طلبہ کو تدریجی پروگرام کے تحت درسی کتابیں اور لکھنے کا سامان مفت دیا جائے گا۔

۲۔ مناسب تعداد میں کتب خانوں کے لئے کتابیں اور تعلیمی کھلونے اور دیگر سمعی و بصری امدادی اشیار تمام اسکولوں کو مہیا کی جائیں گی۔ اس کے علاوہ ریڈیو اور ٹیلی وژن بھی تمام اداروں کو دیئے جائیں گے۔

۳۔ نصاب تعلیم اور درسی کتابوں پر نظر ثانی کی جائے گی۔ تاکہ بچوں کا بوجھ کم ہو سکے۔ تصورات شعور اور سلیقہ پر زور دیا جائے گا اور مشاہدہ۔ تجربہ عمل اور تخلیقی کام کی اہمیت کو بھی واضح کیا جائے گا۔

جسمانی محنت کی عظمت
Dignity of Labour

۱۔ اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ ابتدائی مدارس کے بچوں میں ایسی عادتیں اور طرز فکر پیدا ہو جس سے انھیں معاشرہ کی خدمت کے لئے جسمانی محنت اور مزدوری کی تحریص ہو۔ اس کے لئے طلبہ کو مختلف دستوں میں منظم کیا جائے گا۔ جو اپنے اساتذہ کی نگرانی میں کام کریں گے۔

۲۔ جسمانی محنت کی عظمت پر زور دیا جائے گا۔ اور اسکولوں کی تعلیم کو انفرادی اور معاشرتی ضرورت کے مطابق ڈھالا جائے گا۔ رفتہ رفتہ تمام مڈل اسکولوں میں ورکشاپ قائم کئے جائیں گے۔ جہاں بچے پارچہ بافی۔ جلد سازی۔ لکڑی کا کام۔ لوہار کا کام اور چمڑے کا کام سیکھیں گے۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کی اشیار کو محفوظ رکھنے کے طریقے۔ بچوں کی نگہداشت خانہ داری وغیرہ اشغال بھی سکھائے جائیں گے۔ جو مقامی صنعتی اور زراعتی ماحول کے مطابق ہوں گے۔

۲- ابتدائی تعلیم کے بعد جو بچے ثانوی تعلیم حاصل نہیں کرنا چاہیں گے وہ اپنے پیر پر کھڑے ہو سکیں گے۔ آٹھویں جماعت کے بعد تعلیم چھوڑ دینے والے بچوں کو ان کی پسند کے پیشے میں ورکشاپ کی تربیت دے کر ان کو معاشرہ میں کارآمد فرد بنایا جاسکے گا۔

۳- پورے ملک میں ریڈیو۔ ٹیلی وژن اور پریس کے ذریعہ والدین میں یہ شوق پیدا کیا جائے گا۔ کہ وہ اپنے بچوں کو اسکول بھیجیں۔

ثانوی اور انٹرمیڈیٹ تعلیم Secondary & Intermediate Education

۱- اکتوبر ۷۲ء سے نویں اور دسویں جماعتوں کی تعلیم مفت کر دی جائے گی۔

۲- اس وقت پاکستان کے ثانوی اور درمیانی عمر کے طلبہ کی طرف آٹھ فی صد تعداد اسکولوں اور انٹرمیڈیٹ کالجوں میں زیر تعلیم ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرے ممالک کا حال مندرجہ ذیل گوشوارے سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔

(i)	امریکہ	۱۰۰ %	(v)	مصر	۳۰ %
(ii)	جاپان	۸۶ %	(vi)	ترکی	۲۴ %
(iii)	انگلستان	۷۲ %	(vii)	ایران	۲۱ %
(iv)	روس	٦۷ %	(viii)	بھارت	۱۵ %

۳- ثانوی اور انٹرمیڈیٹ سطحوں پر طلبہ کے اضافے کی شرح ۱۰ فی صد سالانہ ہے ۱۹۸۰ء تک امید کی جاتی ہے کہ طلبہ کی تعداد دگنی سے بھی زیادہ ہو جائے گی۔ یعنی نویں اور دسویں میں ۴ لاکھ سے بڑھ کر ۸ لاکھ پچاس ہزار ہو جائے گی۔ اور انٹرمیڈیٹ میں ایک لاکھ ساٹھ ہزار سے بڑھ کر تین لاکھ ساٹھ ہزار ہو جائے گی۔ منصوبے کے مطابق ان چاروں جماعتوں میں طلبہ کی تعداد کو ۱۹۸۰ء تک بارہ لاکھ ہو جانا چاہیئے۔

۴- ترقی کے ساتھ ساتھ تعلیم کو ہماری اقتصادی ترقی کے مطابق اور اس سے

ہم آہنگ بنایا جائے گا۔

۵۔ اسکول چھوڑنے کے بعد طالب علم معاشری ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار رہے۔ اور ملک کے معاشری اور اقتصادی ڈھانچے میں بطور ایک تربیت یافتہ اوسط درجے کے کاریگر یا کارکن کے شامل ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے ثانوی اور درمیانی نصاب تعلیم میں پیشہ ورانہ مضامین شامل کئے جا رہے ہیں۔

سائنس اور ٹیکنالوجی Science & Technalogy

سائنسی اور ٹیکنیکل ایجوکیشن کے اضافے کے نتیجے میں اسکولوں اور کالجوں میں یہ عام تعلیم کے قریب آجائیں گی پہلے ٹیکنیکل ایجوکیشن کے لئے علیحدہ اسکول ہوتے تھے۔ جن میں معاشری اور تہذیبی تعلیم نہیں دی جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے ان اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے وہی لڑکے آتے تھے جو عام اسکولوں سے نکلے ہوئے ہوتے تھے۔ ان اسکولوں کو نظر حقارت سے دیکھا جاتا تھا۔ نئے منصوبے میں عام تعلیم اور ٹیکنیکل تعلیم کو بتدریج ایک دوسرے سے مربوط کر دیا گیا ہے۔

اس وقت طلبہ کی ۶۰ سے ۷۰ فی صد تعداد آرٹ کے مضامین لیتی ہے آئندہ اس میں تبدیلی کی جائے گی۔ ۱۹۸۰ء تک فنون (آرٹ) (۲) سائنس اور ٹیکنیکل (۳) پیشہ ورانہ تعلیم میں برابر طلبہ ہو جائیں گے۔ ٹیکنیکل مضامین میں اس وقت طلبہ کی تعداد ۵ فی صد ہے جو بڑھ کر ۳۳ فی صد ہو جائے گی۔ اسی طرح سائنسی علوم میں ۲۳ فی صد سے بڑھ کر ۳۰ فی صد ہو جائے گی۔

ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطحوں پر سائنس کی تعلیم کے لئے بالترتیب ۲۲۰۰ اور ۷۰۰ نئے ادارے قائم کئے جائیں گے۔ ہر ایک میں دو جماعتیں اور ایک تجربہ گاہ ہوگی۔ ۱۹۸۰ء تک سائنس کی تعلیم کے لئے جو جگہیں ہوں گی وہ میٹرک اور

انٹرمیڈیٹ ... بالترتیب ۱۷۵۰۰۰ اور ۶۵۰۰۰ ہوں گی۔

فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کے لئے ثانوی اور درمیانی سطحوں پر ۳۵۰ اور ۱۶۰۰ ادارے قائم کئے جائیں گے۔ ہر ادارے میں دو کمرے اور ایک ورکشاپ ہوگی۔ ہر جماعت میں ۴۰ طلبہ ہوں گے۔ اس طرح پورے منصوبے کے دوران چار لاکھ آٹھ ہزار نئی جگہیں ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ تعلیم کے لئے پیدا ہو جائیں گی۔

جن پیشوں میں تعلیم دی جائے گی، ان میں سے چند یہ ہیں :

الیکٹرانکس ، آٹو الیکٹرسٹی ، پلمنگ ، گھریلو استعمال کی بجلی کی چیزیں ، ڈیری فارمنگ ، پولٹری فارمنگ ، ویجیٹیبل فارمنگ ریشم کے کیڑوں کی پرورش ، فصل اور جانوروں کی پیدائش ، شارٹ ہینڈ ٹائپ رائٹنگ ، بیمہ اور جائیداد کی دلالی ، جہازوں سے مال چھڑانا ، اور روانہ کرنا ، انتظام خانہ داری ۔ کھانا پکانا ، فرسٹ ایڈ ، ہوم نرسنگ کھلونے کا سامان تیار کرنا وغیرہ وغیرہ

میٹرک ۔ انٹر اور بی۔ اے کے نصابوں میں "تعلیم" کو بطور ایک مضمون شامل کیا جائے گا۔ اور ان جماعتوں میں سائنس کا ایک مربوط اور اعلیٰ نصاب کورس میں شامل کیا جائے گا۔ تاکہ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں پیشہ ورانہ تعلیم کے اداروں میں انھیں زیادہ مضامین کے انتخاب کرنے کا موقع مل سکے۔

اساتذہ

Teachers

منصوبہ کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لئے تربیت یافتہ اساتذہ کی ضرورت ہوگی۔ فوری طور پر سائنس اور ٹیکنیکل اساتذہ کی تربیت کے لئے ملازمت میں رہتے ہوئے تربیت حاصل کرنے کے پروگرام گرمیوں کی تعطیل میں شروع کئے جائیں گے اور جیسے جیسے ان طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوگا جو ٹیکنیکل اور تعلیم کے مضامین بحیثیت اختیاری پڑھیں گے تو باقاعدہ تربیت یافتہ اساتذہ ملنے لگیں گے ۔ ۱۹۸۰ء تک ہمیں اُنیس ہزار اساتذہ کی ضرورت ہوگی ۔

مخصوص تعلیم

جسمانی طور پر معذور طلبہ کے لئے ایک کمیٹی قائم کی جائے گی جو ان طلبہ کی تعلیم اور دیگر ضروریات کے لئے مناسب اقدامات کرے گی۔

اعلیٰ تعلیم

Higer Education

اعلیٰ تعلیم کے ادارے قومی ترقی میں فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔ اس میں اس وقت صرف دو فی صد لوگ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ جبکہ امریکہ میں پچاس فی صد، جاپان میں پچیس فی صد، پاکستان میں ایک لاکھ میں سے صرف ۱۷۵ طلبہ یہاں تک پہنچتے ہیں۔ جب کہ امریکہ میں تین ہزار سات سو، کناڈا میں دو ہزار چار سو، روس میں ایک ہزار نو سو، مصر میں چھ سو اور بھارت میں دو سو سترہ اس لئے ۱۹۸۰ء تک مزید ایک لاکھ طلبہ کی اعلیٰ تعلیم کے نظام کی وجہ سے اس عمر کے طلبہ کی تین فی صد تعداد اعلیٰ تعلیم تک پہنچ جائے گی۔

آج کل اسی فی صد طلبہ آرٹس کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ آئندہ صرف ۵۰ فی صد طلبہ کو آرٹس میں داخلے کی اجازت ہوگی۔ سائنس میں موجودہ تعداد سے دس فی صد زیادہ طلبہ سالانہ داخل کئے جائیں گے۔ کامرس اور ہوم اکنامکس میں بالترتیب موجودہ تعداد کے ساتھ ۱۰ اور ۵۰ فی صد طلبہ اور طالبات ہر سال زیادہ لئے جائیں گے۔

ملتان۔ سید و شریف اور سکھر میں نئی یونی ورسٹیاں قائم کی جائیں گی۔ جامعہ اسلامیہ بہاول پور کو مکمل یونی ورسٹی بنا دیا جائے گا۔ زراعتی کالج ٹنڈو جام این۔ای۔ڈی انجینیرنگ کالج کراچی۔ انجینیرنگ کالج جام شورو کو یونی ورسٹیاں بنا دیا جائے گا۔ صوبہ سرحد کی حکومت اگر چاہے تو پشاور انجینیرنگ کالج اور پشاور زراعتی کالج کو بھی یونی ورسٹی بنا سکتی ہے۔ بلوچستان یونی ورسٹی کے ساتھ

ایک میڈیکل کالج بھی کھولا جائے گا۔ اسلام آباد یونی ورسٹی میں انڈر گریجویٹ کلاس کھولے جائیں گے۔

اسلام آباد یونی ورسٹی اور P.I.N.S.T.E.C.H میں بھی رابطہ قائم کیا جائے۔ تاکہ اسلام آباد یونی ورسٹی کے طلبہ Pakistan Institute of Nuclear Technology سے فائدہ اٹھا سکیں۔

حکومت ایک یونی گرانٹس کمیشن قائم کرے گی۔ پاکستان کا انٹر یونی ورسٹی بورڈ بطور یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کی ابتدائی شکل کے کام کرے گا۔

یونی ورسٹی آرڈی نینس

اس بدنام زمانہ آرڈی نینس کو ایک اعلیٰ قانون سے بدل دیا جائے گا جو جمہوری ہو گا۔ اور اساتذہ۔ طلبہ اور والدین کو یونی ورسٹی کے معاملات میں حصہ لینے کی سہولت بہم پہنچائے گا۔

پیشہ ورانہ کونسلیں

پاکستان میڈیکل کونسل کی طرز پر زراعت۔ قانون اور انجینیرنگ کی پیشہ ورانہ کونسلیں قائم کی جائیں گی۔ جو ان پیشوں میں تعلیم کا معیار مقرر کریں گی اور ایک دوسرے میں یکسانیت بھی پیدا کریں گی۔

مراکز فضیلت

مختلف مضامین میں مہارت حاصل کرنے کے لئے ہمیں اپنے طلبہ کو بیرونِ ملک بھیجنا پڑتا ہے۔ لیکن اخراجات کی زیادتی کی وجہ سے یہ بہت محدود پیمانے پر ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی اقتصادی ترقی کے لئے بھی ہمیں بہت سے ماہرین کی ضرورت ہے۔ اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے یونی ورسٹی

میں فضیلت کے مراکز قائم کئے جائیں گے۔ مالی طور پر ان مراکز کا بار مرکزی حکومت برداشت کرے گی۔ جن میں پورے ملک سے ذہین طلبہ قابلیت کی بنیاد پر لئے جائیں گے۔ مختلف مراکز کن مضامین میں ماہر پیدا کریں گے۔ اس کا فیصلہ یونی ورسٹی گرانٹ کمیشن یونی ورسٹیوں سے مشورے کے بعد کرے گا۔ ان مضامین میں کیمسٹری۔ طبیعیات اور ریاضیات کے مختلف موضوعات تیل اور گیس۔ زمین کی سائنس۔ شوریت۔ پانی کا زمین میں حد سے زیادہ جذب ہو جانا۔ آب پاشی۔ نکاس آب۔ ماہی گیری۔ کھاد۔ کیڑے مکوڑوں کے خاتمہ کی دوائیں اور استوائی فن تعمیر وغیرہ شامل ہیں۔

مختلف معاشروں بالخصوص ان معاشروں کا جن سے ہمارے مفاد پر اثر پڑتا ہے۔ مطالعہ بہت ضروری ہے۔ اس لئے یونی ورسٹیوں میں علاقائی مطالعہ کے مراکز اور موجودہ معاشروں کے مطالعہ کے مراکز قائم کئے جائیں گے مختلف یونی ورسٹیوں کو علاقوں کی تقسیم یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن یونی ورسٹیوں سے مشورے کے بعد کرے گا۔ اسلام آباد یونی ورسٹی کے ادارہ لسانیات (Institute of languages) میں آج کل جو کام ہو رہا ہے وہ تمام یونی ورسٹیوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

پاکستان کے مختلف علاقے ایک دوسرے کی زبان اور ادب سے ناواقف ہیں۔ قومی اتحاد کے لئے ضروری ہے کہ ایک علاقے کے لوگ دوسرے علاقوں کے لوگوں کی زبان۔ ادب۔ معاشری حالات۔ رسوم۔ رجحانات۔ جذبات اور امنگوں سے واقف ہوں۔ اس لئے ہر عمومی یونی ورسٹی کے لئے ضروری ہے کہ وہ انڈر گریجویٹ کی سطح پر دوسرے علاقوں کی زبان۔ ادب اور تہذیب و تمدنی مطالعہ کا بندوبست کرے۔ تحقیق اور پوسٹ گریجویٹ مطالعے کے لئے ایک نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پاکستان اسٹڈیز اسلام آباد یونی ورسٹی میں کھولا جائے۔

فنی تعلیم Technical Education

پالی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ ٹیکنیکل کالج بنا دیئے جائیں گے۔ ان میں موجودہ سرٹیفیکٹ اور ڈپلوما کورس بھی جاری رہیں گے۔ تین سالہ ڈپلوما کورس کے بعد طلبہ کی ہمت افزائی کی جائے گی۔ کہ وہ دو سال تک عملی تجربہ اور تربیت حاصل کریں۔ ڈپلوما ہولڈرس ایک سال کا کورس پورا کرکے 'بی۔ ٹیک' کی ڈگری لے سکتے ہیں۔ ٹیکنیکل کالجوں میں مضامین سے متعلق بہت سے نئے موضوعات نصاب میں شامل کئے جائیں گے۔ ان کالجوں میں سے کچھ کالج میں ماسٹر آف ٹیکنالوجی کی ڈگریاں بھی دی جائیں گی۔

فی الحال ڈگری کالجوں میں ساٹھ فی صد طلبہ آرٹس کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ڈگری سطح پر بتدریج عام تعلیم۔ ٹیکنیکل تعلیم اور سائنسی تعلیم کو ایک دوسرے سے مربوط کر دیا جائے گا۔ اور ۱۹۸۰ء تک ڈگری کلاسوں میں تقریباً چالیس فی صد داخلے ٹیکنیکل اور دوسرے پیشہ ورانہ مضامین میں ہوں گے اور تیس فی صد داخلے سائنس میں ہوں گے۔

نیشنل پروفیسرشپ National Professorship

آج کل محکمہ تعلیم میں سب سے زیادہ تنخواہیں انتظامی لوگوں کو ملتی ہیں۔ اس لئے اساتذہ تعلیم کے کام کو چھوڑ کر انتظامی عہدوں پر جانے کے متمنی رہتے ہیں اس لئے نیشنل پروفیسرشپ کا ایک منصوبہ شروع کیا جائے گا تاکہ قابل لوگ بحیثیت اساتذہ ہی کام کرنا پسند کریں۔

نیشنل ریسرچ فیلوشپ (قومی ادارہ تحقیق)

ریسرچ کے کام میں مدد دینے والوں کا کوئی ادارہ نہیں ہے۔ اس لئے نیشنل ریسرچ فیلوشپ (National Research Fellowship) قائم کی

جائے گی۔ اور یونی ورسٹیوں اور دوسرے اداروں کو مالی امداد دی جائے گی۔ تاکہ وہ نمایاں قابلیت رکھنے والے اساتذہ کے لئے آسانیاں بہم پہنچائیں۔ تحقیق کے ساتھ ساتھ فیلو اپنی یونی ورسٹی میں تحقیق کا کام بھی کر سکتا ہے۔

نجی تعلیمی ادارے Private Institutions

۱۔ یکم ستمبر ۱۹۷۲ء سے تمام نجی کالج قومیائے جائیں گے۔ نجی اسکولوں کو سرکاری تحویل میں لینے کا کام یکم اکتوبر ۱۹۷۲ء سے شروع ہو کر دو سال میں پورا ہوگا

۲۔ نجی اداروں کے مالکوں کو کسی قسم کا کوئی معاوضہ نہیں دیا جائے گا۔

۳۔ یکم اکتوبر ۱۹۷۲ء سے تمام نجی اسکولوں اور کالجوں میں انھیں قوانین اور تنخواہوں کی شرحوں کا نفاذ کر دیا جائے گا۔ جو سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں رائج ہیں۔

۴۔ مرکزی حکومت آرڈی نینس کے ذریعہ جس اسکول یا کالج کو چاہے مذکورہ بالا قوانین سے مستثنیٰ قرار دے سکتی ہے۔

ذہین طلبہ کے لئے اسکول

۱۔ پبلک اسکول اور ایچیسن کالج لاہور جیسے ادارے جو حکومت کے خرچ پر چلتے ہیں۔ انھیں عام ذہین طلبہ کے اداروں میں تبدیل کر دیا جائے گا۔

۲۔ ان اسکولوں میں آئندہ ملک کے تمام ذہین طلبہ کو مفت تعلیم دی جائے گی

۳۔ موجودہ کیڈٹ کالجوں اور سینٹ ہیلنیو اسکولوں کو بھی ذہین طلبہ کے اسکول بنا دیا جائے گا۔ لڑکیوں کے لئے بھی ایسے ہی ادارے قائم کئے جائیں گے۔

تعلیم بالغان Adult Education

۱۔ پاکستان میں قریباً چار کروڑ افراد جاہل ہیں اور ان میں ہر سال تقریباً دس لاکھ کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

۲۔ اس جہالت کو ختم کرنے کے لئے جگہ جگہ مرکز خواندگی (Literacy Centres) قائم کئے جائیں گے۔ اور اس طرح ۱۹۸۰ء تک دو لاکھ چہتر ہزار مراکز خواندگی قائم کر دیئے جائیں گے۔

۳۔ علم و ہنر میں دن رات اضافہ ہو رہا ہے۔ اس لئے کارکنوں کی تعلیم و تربیت کو جاری رکھنا ضروری ہے اس لئے ایسے انتظامات کئے جائیں کہ لوگ زیادہ سے زیادہ ہنرمند ہو سکیں۔

۴۔ ابتداء میں مزدوروں کو اس قسم کی تعلیم فیکٹریوں میں اور کسانوں کو دیہات سدھار کے مرکزوں میں دی جائے گی مختلف قسم کے ادارے جو ۱۹۸۰ء تک کھولے جائیں گے وہ اس طرح ہوں گے۔

قسم ادارہ	تعداد ادارے	اسکول میں طلبہ کی گنجائش
فیکٹری اسکول	۵۰۰	۴۰
فارم اسکول	۳,۵۰۰	۴۰
عورتوں کے مخصوص تعلیمی مرکز	۵,۰۰۰	۴۰
اسکول کے باہر نوجوانوں کے مراکز	۳۰۰	۴۰

کھلی عوامی یونی ورسٹی Peoples open University

بہت سے ملکوں میں اس قسم کی یونی ورسٹیاں قائم ہیں جن کا مقصد ان لوگوں کو تعلیم و تربیت کے مواقع بہم پہنچانا ہے جو اپنے کام اور گھر بار چھوڑ کر کسی یونی ورسٹی میں داخلہ نہیں لیتے۔ ملک میں ایک عوامی کھلی یونی ورسٹی قائم کی جائے گی جو خطوط کے ذریعہ۔ حلقوں میں تعلیمی اجتماعات۔ ورکشاپ۔ لیبارٹری۔ ٹیلی وژن اور ریڈیو وغیرہ کے ذریعہ سے لوگوں کو تعلیم دے گی۔ شروع میں یہ یونی ورسٹی ابتدائی اسکول۔ قومی تعلیمی فوج کے اراکین اور اساتذہ کو تربیت دے گی۔ اور دیہات سدھار اور معاشرہ کی بہتری کے کاموں میں بھی حصہ لے گی۔

اساتذہ اور اُن کی تربیت Teachers and Their Training

۱۔ اس وقت پاکستان میں ایک لاکھ ساٹھ ہزار اساتذہ ہیں۔ آئندہ دو لاکھ پینتیس ہزار ثانوی اور ابتدائی سطح کے اساتذہ کی ضرورت ہوگی۔ اور دو لاکھ اساتذہ کی تعلیم بالغاں اور مزید تعلیم کے لئے ضرورت ہوگی۔

۲۔ پاکستان میں ۱۲ ٹریننگ کالجز اور ۵۵ ٹریننگ اسکول ہیں جن میں آئندہ آٹھ سال میں ۱۰۴۰۰۰ اساتذہ ابتدائی اور ثانوی اسکولوں کے لئے تیار ہوں گے۔ ہائی اسکول اور کالجوں کے نصاب میں تعلیم کو بطور ایک مضمون شامل کر کے بھی بہت سے اساتذہ تیار کئے جائیں گے۔

۳۔ ابتدائی اسکولوں کے لئے خاص طور پر اور عام طور پر مڈل اور ثانوی اسکولوں کے لئے استانیوں کی کافی ضرورت ہوگی۔ اس لئے ان کی شرائط میں نرمی کی جائے۔

۴۔ ہمارے ابتدائی اسکولوں میں تیس فی صد استانیاں ہیں۔ جب کہ روس میں ستر فی صد اور امریکہ میں پچھتر فی صد ہیں۔ اس لئے ضرورت یہ ہے کہ ہم کو بھی ہر سال ابتدائی اسکولوں سے مردوں کو ہٹا کر مستورات کو ان کی جگہ رکھنا چاہیئے۔

اساتذہ کی تنخواہیں Pay of Teachers

۱۔ تمام اساتذہ کی تنخواہیں سرکاری اداروں کے اساتذہ کے برابر ہوں گی۔

۲۔ نجی اداروں کے اساتذہ کو موقع دیا جائے گا کہ وہ ایک خاص مدت میں اپنی قابلیت بڑھا کر معیار کے مطابق لائیں۔

۳۔ اساتذہ کو ملک کے اندر بمعہ تنخواہ چھٹی دی جائے گی تاکہ وہ مزید تعلیم حاصل کر سکیں۔

۴۔ اساتذہ کے تقرر کے لئے ہر ضلع میں ڈسٹرکٹ ایجوکیشن کونسلوں کے مشوروں

سے تقرر کیا جائے گا۔

۷۔ ہیڈ ماسٹروں اور پرنسپل صاحبان کا تقرر پبلک سروس کمیشن سے ہوگا۔

طلبہ کے فلاح کے کام Students Welfare

قابلیت کی بنا پر دیئے جانے والے منصوبوں میں تبدیلیاں کی جائیں گی تاکہ زیادہ سے زیادہ طلبہ کو فائدہ پہنچ سکے۔ ۷۲-۱۹۷۱ء میں دو کروڑ روپیہ وظیفے کے لئے رکھا گیا تھا۔ ۸۰-۱۹۷۹ء میں یہ رقم بڑھا کر آٹھ کروڑ تک پہنچ جائے گی طلبہ کو قرضوں کی سہولت بھی دی جائے گی۔ اور طلبہ جب کمانے لگیں گے تو اقساط میں قرضہ ادا کریں گے۔ یونیورسٹی اور کالجوں میں کتابوں کے بینک قائم کئے جائیں گے جہاں سے طلبہ کو درسی کتابیں ملا کریں گی۔ اس کے علاوہ طلبہ کو کم کرایہ پر آمدورفت کی سہولتیں بھی بہم پہنچائی جائیں گی۔

نصابِ تعلیم کا قومی ادارہ

ہر سطح کے نصاب تعلیم پر مستقل نظر رکھی جائے گی تاکہ ضرورت کے مطابق ان میں مناسب اصلاح کی جاسکے اس مقصد کی تکمیل کے لئے نیشنل کیوریکولم بیورو قائم کیا جائے گا۔

اساتذہ کے تربیتی نظام میں مناسب تبدیلیاں کی جائیں گی۔ دورانِ ملازمت تربیت کی آسانیاں فراہم کی جائیں گی۔ اور اس طرح لاتعداد اساتذہ تیار ہو جائیں گے۔

کتابوں کی تیاری کا قومی ادارہ

۱۔ تعلیم کی توسیع سے کتابوں کی ضرورت بھی بڑھ جائے گی۔ اس مسئلہ سے نبٹنے کے لئے حکومت ایک قومی ادارہ قائم کرے گی جو کتابوں

کی تصنیف و تالیف۔ ترجمہ اور طباعت کا ذمہ دار ہوگا۔

۲۔ پاکستان پرنٹنگ کارپوریشن جو آج کل وزارت تعلیم کے تحت ہے اس کو نیشنل بک فاؤنڈیشن کی بنیاد بنادیا جائے گا۔

۳۔ تعلیمی اداروں میں کتب خانوں کی بہت کمی ہے۔ ہر اسکول اور کالج میں اچھی لائبریریاں قائم کی جائیں گی۔ ہر لائبریری کمیٹی طلبہ اور اساتذہ کے نمائندوں پر مشتمل ہوگی۔

۴۔ پورے ملک میں پبلک کے کتب خانوں کا جال بچھادیا جائے گا۔ اس طرح پچاس ہزار کتب خانے دیہاتوں اور شہروں کے محلوں میں قائم کئے جائیں گے۔ جہاں عوام کی پسند اور ان کے لئے فائدہ مند کتابیں رکھی جائیں گی۔

جسمانی تعلیم اور کھیل کود

۱۔ جسمانی تعلیم کے اساتذہ کی تنخواہیں اور شرائط ملازمت بھی وہی ہوں گی جو دوسرے اساتذہ کی ہیں۔

۲۔ ابتدائی تعلیم میں جسمانی تعلیم کو جزو نصاب بنایا جائے گا۔ کھیل کے میدان اسکول اور کالجوں سے ملحق کردیئے جائیں گے۔ خواتین کے لئے مخصوص مراکز قائم کئے جائیں گے۔

۳۔ ایک نیشنل اسپورٹس کا ادارہ قائم کیا جائے گا۔ جو کھیل وغیرہ کو خود کفیل بنانے کی کوشش کرے گا۔

نیشنل سروس کور فوجی تربیت

۱۔ ایک نیشنل سروس کور قائم کی جائے گی۔ سترہ اور تیئس سال کی عمر کے تمام نوجوانوں کو اس میں شامل کیا جائے گا۔ یہ خدمت انٹرمیڈیٹ امتحان

پاس کرنے کے بعد ایک سال کے لئے ہوگی۔ نوجوانوں کو اس میں شامل ہونے کے لئے انھیں:

(i)۔ ماہانہ الاؤنس (ii) یونی فارم الاؤنس

(iii) اعلیٰ درس گاہوں میں داخلے اور ملازمت پر اولیت کی سہولتیں دی جائیں گی۔

۲۔ سروس کا زمانہ ملازمت کی عمر کی اس حد میں شمار نہیں کیا جائے گا جو ملازمت وغیرہ کے لئے مانگی جاتی ہے۔ یہ خدمت ایک ہی وقت میں یا گرمیوں کی تعطیلات اور دوسرے فارغ اوقات میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے لئے بھی انجام دی جا سکتی ہے۔

۳۔ نیشنل سروس کور ملک کے تعلیمی نظام کا ایک جزو ہوگئی۔

۴۔ نیشنل سروس کور ابتدائی اور بالغوں کی تعلیم کے لئے قومی تعلیمی فوج میں افراد بھیج کر ملک کی عظیم خدمت کرے گی۔

۵۔ فوجی تعلیم نویں اور بارہویں جماعتوں کے طلبہ میں تیزی سے رائج کی جائے گی۔

۶۔ سترہ ۱۷ سے تئیس ۲۳ سال کی عمر کے موزوں طلبہ کے لئے ایک سال کے لئے ہمہ وقتی تربیت کا انتظام کیا جائے گا۔

۷۔ مسلمان طلبہ کے لئے دسویں تک اسلامیات کی تعلیم لازمی ہوگی۔ اس بات کے بھی انتظامات کئے جائیں گے کہ تمام سطحوں کے نصاب تعلیم اور درسی کتب میں کسی قسم کی خلاف اسلام بات نہ رہنے پائے اس کی بھی کوشش کی جائے گی کہ اسلامیات کی تعلیم سب سے علیحدہ کوئی چیز بن کر نہ رہ جائے۔ بلکہ اسلامیات کی روح تمام نظام تعلیم میں رچ بس جائے۔

امتحانات

Examinations

۱۔ امتحانات کا موجودہ نظام بڑی حد تک ہمارے نظام تعلیم کی سب سے بڑی خرابی ہے۔ آئندہ نویں درجہ تک سالانہ امتحان نہیں ہوں گے۔ اس کی

بجائے جماعت کے ذمہ دار اساتذہ ان کی ترقی۔ رجحانات اور مسئلوں کا مستقل جائزہ لیتے رہیں گے۔ ابتدائی جماعتوں میں سالانہ ترقی خود بخود ملتی رہے گی۔ لیکن اس کے بعد نویں جماعت تک ترقی کا انحصار میقاتی اور سالانہ امتحانات اور طالب علم کے روزانہ کے کام کا مسلسل اور باضابطہ جائزہ اس کا عام چال چلن اور اس کے طبعی میلان پر ہوگا۔ اس مقصد کے لئے ہر اسکول ہر طالب علم کی مجموعی کارکردگی کا ایک گوشوارہ مرتب کرے گا۔ المختصر کسی اسکول میں نویں جماعت تک نہ تو کوئی طالب علم فیل ہوگا۔ نہ ہی اس کو اس جماعت میں دوبارہ رہنا پڑے گا۔

۲۔ دسویں جماعت سے بارہویں جماعت تک ثانوی اور اعلیٰ ثانوی بورڈوں کے امتحانات جاری رہیں گے۔ لیکن ہر ممکن کوشش کی جائے گی کہ ان خرابیوں کو دور کیا جائے۔ جن میں طلبہ۔ والدین۔ اساتذہ۔ ممتحن حضرات اور بورڈ کے ملازمین عام طور پر ملوث رہتے ہیں۔

۳۔ میقاتی امتحانات کے سرٹیفکیٹ میں آئندہ ہر کامیاب طالب علم کے حاصل کردہ نمبروں کی فی صد بھی دی جائے گی۔

۴۔ آئندہ راول پنڈی۔ بھاول پور۔ گوجرانوالہ۔ خیرپور۔ سیدو شریف میں بھی ثانوی اور اعلیٰ ثانوی بورڈ قائم کئے جائیں گے۔

تعلیمی پالیسی اور نظم ونسق

۱۔ تعلیمی پالیسی کا مسلسل جائزہ لیا جاتا رہے گا۔ اور اس کو بہتر سے بہتر بنایا جائے گا۔

۲۔ وزارت تعلیم اور صوبائی محکمہ تعلیم تحقیقی کمیٹیاں مقرر کرے گا۔ جو اپنی اپنی ایجوکیشنل کونسلوں کے تعاون سے کام کریں گے۔

۳۔ تعلیمی پالیسی مرتب کرنے اور اس کا جائزہ لینے کے لئے قومی۔ صوبائی ضلعی

اور ادارے کی سطح پر ایجوکیشنل کونسلیں مقرر کی جائیں گی جو قومی اور صوبائی اسمبلی کے ممبروں۔ مقامی جمہوری اداروں کے نمائندوں مختلف خیالات کے شہریوں۔ اساتذہ۔ طلبہ اور حکومت کے متعلقہ محکموں کے نمائندوں پر مشتمل ہوگی۔

مالیات Finance.

آج کل حکومت تقریباً ستر کروڑ روپیہ سالانہ تعلیم پر خرچ کر رہی ہے جس میں بیس کروڑ روپیہ تعمیرات وغیرہ پر اور پچاس کروڑ سالانہ مستقل خرچ ہے۔ جو ہماری قومی آمدنی کا دو فی صد کے برابر ہے۔ دنیا میں کسی ملک میں بھی تعلیم پر اس سے کم خرچ نہیں ہوتا۔ دوسرے چند ممالک کی مثال درج ذیل ہے۔

یورپ	۷٫۶ %	کناڈا	۸٫۳ %
روس	۷٫۳ %	جاپان	۶٫۰ %
		مصر	۵٫۰ %

اس ضمن میں یونسکو کی سفارش ہے کہ ترقی پذیر ممالک اپنی قومی آمدنی کا ۴ % تعلیم پر خرچ کریں۔

مندرجہ بالا تعلیمی اصلاحات پر عمل کے لئے تعلیمی اخراجات میں ۷۰ فی صد اضافہ کرنا پڑے گا۔ اس لئے ۷۳-۱۹۷۲ء میں کل خرچ ایک ارب بیس کروڑ روپیہ ہوگا۔ جس میں سرمایہ کا خرچ ۲۰ کروڑ سے ۴۰ کروڑ ہو جائے گا۔ سالانہ خرچ ۵۰ کروڑ سے ۸۰ کروڑ ہو جائے گا۔ آئندہ سالوں میں اس خرچ میں ۱۰ % سالانہ کے حساب سے اضافہ ہوتا رہے گا۔ یہ وہی شرح ہے۔ جس پر ماضی میں تعلیمی خرچ بڑھتا رہا ہے ۱۹۸۰ء تک تعلیم پر کل خرچ کل قومی آمدنی کا ۴ % فی صد ہو جائے گا۔ جو یونسکو کی سفارش کے عین مطابق ہوگا۔

قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۷۸ء

NATIONAL EDUCATION POLICY —1978

۵ر جولائی ۱۹۷۷ء کو جب پاکستان میں نئی حکومت قائم ہوئی تو جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے تعلیمی کانفرنس بلانے کا حکم دیا، تاکہ ملک میں تعلیمی حالت کا جائزہ لیا جائے۔ اور ایسی تجاویز پیش کی جائیں جن کی روشنی میں تعلیم کو اپنے عقیدہ اور نصب العین سے ہم آہنگ کیا جا سکے۔ اس حکم کے مطابق اکتوبر ۱۹۷۷ء میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ملک کے ممتاز دانش وروں، ماہرین تعلیم، صحافی، وکلاء، وائس چانسلرز ممتاز شہریوں اور طلبہ نے شرکت کی۔ اس کانفرنس کی تجاویز کا وزارت تعلیم حکومت پاکستان نے بہ نظر غائر جائزہ لیا۔ اس نے صوبائی حکومتوں اور یونیورسٹیوں سے بھی رابطہ قائم کیا۔ اس کے علاوہ ملک کے ذرائع ابلاغ، عوام اور تعلیمی و تحقیقی اداروں کی طرف سے جو تجاویز موصول ہوئیں ان پر بھی غور کیا گیا۔ ان سب کی بنیاد پر قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۷۸ء کو ترتیب دیا گیا۔

پاکستان میں ابتدا ہی سے تعلیم کو بہتر بنانے کی طرف توجہ دی گئی، جس کا اندازہ اس کتاب میں ذکر کردہ مختلف تعلیمی پالیسیوں کے مطالعہ سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ موجودہ ترقی کے دور میں جب کہ ہر شعبۂ زندگی میں بڑی تیزی کے ساتھ تبدیلیاں آ رہی ہیں کسی بھی تعلیمی پالیسی کو مکمل اور حرف آخر نہیں کہا جا سکتا تعلیم ایک مسلسل اور زندہ عمل کا نام ہے؛ اس لئے اس پر مسلسل توجہ دینے، تنقیدی جائزہ لینے اور اسے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ترقی دینے کی ضرورت ہے۔ اس لئے قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۷۸ء کی ابتداء میں ہی اس کا احساس کیا گیا اور یہ کہا

گیا کہ اس پر مسلسل نظر رکھی جائے گی اور مناسب ترمیم و اصلاح کی جاتی رہے گی تاکہ ہم بدلتے ہوئے حالات میں اپنے تعلیمی نظام سے پوری طرح استفادہ کر سکیں۔

مقاصد تعلیم
Aims of Education

قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۷۹ء میں تعلیم کے مقاصد کا تعین اس طرح کیا گیا ہے:

(۱) پاکستانی عوام، خصوصاً طلبہ، کے دل و دماغ میں اسلام سے گہری وفاداری کا جذبہ پیدا کرنا اور ان میں مسلم قومیت کے احساس کو فروغ دینا تاکہ ملک کے مختلف صوبوں میں رہنے والے عوام کے نقطۂ نظر میں یکسانیت و اتحاد کا جذبہ پیدا ہو۔

(۲) ہر طالب علم کو اس امر سے واقف کرنا کہ وہ پاکستانی قوم کا ایک فرد ہونے کے علاوہ عالمی امت مسلمہ کا ایک رکن ہے اور اس طور پر اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کی صلاح و فلاح کے کاموں میں حصہ لے اور اسلام کا پیغام ساری دنیا میں پھیلائے۔

(۳) قرآن اور سنت کے مطابق ایسے کردار، عادات و اطوار اور تحریک کو ترقی دی جائے، جن کی ایک سچے مسلمان سے توقع کی جاتی ہے اور گفتار و عمل میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے، اسے مؤثر طور پر ختم کیا جائے۔

(۴) مؤثر تربیت کے ذریعہ ہر فرد کی فطری صلاحیتوں کی پوری طرح نشوونما کی جائے تاکہ وہ اپنی تخلیقی اور اختراعی قوتوں کو بروئے کار لا سکے۔

(۵) ملک کے تمام شہریوں، خصوصاً نوجوانوں کو بلا تفریق مذہب و ملت، کم سے کم قابل قبول بنیادی اور عملی تعلیم بہم پہنچائی جائے تاکہ وہ مجموعی قومی کوششوں میں حصہ لینے کے قابل ہو سکیں۔

(۶) نوجوانوں میں تعلیم سے محبت، دلچسپی اور نظم و ضبط پیدا کیا جائے اور اس بات کا یقین کیا جائے کہ ہر طالب علم کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ تعلیم ایک مسلسل اور تاحیات عمل کا نام ہے۔

(۷) ملک میں سائنسی اور فنیاتی (Technological) تعلیم اور تحقیق کو فروغ دینا اور اس کا چرچا کرنا اور ان معلومات کو سماجی و معاشی ترقی کے لئے استعمال کرنا اور اس کے ذریعہ قومی خود کفالت اور محفوظ مستقبل کی یقین دہانی حاصل کرنا۔

ابتدائی تعلیم Primary Education

قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۷۸ء میں موجودہ ابتدائی تعلیم کے بارے میں عدم اطمینان کا اظہار کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ ہماری قومی ضروریات کے مطابق نہیں ہے۔ ابتدائی مدارس میں داخلہ کی عمر کے صرف ۵۳ فی صد طلبا ان مدارس میں داخلہ لیتے ہیں۔ اس کی متعدد وجوہ ہیں جن میں آبادی میں تیز رفتار اضافہ، ذرائع کی کمی اسکول کی عمارت اور تعلیمی سہولتوں کی ناکافی فراہمی، اساتذہ کی کمی، نصاب کی خامیاں وغیرہ شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پرائمری سطح پر تعلیم کو اب تک عام نہیں کیا جا سکا۔

اس لئے پالیسی میں کہا گیا کہ ایسے انتظامات کئے جائیں گے کہ ۸۳-۱۹۸۲ء تک چھوٹی عمر کے تمام بچوں کا پہلی جماعت میں داخلہ ممکن ہو جائے اس طرح ۸۷-۱۹۸۶ء تک تمام لڑکے پرائمری تعلیم مکمل کر سکیں گے اور لڑکیاں ۱۹۹۲ء تک ــــ اس ہدف کو پورا کرنے کے لئے اگلے پانچ سال میں تیس ہزار اسکول، خاص طور پر دیہی علاقوں میں، کھولے جائیں گے۔ اساتذہ، خاص طور پر خواتین اساتذہ، کے لئے دیہی علاقوں میں رہائشی یونٹس تعمیر کی جائیں گی۔ پرائمری تعلیم کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ اس کے لئے تدریسی اعانات قبل ملازمت اور دوران ملازمت اساتذہ کی تربیت اور جسمانی سہولتوں کو بہتر بنانے کی ضرورت ہوگی۔ تعلیم کو عام کرنے کے لئے بڑی تعداد میں غیر رسمی ذرائع بھی استعمال کئے جائیں گے۔ اس سمت میں ایک اہم اقدام تقریباً پانچ ہزار مساجد کے مدارس کا قیام ہوگا۔

مساجد کے مدارس
Mosque Schools

مسلم معاشرہ میں مساجد کو بڑی اہمیت حاصل ہے، پالیسی میں ان سے بہتر طور پر استفادہ کرنے کی طرف توجہ دی گئی ہے اور کہا گیا ہے مسجدوں کو بچوں اسکول میں نہ جانے والے جوانوں اور بالغوں کے لئے تعلیمی مراکز کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔ یہاں بچوں کو اسلامیات کے روایتی نصاب کے ساتھ ساتھ پرائمری اسکول کا جدید نصاب بھی پڑھایا جائے گا۔ روزانہ کے تعلیمی اوقات نسبتہً مختصر ہوں گے، گرمیوں کی چھٹیاں نہیں ہوں گی، اس لئے نصاب سال کے آخر تک مکمل ہو سکے گا۔ مساجد کے مدارس میں جانے والے بچوں کو مفت کتابیں اور تدریسی اعانتیں بہم پہنچائی جائیں گی۔ ابتداً تقریباً پانچ ہزار مساجد کے مدارس قائم کئے جائیں گے۔

محلہ اسکول
Mohallah Schools

ہماری آبادیوں میں لکھی پڑھی پردہ نشین خواتین محلے کے بچوں کو قرآن مجید، اسلامیات، امور خانہ داری، کشیدہ کاری وغیرہ کی تعلیم دیتی ہیں۔ قومی پالیسی میں تعلیم کے اس انتظام کو تسلیم کیا گیا ہے اور اسے مضبوط بنانے پر توجہ دی گئی ہے۔ اگلے پانچ سال کے عرصہ میں اس طرح کے پانچ ہزار اسکول کھولے جائیں گے۔ ان میں تعلیم دینے والی خواتین کو باقاعدہ تنخواہ دی جائے گی۔ کتابیں اور تدریسی اعانات مفت بہم پہنچائی جائیں گی۔

ان سکولوں میں امور خانہ داری کے ساتھ ساتھ ابتدائی تعلیم بھی دی جائے گی تاکہ یہاں سے پڑھ کر نکلنے والی لڑکیاں آگے تعلیم جاری رکھ سکیں۔ یہاں تعلیم دینے والی بڑی عمر کی خواتین کی رسمی تعلیم اور مہارتی تربیت کے لئے بھی مناسب پروگرام مرتب کیا جائے گا۔

اس سے دیہی علاقوں میں لڑکیوں کو تعلیم دینے میں آسانی ہوگی اور تعلیم نسواں میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔

دیہاتی ورک شاپ اسکول Village Workshop Schools

پرائمری اسکول کی تعلیم نامکمل کئے بغیر ترک تعلیم کرنے والے بچوں اور مسجد اسکولوں اور عام اسکولوں میں پرائمری سطح تک تعلیم پانے والے بچوں کو معاشرے کا کارآمد فرد بنانے اور ان میں مفید مہارت پیدا کرنے کی غرض سے ایک خاص پروگرام کے تحت "دیہی ورک شاپ اسکولے" قائم کئے جائیں گے۔ شروع میں ایسے ایک ہزار اسکولوں کا قیام عمل میں آئے گا۔ ان میں خصوصی تربیت یافتہ اساتذہ مقرر کئے جائیں گے۔ بچوں کو تربیت دینے کے لئے مقامی دستکاروں کی مدد بھی حاصل کی جائے گی۔ تربیت کی معیاد ایک سال ہوگی۔ ان اسکولوں سے دیہات کی معاشی حالت کو بہتر بنانے میں مدد ملے گی اور دیہات کے عوام کو اضافی آمدنی ہوگی۔ ان اسکولوں سے تربیت پاکر نکلنے والے افراد پیشہ ورانہ اداروں میں داخلہ کے اہل ہوں گے۔

تعلیم نسواں Education of the Female

اسلام میں علم حاصل کرنا مرد و عورت دونوں پر یکساں طور پر فرض ہے، ہماری آبادی کا 50 فی صد عورتوں پر مشتمل ہے، اس لئے تعلیم نسواں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ پرائمری سطح پر تعلیم نسواں کو تیزی کے ساتھ وسعت دی جائے گی۔ اس منزل پر طالبات کے داخلہ میں ہر سال ۱۰ فی صد اضافہ کیا جائے گا۔ جب کہ طلبہ کے داخلہ میں اضافہ 7 فی صد ہوگا۔ اگلے پانچ سال میں تقریباً تیس ہزار خواتین اساتذہ کا تقرر کیا جائے گا۔ اس ہدف تک پہنچنے کے لئے انٹرمیڈیٹ گرلس کالجوں میں "ایجوکیشن" کے مضمون پر خاص توجہ دی جائے گی۔

ثانوی سطح پر طالبات کے داخلہ میں اگلے پانچ سال کے عرصہ میں چار لاکھ سے ساڑھے چھ لاکھ تک اضافہ کیا جائے گا۔ سائنس اور ہوم اکنامکس کی تدریس پر خصوصی توجہ دی جائے گی۔ تعلیم کی تمام منازل پر خواتین کو وظائف اور تعلیمی قرض دیئے

جائیں گے۔ خواتین اساتذہ کے لئے چھ ہزار رہائشی مکانات، خاص کر دیہی علاقوں میں تعمیر کئے جائیں گے۔

خواتین کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ملک کے چیدہ کالجوں میں پوسٹ گریجویٹ کلاسیں کھولی جائیں گی ان میں ہوم اکنامکس پر خاص توجہ دی جائے گی۔

تعلیم بالغان اور غیر رسمی تعلیم Adult & Non-formal Education

پاکستان میں شرح خواندگی بہت کم ہے، اس میں اضافہ کرنا ضروری ہے۔ اس غرض کے لئے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ تعلیمی پروگرام شروع کرے گی۔ وہ خصوصی کتابچے، پڑھنے کے سازوسامان اور دیہی علاقوں میں متحرک یونٹ کے قیام کے ذریعہ تعلیم کا انتظام کرے گی۔ اس میں بالغوں کی تعلیم پر خاص توجہ دی جائے گی۔ اساتذہ کا تقرر مقامی آبادی سے کیا جائے گا۔ علاقے کی خصوصی ضروریات سے متعلق پیشوں اور مہارتوں کی تربیت دی جائے گی۔ مسجد کے مدارس میں ناظرہ قرآن مجید پڑھنے کی تعلیم دی جائے گی۔ محلہ اسکولوں میں معمر خواتین دوسری خواتین کو قرآن مجید اور ہوم اکنامکس کی تعلیم دیں گی۔ "نیشنل کونسل برائے تعلیم بالغان" اس تعلیمی نظام کی نگراں ہوگی۔

معذوروں کی تعلیم Education of the Handicaped

ایک اندازے کے مطابق ہمارے ملک میں معذور افراد کی تعداد مجموعی آبادی کا 4 فی صد ہے، ان کی تعلیم پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ افراد گداگری وغیرہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی میں اس طرح کے افراد کی تعلیم کے لئے ایک National Co-ordianating Committee اور مندرجہ ذیل چار بڑی خرابیوں کے لئے ماہرین کی کمیٹی بنائی جائے گی:

(ا) جسمانی طور پر معذور افراد (ب) بہرے اور گونگے

(ج) ذہنی طور پر پسماندہ (د) اندھے

وفاقی حکومت چار "رہنما مظاہراتی منصوبے" کو ترقی دے گی۔ ملک کے خصوصی تعلیم کے موجودہ اداروں کو مالی اور دوسری امداد فراہم کی جائے گی۔ ان اسکولوں میں طلبہ کو خصوصی مہارت کی تربیت دی جائے گی تاکہ وہ نفع بخش روزگار حاصل کر سکیں۔ نیز معذوروں کے لئے ایک مؤثر آبادکاری کا پروگرام بھی تیار کیا جائے گا۔

شہریوں کی تعلیم Education of the Citizens

اس نظام کے تحت ایسے پروگرام بنائے جائیں گے جو قیام پاکستان اور اسلام کی پرعظمت تاریخ کی عکاسی کرتے ہوں۔ اس کے لئے ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات قومی مراکز، سینما، پوسٹر اور مساجد کے منبر سے کام لیا جائے گا۔ اس کے ذریعہ پاکستان کے عوام کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے جدید فوائد سے روشناس بھی کیا جائے گا۔ تمام سینما ہاؤس میں گاہے بگاہے مختصر تعلیمی فلمیں بھی دکھائی جائیں گی۔ عوام کے دروازوں تک جدید معلومات پہنچانے کے لئے متحرک یونٹ Mobile Units بھی قائم کئے جائیں گے۔

ثانوی تعلیم Secondary Education

موجودہ تعلیمی ڈھانچہ میں ثانوی تعلیم ایک طرف تو طلبہ کی اکثریت کی تعلیم کا آخری مرحلہ اور دوسری طرف اعلیٰ اور پیشہ ورانہ تعلیم کا فیصلہ کرنے کا اہم مرحلہ ہے تعلیم کے موجودہ چار عناصر یعنی (۱) پرائمری (۲) سیکنڈری (۳) کالج اور (۴) یونی ورسٹی کو تین عناصر یعنی (۱) ابتدائی (Elementary) (۲) سکنڈری اور (۳) یونی ورسٹی میں تبدیل کر دیا جائے گا۔

ایک ہزار مڈل اسکولوں کا درجہ بڑھا دیا جائے گا اور دو ہزار نئے ثانوی اسکول کھولے جائیں گے۔ اس طرح اگلے پانچ سال کے دوران طلبہ کی ۱۸ لاکھ داخلہ کی

موجودہ تعداد بڑھ کر ۲۰ لاکھ ہو جائے گی۔ ان اسکولوں میں سائنس لیبارٹری، تدریسی اور سمعی و بصری اعانات اور ہوسٹل وغیرہ کی سہولت بہم پہنچائی جائے گی۔

ثانوی منزل پر طلبہ کو انتخاب مضامین کی کافی سہولت ہوگی تاکہ وہ اپنی پسند اور فطری رغبت سے مضامین کا انتخاب کرسکیں۔ ایگرو ٹیکنیکل مضامین کی موجودہ اسکیم کو بہتر اور بامقصد بنایا جائے گا طلبہ کو ان کے علاقے سے متعلق زراعتی اور ٹیکنیکل مہارتوں سے روشناس کرایا جائے گا۔ ریاضی کو کماحقہٗ اہمیت دی جائے گی۔ سائنس کے طلبہ کو بارہویں جماعت تک کیمسٹری، فزکس اور بیالوجی کے ساتھ ساتھ ریاضی کا پورا نصاب پڑھنا ہوگا آرٹس کے تمام طلبہ کے لئے ریاضی کی تعلیم لازمی ہوگی۔

سائنس کی تعلیم Science Education

عوام میں سائنس اور ٹکنالوجی کو مقبول بنانے اور ترقی دینے کے لئے نیشنل سنٹر فار سائنس ایجوکیشن (National Centre for Science Education) کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ اس کے لئے سائنس کی تدریس کو بہتر بنایا جائے گا۔ اسکول کو سائنسی ساز و سامان بہم پہنچائے جائیں گے، جن اسکولوں میں لیبارٹریز نہیں ہیں وہاں نئی سائنسی لیبارٹریز قائم کی جائیں گی۔ سائنس کے ممتاز اساتذہ کو اندرون ملک اور بیرون ملک اعلیٰ تعلیم کے لئے جانے کے لئے وظائف دیئے جائیں گے۔

فنیاتی اور پیشہ ورانہ تعلیم Technical and Vocational Education

فنیاتی اور پیشہ ورانہ تعلیم کو بہتر بنانے کے لئے فیصلہ کیا گیا ہے کہ اس طرح کے تمام اداروں میں بازار کی ضروریات سے متعلق (Production Oriented-Curriculum) ۔ پیداوار سے متعارف کرانے والا نصاب رائج کیا جائے۔ ایڈوائزری کمیٹیاں بنائی جائیں گی جن میں تجارت و صنعت کے نمائندے ہوں گے۔ تاکہ بازار کی بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق تربیت دی جاسکے۔

ٹیکنیکل اور ووکیشنل اداروں کی ہمت افزائی کی جائے گی کہ وہ تربیت کے دوران قابل فروخت اشیا رتیار کر کے اپنے لئے آمدنی حاصل کریں۔ ان اداروں میں پیداواری یونٹ قائم کئے جائیں گے۔ ان میں متعلقہ آبادی کے فائدے کے لئے شام کے پروگرام شروع کئے جائیں گے۔ اسکول سے تعلیم نامکمل چھوڑ کر نکلنے والوں کے لئے علاحدہ پیشہ ورانہ اسکول قائم کئے جائیں گے۔

ڈپلوما اور بی ٹیک کے طلبہ کے لئے عملی تربیت لازمی ہوگی۔ پولی ٹیکنیک اور ٹیکنیکل کالجوں کے اساتذہ صنعتوں کو مشورہ دیں گے اور صنعت کے ارکان ان کے اداروں میں پیداواری طریقوں میں مشورہ دیں گے۔ ٹیکنیکل اور ووکیشنل اداروں کے اساتذہ کو تربیت دینے کے لئے قومی سطح پر ایک ٹیچرز ٹریننگ کالج قائم کیا جائے گا۔

تعلیم مدرسہ Madrasah Education

اس وقت ملک میں دو متوازی نظام تعلیم رائج ہیں۔ مدرسہ، مکتب اور دارالعلوم روایتی ادارے ہیں۔ ان اداروں کی غرض وغایت قرآن، حدیث اور تفسیر کے ذریعہ اسلامی خیالات کی ترویج واشاعت ہے۔ اب تک ان اداروں کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ مگر اب مزید ایسا نہیں ہوگا۔

ان اداروں کو حکومت کی طرف سے تسلیم کیا جائے گا۔ جو سہولتیں دوسرے تعلیمی اداروں کے طلبہ کو حاصل ہیں وہی ان اداروں کے طلبہ کو بھی ہوں گی۔ علماء، ممتاز اسکالروں اور ماہرین تعلیم پر مشتمل ایک اعلیٰ اختیاری نیشنل کمیٹی ان اداروں کی "اسناد" کو تسلیم کرنے اور بورڈ میں سے ملحق ہونے کے مسئلہ کی جانچ کرے گی۔ ان اداروں کے فارغ التحصیل افراد کے لئے پیشہ ورانہ تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ مستحق اور باصلاحیت طلبہ کو وظائف اور قرض دیئے جائیں گے۔

اسلامیات اور عربی Islamiat and Arabic

اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اسلامیات اور عربی کی تدریس پر خاص توجہ دی

جائے گی۔ تعلیم کی تمام منازل پر اسلامیات لازمی ہوگی۔ جماعت دہم تک تمام مسلمان طلبہ کے لئے اسلام کا نصاب اور درسی کتاب مشترک ہوں گے۔ اسلامیات کے موجودہ نصاب پر نظر ثانی کی جائے گی۔ تعلیمی اداروں میں مذہبی رہنماؤں کو لیکچر دینے کے لئے مدعو کیا جائے گا۔ اس بات پر زور دیا جائے گا کہ پورا نصاب اور خاص کر تاریخ، زبانیں، اور معاشرتی علوم کا نصاب اسلام کے بنیادی اصولوں کی عکاسی کرتا ہو۔

قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد میں 'شریعت' کی ایک مکمل فیکلٹی قائم کی جائے گی۔ اسلامی شریعت، مسلم اصول فقہ اور قانون کی تعلیم دینے کے لئے جامعہ اسلامیہ بہاولپور کے مختلف شعبوں کو مستحکم بنایا جائے گا۔

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی مختلف سطحوں پر عربی کی تعلیم دینے کے لئے پروگرام بنائے گی۔ ملک میں عربی زبان کو فروغ دینے اور اس کی تدریس کے لئے تیس مراکز قائم کئے جائیں گے۔ عربی کی تدریس کے لئے تمام ہائی اسکولوں اور کالجوں میں سہولتوں کا اضافہ کیا جائے گا۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن بھی عربی کی تدریس کے لئے باقاعدہ پروگرام نشر کریں گے۔

اسکول یونی فارم — Standardization of School Uniforms

(۱) تعلیمی سال ۸۰-۱۹۷۹ء سے تمام اسکولوں میں ایک طرح کی یونی فارم رائج کی جائے گی۔

(۲) لڑکے "شلوار" اور "قمیض" پہنیں گے جو کہ ملیشیا کپڑے سے بنا ہو۔ کپڑے کا رنگ، ٹوپی اور جوتا اختیاری ہوگا۔

(۳) پورے ملک میں کپڑا ایک ہی قسم کا ہوگا۔ سردیوں میں بھی وہی یونی فارم ہوگی۔ البتہ اضافی لباس اختیاری ہوگا۔

(۴) ہلکی نیلی قمیض، سفید شلوار اور رنگین دوپٹہ لڑکیوں کی یونی فارم ہوگی۔ دوپٹہ کا رنگ اختیاری ہوگا۔

(۵) ہر تعلیمی ادارہ کا اپنا اپنا بیج، اسکارف، کالر یا شولڈر ہوگا۔

(۶) اساتذہ کے لئے بھی یونی فارم متعین کی جائے گی۔

تعلیم جسمانی کھیل اور سماجی مشاغل Physical Education, Sports and Cultural Activities

تعلیم جسمانی، کھیل اور سماجی مشاغل کے فروغ اور ترقی پر زور دیا جائے گا۔ دیسی کھیلوں، عوامی گیتوں اور رقصوں کو بشرطیکہ ان میں خلاف اسلام کوئی چیز نہ ہو، فروغ دیا جائے گا۔ اس کے لئے ایک انسٹی ٹیوٹ آف اسپورٹس اینڈ کلچر قائم کیا جائے گا۔ تعلیمی اداروں میں کھیل اور جسمانی تعلیم کی سہولت فراہم کی جائے گی۔ کالجوں میں ہفتہ میں دو پیریڈ اس کے لئے وقف ہوں گے۔ بہترین کھلاڑیوں کو صدارتی ایوارڈ دیئے جائیں گے۔

نصاب اور درسی کتب Curriculum and Text-Books

اس بات کا یقین کرنے کے لئے نصاب میں اسلام اور نظریۂ پاکستان اور قومی یکجہتی سے متعلق مناسب مواد شامل کیا گیا ہے۔ پورے نصاب اور درسی کتب پر نظر ثانی کی جائے گی۔ نظر ثانی شدہ نصاب اور درسی کتب درجہ اول اور دوم میں ۸۰-۱۹۷۹ء میں رائج کر دیا جائے گا۔ پرائمری سطح پر عملی کام پر زیادہ توجہ دی جائے گی۔ نظر ثانی شدہ نصاب ہر سال مختلف درجات میں بتدریج رائج کیا جائے گا۔ موجودہ درسی کتب کو بہتر بنانے کے لئے ایک "نیشنل ٹیکسٹ بک ریویو کمیٹی" بنائی جائے گی۔ موجودہ ٹیکسٹ بک بورڈ کی از سر نو تنظیم کی جائے گی، تاکہ درسی کتب وقت پر اور بہتر صورت میں دستیاب ہو سکیں "نیشنل بک فاؤنڈیشن" کی بھی تنظیم نو کی جائے گی۔

ذریعہ تعلیم Medium of Instruction

پاکستان کے دستور میں اردو کو قومی زبان قرار دیا گیا ہے اور اسے قومی مقاصد کے لئے استعمال کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ اس لئے قومی پالیسی میں فیصلہ کیا گیا ہے

(غیر سرکاری ذرائع سے چلنے والے انگریزی ذریعۂ تعلیم کے تمام اسکول پورے پاکستان میں اردو زبان یا کسی منظور شدہ صوبائی زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اختیار کریں۔
تعلیم کی اعلیٰ منزل پر اردو کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت دینے کے لئے سائنس اور پیشہ ورانہ اصطلاحات کو معیاری بنایا جائے گا۔ اور انھیں تبدریج رائج کیا جائے گا۔ سائنسی، پیشہ ورانہ اور ٹیکنیکل مضامین میں اردو زبان میں کتابیں لکھنے کی ہمت افزائی کی جائے گی۔ کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں استعمال کی جانے والی اہم کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا جائے گا۔

تعلیم اساتذہ Teacher Education

تعلیم اساتذہ کے اداروں میں جن امیدواروں کو داخلہ دیا جائے گا ان کے لئے نظریہ پاکستان سے بھرپور وفاداری ضروری ہوگی۔ تمام اساتذہ کے لئے ہر پانچ سال پر کم از کم ایک زیر ملازمت تربیتی کورس مکمل کرنا ضروری ہوگا۔
علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کے تربیت اساتذہ کے موجودہ پروگرام کو مزید بہتر بنایا جائے گا۔ قبل ملازمت تعلیم اساتذہ کے لئے پرائمری اساتذہ کے تمام تربیتی اداروں اور نارمل اسکولوں کا درجہ بڑھا کر انھیں کالج آف ایلیمنٹری ٹیچرس بنا دیا جائے گا۔ اکیڈمی آف ہائر ایجوکیشن آف یونی ورسٹی گرانٹ کمیشن۔ یونی ورسٹی اور کالج کے تمام اساتذہ کو قبل ملازمت اور ہر پانچ سال پر ایک بار زیر ملازمت تربیت کا موقع فراہم کرے گا۔ فی الحال انتظام اور نگرانی کے شعبہ میں ایجوکیشنل ایڈمنسٹریٹروں، سپروائزروں اور دوسرے کلیدی عملہ کی تربیت کے لئے کوئی انتظام نہیں ہے۔ اس کام کے لئے ایک اکیڈمی آف ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ مینجمنٹ کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔

تشخیص قدر اور امتحان Evaluation and Examination

بیرونی امتحان کے موجودہ فرسودہ نظام سے تعلیمی معیار پست ہوتا جا رہا ہے۔

اس نظام میں رٹنے کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔ اس لئے دسویں اور بارہویں جماعت کے اختتام پر امتحان کے پبلک سسٹم کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے گی دسویں جماعت کے اختتام پر پبلک امتحان کی جگہ تشخیص قدر کے اندرونی نظام کا طریقہ بتدریج رائج کیا جائے گا۔ طلبہ کی ترقی کا تعین وقتاً فوقتاً اور سالانہ امتحان ان کے حصول کی مسلسل تشخیص قدر، عام طرز عمل اور رویے کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ عبوری عرصہ کے دوران مختلف مضامین میں طلبہ کے اندرونی امتحان میں حاصل کردہ گریڈ کو بیرونی پبلک امتحان کے نتائج کے ساتھ ظاہر کیا جائے گا۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں اور پیشہ ورانہ کالجوں میں داخلے کے وقت پبلک امتحانات کے نمبرات کے علاوہ رغبت (Aptitude) اور داخلے کے امتحانات کے ساتھ ساتھ اندرونی تشخیص قدر کو بھی مناسب اہمیت دی جائے گی۔

رہنمائی، مشاورت اور تقرر Guidance Counselling and Placement

باقاعدہ (Normal) مستثنیٰ اور ذہین بچوں کی تعلیمی اور پیشہ ورانہ رہنمائی کی موجودہ غیر تسلی بخش سہولتوں کو بہتر بنایا جائے گا۔ ایک "قومی ادارہ نفسیات" قائم کیا جائے گا۔ جو اسکولوں اور کالجوں میں مختلف صوبوں کے تعلیمی اور تحقیقی اداروں کے تعاون سے امتحانات، انونٹریز (Inventories) تربیتی کتابچے اور معلوماتی کتابچے مرتب کرے گا اور انھیں با جواز (Valid) اور معیاری بنانے کا کام کرے گا۔ اس پروگرام پر عمل کرنے کے لئے ہر ہائی اسکول میں ایک مشیر رہنما (Guidance Counsellor) مقرر کیا جائے گا۔

ملازمت کے مواقع کی نشان دہی کرنے اور مختلف پیشوں کے لئے پیشہ ورانہ رہنمائی بہم پہنچانے کے لئے "نیشنل اینڈ پراونشل بیورو آف پلیس منٹ" کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔

تعلیمی انتظام اور نگرانی Educational Management and Superuision

وفاقی وزارت تعلیم اور صوبائی تعلیم کے شعبوں، نظامت تعلیم اور ان کے ماتحت

دوسرے شعبوں کو باقاعدہ منظم کیا جائے گا۔ تمام کلیدی عہدوں پر مستند اور تجربہ کار ماہرینِ تعلیم کو مقرر کیا جائے گا۔ تعلیم کی مؤثر نگرانی اور انتظام کے لئے تعلیمی نظم ونسق کو مزید غیر مرکزی بنایا جائے گا۔ ایجوکیشن کوڈ کو تعلیمی اداروں کے معقول نظم وضبط کے لئے مناسب طور پر بہتر بنایا جائے گا۔

ثانوی سطح تک اسکول کی تعلیم کو بہتر طور پر چلانے کے لئے ہر ضلع میں کافی اختیارات اور مالی وسائل کے ساتھ "ڈسٹرکٹ ایجوکیشن اتھارٹی" قائم کی جائے گی۔ پرائمری اساتذہ کو مستعدی سے فرائض انجام دینے کے مواقع فراہم کئے جائیں گے۔ ثانوی مدارس میں اساتذہ کا نیا تقرر کرتے وقت پرائمری مدارس کے ان اساتذہ کو ترقی دینے کو ترجیح دی جائے گی جو ضروری شرائط پوری کرتے ہوں۔

کالج کی تعلیم College Education

کالج کی تعلیم کی موجودہ حالت کو بہتر بنانے کے لئے اگلے پانچ سال کے عرصہ میں انٹرمیڈیٹ کالج کی سو عمارتوں (۶۷ لڑکوں کے اور ۳۳ لڑکیوں کے) اور ڈگری کالجوں کی بارہ عمارتوں (۹ لڑکوں کے اور ۳ لڑکیوں کے) کی دوبارہ تعمیر ومرمت کی جائے گی۔ ان کالجوں کو مناسب تعلیمی اور سائنسی ساز وسامان فرنیچر، لائبریری اور لیبارٹری کی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ کالجوں میں بک بینکس کو مستحکم بنایا جائے گا۔ اور نصابی کتب ارزاں قیمت پر دی جائیں گی۔

دیہی علاقوں میں، اگلے پانچ سال میں، موجودہ ہوسٹل کی حالت کو بہتر بنایا اور تین ہزار ہوسٹل سیٹس کا اضافہ کیا جائے گا۔ کالجوں میں کھیل کود اور سماجی مشاغل کی آسانیاں ہوں گی۔ کالج میگزین کے لئے مناسب رقم دی جائے گی۔ کالج کے اپنے اور مختلف کالجوں کے درمیان مباحثہ، کھیل کود، فرضی مقدموں کی بحث اور دوسرے سماجی مشاغل کو ترقی دی جائے گی۔

انتخاب مضامین میں طلبہ کو مدد دینے کے لئے کالجوں میں رہنمائی اور مشاورت کا شعبہ قائم کیا جائے گا۔ نیز تکمیل تعلیم کے بعد موزوں ملازمت کے حصول کے

لئے "مرکز تقرر" قائم کیا جائے گا۔

یونی ورسٹی کی تعلیم University Education

گذشتہ چند سالوں میں یونی ورسٹی تعلیم میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا ہے۔ ملک کی تمام یونی ورسٹیاں مالی بحران کا شکار ہیں۔ اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ وفاقی حکومت ان یونی ورسٹیوں کے (ترقیاتی و ترقیاتی) تمام اخراجات برداشت کرے گی۔ یہ فنڈ یونی ورسٹی گرانٹ کمیشن کے توسط سے دیا جائے گا۔ یونی ورسٹیاں وفاقی حکومت کے زیر اثر نہیں ہوں گی۔ صوبائی حکومت یونی ورسٹیوں کو جو رقم دیتی تھی وہ پرائمری تعلیم کی طرف منتقل کر دیا جائے گا۔

یونی ورسٹی گرانٹ کمیشن کو وسعت دی جائے گی اور اسے مستحکم بنایا جائے گا۔ یونی ورسٹیوں کے مخصوص شعبوں کو پورے ملک کے اساتذہ کے لئے ڈاکٹورل اور پوسٹ ڈاکٹورل پروگرام کے لئے اعلیٰ مطالعے کے مراکز کی حیثیت دی جائے گی تحقیق اور مطالعہ کو بہتر بنانے کے لئے کتابیں، جرنلز اور دوسرے ساز وسامان فراہم کئے جائیں گے۔ قومی یکجہتی کو فروغ دینے کے لئے یونی ورسٹیوں کے درمیان اساتذہ اور طلبہ کے خیر سگالی مشن کے آنے جانے کا طریقہ رائج کیا جائے گا یونی ورسٹی کے ممتاز اساتذہ وطلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے لئے وظائف دیئے جائیں گے۔ یونیورسٹیوں میں صرف انھیں طلبہ کو داخلہ دیا جائے گا جو اعلیٰ تعلیم کی ضروری رغبت اور قابلیت رکھتے ہوں۔

پیشہ ورانہ تعلیم Professional Education

پیشہ ورانہ تعلیم کے اداروں میں تعلیم اور تربیت کا عملی دنیا سے قریبی رابطہ ہونا چاہیئے۔ نیز اس کے فوائد براہ راست آبادی کو پہنچنے چاہئیں۔ اس لئے فیصلہ کیا گیا ہے کہ آئندہ پیشہ ورانہ تعلیم دینے والے تمام ادارے اپنے گریجولیٹس کی برسر کار (On-the-Job) تربیت کا انتظام کریں گے۔ تمام پیشہ ورانہ ادارے صنعت یا اپنے خصوصی میدان عمل سے رابطہ رکھیں گے اور مشاورتی خدمات کا

بند وبست کریں گے۔ تمام اداروں میں ایڈوائزری کمیٹی بنا کر پیشہ ورانہ اداروں اور آجروں کے درمیان قریبی تعاون قائم کیا جائے گا۔ کیوریکولم اور اکیڈمک کونسل میں آجروں کے نمائندوں کو بھی شامل کیا جائے گا۔

پیشہ ورانہ اداروں میں لائبریری، لیبارٹری، ورکشاپ وغیرہ کو ترقی دی جائے گی۔

تعلیم میں تحقیق Research in Education

ایک "تعلیمی تحقیق کا قومی ادارہ" قائم کیا جائے گا۔ یہ ادارہ اہم معاملات اور مسائل پر تحقیق کا انتظام کرے گا۔ صوبائی تعلیمی و تحقیقی اداروں کو مستحکم کیا جائے گا۔ تحقیقی دریافت کی نشر و اشاعت کو تحقیقی جرنل اور باضابطہ اعلان کی اشاعت کے ذریعہ باقاعدہ بنایا جائے گا۔

تعلیمی اختراع Educationl Innovation

اس پالیسی کی بڑی حکمت عملی ہماری آبادی میں چھپے ہوئے روایتی ڈھانچوں اور اداروں کو زندہ کرنا اور انھیں مستحکم بنانا ہے تاکہ تعلیمی ترقی کو تیز کیا جا سکے۔ اختراع کا مطلب یہی ہے کہ مفید افراد اور پوشیدہ ذرائع کو منظر عام پر لایا اور ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ بہت سے اختراعی منصوبے جو جداگانہ اور الگ تھلگ طریقے سے چل رہے ہیں۔ ان میں ارتباط پیدا کیا جائے اور ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے۔

اس مقصد کے لئے وفاقی اور صوبائی سطحوں پر تعلیمی اختراع کے لئے ترقیاتی گروپ" (Development group for Educational Innovation) قائم کیا جائے گا۔ تاکہ ملک کے مختلف اختراعی مراکز اور علاقہ کے دوسرے ترقی پذیر ممالک کے درمیان رابطہ قائم ہو اور ایک دوسرے کے تجربات اور معلومات کی اشاعت ہو۔ اس طور پر تعلیم پر اٹھنے والا خرچ کم ہو جائے گا اور تعلیم

کو آبادی اور انفرادی ضروریات سے مربوط کرنے میں مدد ملے گی۔

اساتذہ کے لئے تحریک Teacher Motivation

تعلیم کی تمام سطحوں پر اساتذہ کو اہم مقام حاصل ہے۔ اس لئے اساتذہ کے انتخاب کے وقت ان کے اندر نظریہ پاکستان کو سمجھنے اور تدریسی پیشہ سے گہری دلچسپی کی صلاحیت کو پیش نظر رکھا جائے گا۔ اساتذہ کو قومی و بین الاقوامی سیمینار، ورک شاپ اور کورس میں حصہ لینے کی ہمت افزائی کی جائے گی۔ تمام سطحوں کے اساتذہ کے لئے ایک "ضابطہ اخلاق" مرتب اور نافذ کیا جائے گا۔ اساتذہ اور منتظمین کے کام کی تشخیص کا جامع نظام رائج کیا جائے گا۔ اساتذہ کو رہائش کی اور دوسری سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ اندرون ملک و بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کے لئے ان کے وظائف کی تعداد میں اضافہ کیا جائے گا۔ یونی ورسٹی کے اساتذہ ملک اور صوبوں کی دوسری یونی ورسٹیوں میں تعلیمی سفر کر سکیں گے۔ تمام سطحوں کے اساتذہ کو اندرون ملک و بیرون ملک اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے با تنخواہ چھٹی دی جائے گی۔ قابل اساتذہ کو ہر سال "قومی ایوارڈ" دیا جائے گا۔

طلبہ کی فلاح و بہبود Student Welfare

طلبہ کی فلاح و بہبود کے لئے تعلیمی اداروں کے اندر اور باہر دونوں جگہوں پر جامع پروگرام بنائے جائیں گے۔

کالج اور یونی ورسٹی کیمپس میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ہوسٹل (اقامت گاہیں) فراہم کئے جائیں گے۔ طلبہ کو بس کے کرایوں کی موجودہ رعایت کو بہتر بنایا جائے گا۔ غیر ملکی درسی کتابیں مقامی طور پر چھاپ کر سستے داموں دی جائیں گی۔ غریب طلبہ کو بینک سے کتابیں فراہم کی جائیں گی۔ ذہین طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے لئے بلاسود قرض دیا جائے گا۔ غیر ملکی تعلیم کے لئے وظائف کی تعداد دگنی کر دی جائے گی۔ ہر صوبے کے منتخب تعلیمی/پیشہ ورانہ اداروں میں دوسرے صوبوں کے طلبہ کے لئے نشستیں

سندھ اور تعلیم

سندھ عالم اسلام میں منفرد حیثیت کا حامل ہے کیونکہ ہند و پاک کا یہی وہ خطہ ہے جہاں اسلام کی کرنیں سب سے پیشتر جلوہ فگن ہوئیں۔ محمد بن قاسم کے حملے سے کون ہے جو واقف نہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان سندھ میں ۶۳۶ء سے آنا شروع ہو گئے تھے جن کا مقصد توسیع اسلام تھا۔ مسلمان جہاں پر اور جس جگہ بھی گئے انہوں نے علم و فن کو عالمانہ نظروں سے دیکھا اور اس کو حاصل کرنے کی بھی کوشش کی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے دیگر علوم کو بام عروج تک بھی پہنچایا۔ یہی بات سندھ میں بھی ہوئی جیسا کہ مولانا سید ابو ظفر ندوی فرماتے ہیں۔

> " سندھی علماء میں سب سے پہلا نام مولانا اسلامی کا ہے جو دیبل کے باشندے تھے محمد بن قاسم کے عہد میں مسلمان ہوئے اور سفارت کے عہدے پر ممتاز ہو کر راجہ داہر کے پاس بھیجے گئے۔"

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے صاحب علم حضرات کا تذکرہ ملتا ہے۔ جیسے موسیٰ بن یعقوب قاضی اور "چچ نامہ" جن کی مشہور زمانہ تصنیف ہے۔ جناب "عراقی" جنہوں نے قرآنِ پاک کا سندھی زبان میں ترجمہ کیا۔ ابو نصر سندھی اور منصور سندی وغیرہ۔

سومرا اور سمہ دور میں سندھ کی علمی سرگرمیاں بام عروج پر تھیں کیونکہ اسی دور میں عربی کی بجائے فارسی کو سندھ کی سرکاری زبان بنایا گیا۔ آخری سندھی حکمراں میاں نور محمد کلہوڑا کا قیمتی کتب خانہ نادر شاہ اپنے ہمراہ ایران لے گیا۔ جس کے بارے میں پیر حسام الدین راشدی رقم طراز ہیں۔

سندھ کا وہ دور جس کو تاریخی نقطہ نظر سے زرین دور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے وہ سمہ عہد ہے۔ ۹۲ھ یا ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم نے سندھ کے ساحل دیبل پر قدم رکھا۔ اس سلسلہ میں فتوح البلدان میں بلاذری رقم طراز ہے۔

" فاتح سندھ محمد نے وہاں مسلمانوں کی آبادی قائم کی ایک جامع مسجد تعمیر کرائی اور چار ہزار

مسلمانوں کو آباد کیا۔"

ارضِ ہند و پاک میں یہی مسجد پہلی اسلامی درس گاہ ہے جہاں پر چار ہزار مسلمانوں کے بچوں کے لئے قرآن و دینی تعلیم کا انتظام تھا۔ دیبل کے حاکم ابن قاسم کی طرف سے قبلہ ابن مترابح پنڈت جو عالم اور ادیب تھا۔ محمد بن قاسم کے ہاتھوں اسلام لایا۔ حمید بن دواع کو دیبل کا شحنہ مقرر کیا جو مولانا اسلامی کے نام نامی سے مشہور ہوئے۔ ادور کی فتح کے بعد بھی محمد بن قاسم نے وہاں پر ایک مسجد تعمیر کرائی۔ ملتان کا شہر آخری تھا۔ جہاں پر حجاج بن یوسف کا خط آیا جس میں اس نے لکھا تھا۔

"تم کو چاہیئے کہ جہاں کوئی مشہور قصبہ یا شہر ملے وہاں مسجد و منابر تعمیر کرو۔"

(تاریخ ہندوستان جلد اول ۲۲۹)

اس کے جواب میں محمد بن قاسم نے لکھا۔

"ہر ضروری مقام پر مسجدیں بنادی گئیں جہاں اذان اور خطبے وقت پر ہوتے ہیں۔"

(چچ نامہ) خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے سندھ کے امراء کو دعوت اسلام کے خطوط لکھے۔ داہر کا بیٹا جے سنگھ اور دیگر امیر زادے مسلمان ہوئے۔ بنی امویہ کے دور میں جب حکیم بن عوانہ کلبی کے ساتھ محمد بن قاسم کا لڑکا عمر آیا تو انہوں نے ایک شہر محفوظ آباد کے نام سے تعمیر کیا۔ اس کے بعد منصورہ بسایا گیا۔ بنی عباس کے دور میں ابومسلم خراسانی نے سندھ پر عبدالرحمٰن کو گورنر مقرر کیا۔

دیبل محمد بن قاسم کے بعد سے علم و فضل کا مرکز تھا۔ یہاں سے ابراہیم بن محمد دیبلی۔ احمد بن عبداللہ دیبلی، خلف محمد دیبلی، شعیب محمد دیبلی، علی بن موسیٰ دیبلی، احمد بن ابراہیم، محمد بن محمد جیسے صاحب علم و فضل پیدا ہوئے ان حضرات کے علمی کارنامے انساب سمعانی اور معجم البلدان میں موجود ہیں۔

سندھ کا دوسرا شہر منصورہ تھا۔ اس نے بھی علمی اعتبار سے بڑی ترقی کی وہاں کی مسجدیں دارالعلوم کا کام انجام دیتیں۔ چنانچہ وہاں کے اکابر علماء کا ذکر تاریخوں میں مفصل موجود ہے۔

احمد بن محمد منصوری۔ ابوعبداللہ منصوری۔ محمد بن شوارب۔ علی بن اشوارب ابوالعباس احمد بن محمد منصورہ کے قاضی تھے۔ مذہب داؤد اصفہانی کے سلسلہ میں ان کی تصانیف ہیں۔ مقدسی سیاح ان سے ملا تھا۔ احسن التقاسیم میں اس نے ان کا ذکر کیا ہے ان کی نگرانی میں ایک مدرسہ

بھی تھا. جہاں وہ درس دیتے تھے. ابن ندیم نے الفہرست میں ان کی کتاب المصاح الکبیر کتاب الہادی۔ اور کتاب النیر کا تذکرہ کیا ہے منصورہ کے حاکم عمر بن عبداللہ ہباری کا وزیر رباح بڑا عالم تھا جس سے مورخ اسلام مسعودی ۳۰۲ھ میں ملا. آل شوارب چوتھی صدی تک منصورہ میں مسند درس بچھاتے رہے. ۲۷۰ھ میں عراقی عالم جو منصورہ آ رہے تھے. انہوں نے راجہ اروڑ کی خواہش پر سندھی زبان میں عقائد اسلام کو منظوم کیا اور قرآن پاک کا ترجمہ و تفسیر سندھی زبان میں لکھی. سندھ کے دیگر شہروں میں ابوعطا سندھی، نجیع بن عبدالرحمٰن سندھی. ابوعلی سندھی. جعفر بن محمد ملتانی. فتح محمد عبداللہ سندھی، وغیرہ قابل فخر ہستیاں موجود تھیں.

سندھی علماء نے سندھ کے علاوہ بغداد. مصر. حجاز جا کر اشاعت علم کی. انساب سمعانی، معجم یاقوت حموی وغیرہ میں سندھی علماء کے کثرت سے حالات و کارنامے موجود ہیں. سندھی کے ساحل ہندو پاک پر حضرت حسن بصری. کے دو شاگرد ربیع بن جیع بصری و اسرائیل بن موسیٰ بصری تشریف لائے. ابوموسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصری کا یہ تبع تابعین سے تھے. تقریب التہذیب میں روایت ہے کہ حدیث ہے کہ حدیث کے طبقہ سادسہ میں شمار ہے. دوسری صدی ہجری کے درمیان زمانہ میں ان کا قیام یہاں رہا. یہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے ہندو پاک پر آ کر حدیث کی ترویج کی.

ناصر الدین قباچہ کے عہد میں تاریخ سندھ چچ نامہ عربی سے فارسی میں ترجمہ ہوئی اس کے عہد میں اُچ، ملتان، ٹھٹھہ علمی مراکز تھے. جہاں پر ایک دو نہیں بلکہ ہزاروں طلبانِ علم درس و تدریس میں ہمہ وقت مصروف و مشغول رہتے تھے.

سولہویں صدی ۱۵۳۰ء اور ۱۵۴۰ء کے درمیان سندھ میں شاہ بیگ ارغون حکمران تھا. یہ خود ایک جید عالم تھا. اس شخص نے علم و ادب کے لئے لاثانی کارنامے انجام دیئے جن کا تذکرہ فرشتہ نے تفصیل سے کیا ہے.

اسلامی دور میں سندھ میں مدرسہ ابو احمد منصوری جو منصورہ میں تھا. یہ سرکاری مدرسہ تھا جہاں پر ہر قسم کے اخراجات بذریعہ حکومت وقت ادا کئے جاتے تھے. دوسرا مدرسہ فیروزی جو اُچھ میں تھا. اس کو ناصر الدین قباچہ نے قائم کیا تھا. قاضی منہاج السراج جو اُچھ آئے تھے. انہوں نے مشہور زمانہ تصنیف طبقات ناصری میں اس سلسلہ میں بہت کچھ تحریر کیا ہے ایسی

طرح سے سندھ میں کتب خانہ ابو محمد منصوری تھا۔ جو منصورہ کے مقام پر تھا۔
ابو محمد منصوری منصورہ کے قاضی القضاۃ تھے۔ بہت ہی صاحب علم شخص تھے۔
انہوں نے تعلیم و تعلم کے لئے بہت ہی قابلِ قدر کارنامے انجام دیئے ہیں جن
کو ہم بوجہ طوالت نظر انداز کر رہے ہیں۔

مغلیہ دور میں بھی سندھ تعلیم و تربیت کا مرکز رہا جس کا اندازہ عہد اورنگ
زیب کے مشہور سیاح کپتان الیگزنڈر ہملٹن کے اس بیان سے باآسانی ہوسکتا ہے
کہ " سندھ کے صرف ایک شہر یعنی ٹھٹھہ میں مختلف علوم و فنون کے چارسو مدارس ہیں"۔

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے سندھ میں تعلیم و تربیت کا ایک اجمالی خاکہ پیش
کیا ہے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد ہندوستان میں سیاسی کبڈی شروع ہو گئی۔
سیاسی ابتری میں فنون لطیفہ اور تعلیم و تربیت تباہ ہو جاتے ہیں۔ یہی عالم سندھ کا
بھی ہوا۔ رفتہ رفتہ سندھ میں بھی ابتری پھیلنے لگی۔ خود غرضی سازش، مکاری، عیاری
کا دور دورہ ہوا۔ اور رفتہ رفتہ سندھ انگریزوں کے اقتدار میں چلا گیا۔ جس وقت چارلس
نیپئر نے حملہ کیا اس وقت میر علی مراد، میر صادق اور میر جعفر کا رول ادا کر رہا تھا۔ جس کا
تذکرہ نیپئر کے سوانح نگار ولیم ٹیلر نے اس طرح کیا ہے۔

" اس وقت دو شخصیتیں منظر عام پر آئیں۔ ایک میجر جیمس آوٹرم اور دوسری
ہز ہائینس علی مراد جو امیر خیر پور تھے۔ کسی مشرقی نے بھی جیمس آوٹرم سے بہتر
مشرقی کی نمائندگی نہیں کی ہو گی۔ لیکن اس کے برخلاف ذاتی مفاد کی خاطر
میر علی مراد سے زیادہ سازشی عیار اور خود غرض شخص تاریخ عالم میں مشکل
سے ہی نظر آئے گا۔"

میر علی مراد دوغلی پالیسی پر عمل کر رہے تھے۔ ایک طرف تو وہ انگریزوں کی جلم برداری
میں مصروف تھا دوسری طرف امیران سندھ میں تفریق پیدا کر کے ان کو آپس میں لڑا رہے
تھے۔ اگرچہ اہل سندھ نے ہر جگہ بہادری سے مقابلہ کیا۔ لیکن وہ کب تک انگریزوں کے
مقابلہ پر ٹکتے۔ چنانچہ ۱۸۴۳ء کو صوبہ سندھ انگریزوں کے قبضہ و اقتدار میں چلا گیا۔ انگریزوں
کو سندھ میں قدم جمانے کے لئے ہمنواؤں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ انہوں نے ہندوؤں کو
اپنانے کی کوشش کی۔ جس میں ان کو کامیابی ہوئی۔

سنہ [illegible]ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد ہند و پاک میں طوائف الملوکی کا راج تھا۔ مسلمانوں کو تین محاذوں پر کرم نا پڑ رہا تھا۔ انگریز، ہندو اور خود وہ مسلمان جو اقتدار اور ہوس کے متمنی تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ رفتہ رفتہ سیاسی، اقتصادی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی اور تعلیمی حالتوں میں بد سے بدترین ہوتے چلے گئے۔ ہندو جو عرصہ دراز سے مسلمانوں کے ماتحت تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کو تحت الثریٰ میں پہنچانے کے لئے ہر ممکن ہتھکنڈوں کو اپنایا۔ اس زوال میں مسلمان بھی برابر کے ذمہ دار ہیں کیونکہ اب اسلامی نظریہ حیات کا فقدان تھا۔ علم کو انہوں نے عمل سے الگ کر دیا تھا۔ ہندوستانیوں کی بہت سی بری رسموں کو اپنا لیا تھا۔ بہرحال ایک زمانہ وہ تھا جبکہ مسلمان اپنے علمی و ادبی کارناموں کی وجہ سے شہرت عام و بقائے دوام کے مالک تھے۔ اور ایک زمانہ ایسا آیا کہ سندھ میں مسلمانوں کا حال بقول مخدوم ابراہیم ٹھٹھوی حسب ذیل تھا۔

ہمارے دیار میں علانیہ شرابیں کشید کی جاتی ہیں۔ فرد و شطرنج کی بازی ہوتی ہے۔ نشہ آور چیزیں چاول وغیرہ سے علانیہ بنائی جاتی ہیں۔ دکانوں پر بت رکھے ہیں جن کی پوجا ہوتی ہے۔ کافروں کے چراغ فضائے آسمانی میں جگمگاتے رہے ہیں۔ تا کہ کفر کی شہرت میں قوت باقی رہے مسجدیں ویران ہوتی جارہی ہیں۔ نماز وغیرہ کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ فصل مقدمات میں مکھیاؤں کی طرف جو کافروں کے رئیس ہیں، رجوع کیا جاتا ہے کسی مسلمان قاضی میں اتنی ہمت و جرأت نہیں ہے کہ وہ کسی کافر کی مخالفت کر سکے۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اس کی مرمت کی جاتی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ خدا ان مکھیاؤں سے بچائے میں کئی بار ان کا شکار ہو چکا ہوں۔ چنانچہ شہر ٹھٹھہ میں اس قسم کی مصیبتوں سے دوچار ہوا کہ زمین مجھ پر تنگ ہو گئی۔ آخر کار تنگ آکر کراچی آگیا ہوں۔"

کراچی کے سلسلے میں یوں فرماتے ہیں۔

"نیپا نامی قصاب کو ان کافروں نے ذرا دیر میں نکال باہر کیا۔ اس کے گھر کو لوٹ لیا مسلمانان کراچی سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ اس کو چھڑا لیتے اس شخص کا صرف یہ قصور تھا کہ وہ قصاب تھا۔"

ان واقعات کو قلم بند کرنے کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ مسلمانان سندھ میں کتنی

برائیاں داخل ہو چکی تھیں ۔ اتنا ہی نہیں بلکہ حکمران مسلمان تھے لیکن ہندوؤں کا ان پر اتنا اثر تھا کہ وہ ان کے خلاف کچھ سننے تک کو تیار نہیں تھے ۔ اس قسم کے مظالم کی لاتعداد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن ان تمام نقائص ۔ برائیوں اور خامیوں کے ہوتے ہوئے بھی کچھ ایسے لوگ موجود تھے جو قوم کی اس بے حسی پر آنسو ہی نہیں بہا رہے تھے بلکہ قوم کو بیدار کرنے کے لئے بھی کوشاں تھے۔ چنانچہ جس وقت دہلی میں شاہ ولی صاحب نے اپنی علمی و اصلاحی تحریکوں کو شروع کیا تو سندھ میں مخدوم ابوالقاسم نقشبندی ۔ مخدوم محمد ہاشم ۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی مخدوم محمد ٹھٹھوی اور خواجہ محمد زمان وغیرہ نے مسلمانوں کو کسمپرسی سے نکالنے کے لئے جہاد کیا ۔ سندھ میں تین ہستیاں ایسی تھیں جن کا شاہ صاحب سے براہ راست تعلق تھا ۔ شیخ القرأ ، قاری محمد فاضل سندھی ۔ مخدوم معین سندھی اور محمد شریف حسین سندھی ۔

جیسا کہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے کہ انگریزوں کی ابتدا ہی سے یہ پالیسی تھی کہ مسلمانوں کی ثقافت اور ادب کو ختم کر دیا جائے تو یہ خود بخود ہی ختم ہو جائیں گے چنانچہ ہر وہ طریقہ اپنایا گیا جس سے وہ اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کر سکیں ۔ ایک زمانہ تھا کہ سندھ عروس البلاد کے نام سے مشہور تھا ۔ اور اب حال یہ تھا کہ سندھ ہندو پاک کا واحد علاقہ تھا جہاں پر مسلمانوں کی سب سے بری حالت تھی ۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر اے بی ۔ ایس گیلانی شہر کراچی کی تعلیمی حالت کو اس طرح بیان کرتے ہیں ۔

> "کراچی شہر چار علاقوں ۔ ملیر ، منگھو پیر ، ماری پور ، اور منوڑا سے گھرا ہوا ہے ۔ سندھ بمبئی پریسیڈنسی سے الحاق کے آٹھ سال بعد انگریزی طرز تعلیم سے متعارف ہوا ۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ سندھی حروف مستعمل تھے ۱۸۵۱ء میں سر بارٹل فریر نے جن کے نام فریر ہال منسوب ہے جملہ ملازمین شہر کے واسطے عام بول چال سندھی زبان کا امتحان پاس کرنا لازمی قرار دیا ۔ کیپٹن برٹن نے کیپٹن اسٹاک کی سندھی بخط دیوناگری کی تجویز کے بالمقابل سندھی عربی حروف میں لکھے جانے کی تحریک کی وکالت کی ۔ چنانچہ سر بارٹل فریر نے برٹن کے نظریات پر عمل کیا ۔ اور ان ہی خطوط پر ڈائریکٹران ایسٹ انڈیا کمپنی نے سندھی بخط عربی کے حق میں فیصلہ کیا ۔ اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے دس

ہزار کی رقم منظور کی۔ مسٹر ایلس نے چند ممتاز مقامی ماہرین لسانیات کی مدد سے نئے حروف تہجی ایجاد کئے۔ جن کے مطابق عربی کے ۲۹ حروف کو ۵۲ حروف میں تبدیل کیا گیا۔ یہ حروف تہجی اور طرز تحریر ۱۸۵۳ء میں شائع کئے گئے۔

۱۸۴۵ء میں کیپٹن راتھ بورن کلکٹر حیدرآباد نے نئے تعلیم طرز کو رائج کرنے کی کوشش کی لیکن اس کو کامیابی نہ ہوسکی۔ اس کے بعد کیپٹن پریڈی جس کے نام پر پریڈی اسٹریٹ مشہور ہے۔ اس نے کراچی میں سب سے پہلا اسکول "فری اسکول" کے نام سے قائم کیا۔ بعد میں اسکول کو عیسائیوں کے سپرد کردیا گیا۔ جو آج بھی چرچ مشن اسکول کے نام سے لارنس روڈ پر قائم ہے یہ کراچی کا سب سے پرانا اسکول ہے۔ اس کے بعد گرامر، این۔ جے۔ وی۔ سینٹ، پیٹرک۔ سینٹ جوزف کانونیٹ اور بی وی پارسی کھولے گئے۔

ڈاکٹر گیلانی کے اقتباس سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ ۱۸۸۵ء تک سندھ اور کراچی میں نئے نظام کے تحت مسلمانان سندھ کا کوئی بھی کارنامہ نہیں تھا۔ کراچی میں تو اس زمانہ میں مسلمانوں کی تعداد بہت ہی قلیل تھی۔ البتہ سندھ میں مسلمان اکثریت میں تھے۔ اس سلسلہ میں خواجہ علی محمد صاحب سندھ مدرسہ کرانیکل کے الفاظ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

> "ساٹھ سال قبل موجودہ معیار کے مطابق مسلمانان سندھ میں تعلیم کا تصور بھی کارفرما نہیں تھا۔ اس سے قبل پرائیویٹ مکتب کہیں کہیں فروغ تھے۔ ان نوجوانوں کے لئے جو مذہبی تعلیم کے دلدادہ تھے۔ ماہر مولویوں کے ذریعہ تعلیم دی جاتی تھی، چھوٹے بچوں کے لئے مساجد اور ملا اسکول تھے۔ بڑے بڑے محلوں اور گلیوں میں قرآن پاک اور فارسی کی تعلیم کے انتظام تھے۔ یہ تھی وہ کل تعلیم جو مسلمان بچے ابتدائی دور میں حاصل کرتے تھے۔ سندھی جو مادری زبان تھی۔ اس پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی تھی۔"

اب ہم کچھ رپورٹوں کا حوالہ دینا ضروری خیال کرتے ہیں۔ تاکہ ناظرین اس بات سے بخوبی واقف ہوجائیں کہ انگریزوں نے سندھ کی تعلیم کے لئے کاغذوں پر کیسے

کیسے فارمولے پیش کئے۔ لیکن حقیقتاً ان پر عمل بالکل بھی نہیں کیا گیا اور کیا بھی گیا تو صرف ان حصوں یا شعبوں پر جو ان کے اپنے فائدے کی تھیں۔

اس سلسلہ کی سب سے اہم کڑی مسلمانان سندھ کی تعلیمی تاریخی ایلس رپورٹ ہے جس نے مندرجہ ذیل حالات کو بیان کیا ہے۔

والیان سندھ کی حالت:۔ اس دور کی خصوصیت یہ تھی کہ ہندوستان کے زیادہ تر والیان ریاست ناخواندہ تھے۔ یہی حال سندھ کی بھی تھی جس کی سب سے بڑی وجہ سیاسی عدم واستحکام تھا۔ کیونکہ ایک تو حالت بہت خراب تھے۔ دوسرے وہ خود بھی تعلیم یافتہ نہیں تھے۔ اس لئے وہ تعلیم کی ترقی و ترویج پر بالکل توجہ نہیں دیتے تھے۔ ملک میں فیوڈل سسٹم کا رواج تھا۔ ان حکمرانوں کو لوٹ مار۔ غارت گری اور عیاشی پسند تھی۔ امیران تالپور کے عہد میں اگرچہ حیدرآباد صوبہ سندھ کا دارالحکومت تھا لیکن ہم کو کسی بھی ذریعہ سے ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ انہوں نے کوئی بھی اسکول عوام کے لئے قائم کیا ہو۔ اتنا ہی نہیں بلکہ کسی ادارے کو مدد تک بھی نہیں دی۔ صوبہ میں جو کچھ بھی تعلیمی میدان میں ہو رہا تھا۔ وہ عموماً پیشوایان مذہب کا فیض تھا۔ ایلس اس ضمن میں رقم طراز ہے۔

"گو خطہ سندھ میں تاریکی و جہالت کا دور دورہ تھا لیکن پھر بھی کہیں کہیں تعلیمی شمعیں روشن تھیں۔ ان سے میری مراد وہ خانگی مکاتب ہیں جو مولوی اور ملا صاحبان نے عربی و فارسی کی تعلیم کے لئے کھول رکھے تھے۔"

تعلیم سے عدم توجہی کا اندازہ اس سے بھی بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۸۷۷ء کی گورنمنٹ بمبئی کی انتظامی رپورٹ کے مطابق ریاست خیرپور میرس کا مکمل تعلیمی بجٹ ۶۶۸۸ روپیہ تھا۔ اور طلبہ کی ماہانہ اسکولوں میں حاضری کا اوسط ۲۷۰ تھا۔ جبکہ اس علاقہ کا رقبہ چھ ہزار مربع میل ہے۔

ہم کو سرکاری ذریعہ سے ۱۸۵۲ء میں ایسی مکاتب اور طلبہ کی تعداد کا پتہ لگتا ہے۔ چنانچہ دیسی مکاتب کی تعداد ۶۳۲ اور طلبہ کی تعداد ۳۴۴۸ تھی جن مکاتب میں صرف قرآن پاک کی ہی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان کی تعداد ۲۷۸ تھی۔ اور ان میں طلبہ کی تعداد ۹۰۶ تھی۔ جن مکاتب میں عربی فارسی دونوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان کی تعداد ۲۷۵ اور طلبہ کی تعداد ۲۱۳ تھی۔ ایسے ادارے اور اساتذہ بھی تھے۔ جہاں پر مفت تعلیم دی جاتی تھی۔

بمبئی میں مسٹر انفنسٹن نے ایک اسکول قائم کیا اس شخص کے بارے میں ہم گذشتہ اوراق میں تحریر کر چکے ہیں۔ اس نے یہ اسکول ۱۸۲۴ء میں قائم کیا تھا لیکن اس کے جانے کے بعد اس کے پرستاروں نے اس کو کالج بنادیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جبکہ عیسائی مشنریوں نے مذہبی اشاعت اور تبلیغ میں آفت مچار کھی تھی۔ اگرچہ اس دور میں اعلیٰ تعلیم کے لئے دو کالج موجود تھے لیکن مسلمانوں کو اس میں داخل نہیں کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ۱۸۴۴-۴۵ء میں پونا اور بمبئی کالج میں ایک بھی مسلمان طالب علم نہیں تھا مسلمانوں کی مالی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ تمام اداروں میں انگریزی لازمی تھی۔ چنانچہ اسکولوں میں مرہٹی۔ ایک میں گجراتی۔ ایک میں کناری۔ چھ میں سنسکرت اور ایک میں سندھی ذریعہ تعلیم تھی۔ ان تمام اداروں میں عربی اور فارسی کا کہیں پر بھی تذکرہ نہیں ملتا۔ یہی مسلمانوں کی زبانیں تھیں بریسیڈنسی میں ۷ مسلمان بچے ثانوی اداروں میں زیر تعلیم تھے۔ ان کی تعداد اس طرح تھی انفنسٹن اسکول بمبئی ۷۱ حیدرآباد سندھ ۱۲ اور کراچی ۲۳۔

ایلس کے بعد لارڈ میو کا رزولیشن بہت ہی اہمیت اور افادیت کا حامل ہے لارڈ میو نے مسلمانانِ ہند کی تعلیم و تربیت کے لئے جو صوبائی حکومتوں کو ہدایات جاری کی تھیں۔ ان پر جناب سید محمود اس طرح تبصرہ کرتے ہیں۔

"لارڈ موصوف کے حکم نامہ کے جواب میں صوبہ بمبئی کی حکومت نے مسلمانوں کو فی صد تعلیمی تناسب کے بارے میں حسب ذیل رپورٹ بھیجی ہے۔ سندھ میں مسلمان طالب علم ایک اور غیر مسلم تین ہیں کالجوں کی تعلیم میں مسلمانوں کی تعلیم میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ کہ ۶۲۷ طلبہ میں صرف ۱۴ سندھی مسلمان ہیں۔ جبکہ گریجویٹ دو اور ایم۔ اے کے بھی دو ہی ہیں۔ اسی طرح سے ۱۸۹۳ء تک جبکہ انگریزی اقتدار کو قائم ہوتے تقریباً چالیس سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ اس وقت یہاں پر مسلمانوں کی ملازمتوں کے بارے میں نواب محسن الملک کی تقریر سے حقائق کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

"سندھ میں ملازمتوں میں ۲۰۶ ہندو اور ۱۱۴ مسلمان ہیں غالباً آپ یہ سن کر خوش ہوں گے تو اول تو مسلمان سندھ میں اکثریت میں ہیں دوسرے مسلمان صرف ادنیٰ ملازمتوں پر ہیں وہاں کے سول لسٹ میں ۵۵ کانسٹیبل

لکھی ہیں۔ ان میں ۳۴ مسلمان ہیں کیونکہ ۱۲ ہندو ہیں۔ جوڈیشنل میں صرف ایک مسلمان اور ۱۶ ہندو ہیں۔ مالگذاری کے محکمے میں ۱۱۸ ہندو ہیں جبکہ ۵۹ مسلمان ہیں۔ اسی طرح اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر ۵۸ ہندو اور ۶ مسلمان اور تحصیلداری میں ۲۸ ہندو اور ۱۵ مسلمان ہیں"۔

۱۸۷۰ء کا سال صوبہ سندھ میں خاص اہمیت اور افادیت کا حامل ہے کیونکہ اسی سال انجمن اسلامیہ کا وجود عمل میں آیا۔ گورنمنٹ بمبئی نے پانچ صد روپیہ ماہانہ اس ادارے کو بحیثیت امداد دینا منظور کیا۔ چنانچہ اس انجمن نے سب سے پہلا اسکول ۱۸۸۰-۸۱ء میں قائم کیا۔ سر بارٹل نے جس نے سندھی حروف تہجی کو ایجاد کیا تھا۔ ۱۸۵۱ء میں مندرجہ ذیل امور کا اعلان کیا۔

۱. آئندہ سندھ میں درس و تدریس سندھی زبان میں ہوگا۔
۲. یورپین اور دیگر لوگ سندھی سیکھیں۔
۳. فارسی کی جگہ سندھی مدارس کھولے جائیں۔

یہ حقیقت ہے کہ سر فریئر نے سندھی زبان و ادب کی ناقابلِ فراموش خدمات کی ہیں۔ اس نے کیپٹن اسٹاک کی نامکمل سندھی گرامر کو مکمل کیا کیپٹن اسٹاک کی سندھی لغت کو مرتب کیا۔ فریئر نے سندھی ادب کے فروغ کے لئے فارسی۔ اردو۔ مرہٹی گجراتی اور انگریزی کتب کا سندھی میں ترجمہ کرنے کے لئے سندھ کے قابل لوگوں کو ترغیب دی۔ اس نے سندھی تعلیم کا پورا نظام تعلیم ایک قابل اور لائق افسر گولڈ اسمتھ کے سپرد کیا۔ چنانچہ اس تعلیم کی ابتدار ۸۸ طلبہ سے ہوئی جن میں اکثریت غیر سندھیوں کی تھی۔ کراچی میں جو اسکول قائم کیا گیا تھا۔ وہ سندھ میں مثالی اور سنگِ میل کی حیثیت کا حامل ہوا۔ اور اس کے خطوط پر بہت جلد سندھ کے دوسرے شہروں میں جیسے حیدرآباد، شکارپور وغیرہ میں بھی ہائی اسکول قائم کئے گئے۔ ان کے علاوہ وسطانی اسکول بھی کھولے گئے جن کی تعداد ۲۱ تھی۔

مندرجہ بالا پالیسی کے بہت ہی دوررس نتائج برآمد ہوئے۔ سندھی میں چونکہ اسلامی علم و ادب موجود نہیں تھا۔ جو فارسی و عربی کی خلا کو پُر کر سکتا اس لئے مسلمان اپنی مذہبی اقدار سے نابلد ہونے گئے۔ اور رفتہ رفتہ وہ انگریزی رنگ میں ڈوبتے چلے گئے۔ نتیجہ یہ

ہوا کہ انگریز اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگئے۔ عربی وفارسی کی جگہ سندھی تو نہ لے سکی۔ البتہ انگریزی نے ضرور لے لی۔

۱۹۰۱ء میں سندھ میں ۹۴۴۶۴۴۲ مسلمان آباد تھے جن میں ۶۰۹۲ بچے تعلیم حاصل کر رہے تھے مسلمان طلبہ کی تعداد پرائمری اسکولوں میں تو کافی ہوتی لیکن پھر آہستہ آہستہ کم ہوتی جاتی تھی جس کے لاتعداد اسباب تھے۔

مسٹر پیٹر، مسٹر بیکر اور مسٹر میکنٹری نے لاڑکانہ جیکب آباد، اور ٹھٹھہ میں نئے مدارس قائم کئے لیکن ان سے مسلمانوں کو کوئی بھی فائدہ نہیں ہوا۔ کیونکہ ان مدارس کی بنیاد مسلمانوں کی بیخ کنی پر رکھی گئی تھی۔

۱۸۵۳ء میں تعلیمی مد میں پرائیویٹ اداروں کو سندھ میں حسبِ ذیل ماہانہ امداد دی گئی۔

۱۔ کراچی، یوروپین۔ اینگلو یوروپین اسکول ۴۰ روپیہ
۲۔ گورنمنٹ انگلش اسکول ۳۵ روپیہ
۳۔ ورناکیولر اسکول ۱۵ روپیہ
۴۔ ایک وظیفہ ۱۰ روپیہ

اس سال کراچی میں پہلا انگلش اسکول کھولا گیا۔ اس کے ہیڈ ماسٹر کا نام مہادیو پرشاد شاستری تھا۔ اس ضمن میں سیٹھ نرائن بھوجانی نے اپنی خود نوشت میں تعلیمی حالت کا تذکرہ بہت ہی مایوس کن الفاظ میں کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں سندھ میں تعلیمی حالت درج ذیل تھی۔

۱۔ نارائن جگناتھ ہائی اسکول کراچی قائم شدہ ۱۸۵۳ء
۲۔ گورنمنٹ ہائی اسکول " " ۱۸۵۸ء
۳۔ سینٹ پیٹرک ہائی اسکول " " ۱۸۵۹ء
۴۔ یوروپین یورلیشن اسکول منوڑہ " " ۱۸۶۶ء
۵۔ شکارپور ہائی اسکول " " ۱۸۷۳ء

مندرجہ بالا تعلیمی اداروں سے ظاہر ہے کہ مسلمانان سندھ کا کوئی بھی نہیں تھا۔ جو بھی ادارے تھے یا تو ان کو ہندوؤں نے قائم کیا تھا۔ یا انگریزوں نے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ

مسلمانان سندھ کی تعلیمی حالت کو انگریزوں نے اپنی چالاکی و عیاری سے نیست و نابود کر دیا تھا۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے بھی بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔

کراچی میں	۱۴۶	ہندو طلبہ	۲۵	مسلمان طلبہ
حیدرآباد میں	۲۴۶	"	۱۲	"
شکارپور	۱۱۰	"	۲۱	"

مسلمانوں کو تعلیم و تعلّم کا شغف رہا ہے لیکن انگریزوں نے ان کی کمر توڑ دی تھی۔ وہ اپنے بچوں کو تعلیم کے لئے مدرسہ فرور بھیجتے تھے لیکن بوجہ افلاس غربت و ناداری وہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے سے قاصر رہتے تھے۔ جس کا اندازہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔ یہ جدول ۱۸۷۷-۷۸ء سے کا ہے۔

نام مقام	تعداد طلبہ: ہندو	تعداد طلبہ: مسلمان
کراچی	۱۱۵۹	۷۱۴
حیدرآباد	۱۶۵۹	۶۷۵
تھرپارکر	۶۸۶	۴۵
شکارپور	۲۹۵۶	۱۶۲۸

لوئر کلاس اسکول

نام مقام	تعداد اسکول	تعداد کل طلبہ	ہندو	مسلمان	دوسری قوم
کراچی	۴	۳۷۱	۲۹۴	۷۵	۲
حیدرآباد	۴	۳۰۶	۲۵۰	۵۵	۱
شکارپور	۲	۴۱۰	۳۱۶	۵۴	x

مڈل کلاس اسکول سندھ ڈویژن

مقام	کل تعداد طلبہ	ہندو	مسلمان	دوسری قوم
حیدرآباد فرسٹ کلاس	۲۱۷	۱۴۹	۶	۴۱
" سیکنڈ کلاس	۷۲۹	۵۸۱	۱۱۱	x

ورناکیولر گرلز اسکول

مقام	تعداد اسکول	کل تعداد طالبات	ہندو	مسلم	دیگر
کراچی	۱	۲۸	۱۵	×	۱۳
حیدر آباد	۱	۵۹	۵۴	۵	×
شکار پور	۱	۴۱	۴۱	×	×

انڈیجنس اسکول

مقام	تعداد اسکول	کل تعداد طلبہ	ہندو	مسلم	دیگر
کراچی	۲۵	۴۹	×	۴۹	×
حیدر آباد		۴۰۷	×	۴۰۷	×
شکار پور		۵۹	×	۵۹	×

مندرجہ بالا جدول سے مسلمانان سندھ اور کراچی کی تعلیمی پس ماندگی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے ورناکیولر گرلز اسکول مندرجہ بالا تنین بڑے شہروں میں صرف ۵ مسلمان لڑکیاں زیر تعلیم تھیں. جب کہ فرسٹ کلاس مڈل اسکول میں مسلمان طلبہ کی تعداد ۶ تھی. سال مذکورہ تک کراچی و سندھ میں مسلمانوں کو ابتدائی و ثانوی تعلیم میں کوئی بھی مقام حاصل نہیں تھا. ان تینوں علاقوں میں تین ثانوی اسکول تھے. جن کے ہیڈ ماسٹر ہندو تھے کسی بھی مسلمان میں اتنی اہلیت و قابلیت نہیں تھی کہ کم از کم ایک ہی اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہو جاتا. چنانچہ مسلمانان سندھ و کراچی کی حالت پر ناظم تعلیمات بمبئی نے اپنی سالانہ رپورٹ میں اس طرح گوہر فشانی کی ہے.

"مسلمانوں کی تعلیم کا بہت کچھ انحصار فصلوں پر ہوتا ہے. اگر فصلیں اچھی ہوتی ہیں تو وہ اپنے بچوں کو اسکول بھیجتے ہیں. ورنہ نہیں"

۱۸۸۲ء میں ہنٹر کمیشن کا تقرر کیا گیا جس نے مسلمانان ہند و پاک کی تعلیم پر خاص توجہ دی. اس کے بارے میں ہم پہلے تحریر کر چکے ہیں. جہاں تک عمل کا سوال تھا تو اس کمیشن کی بھی ان سفارشات کو نظر انداز ہی کیا گیا. جن سے مسلمانوں کو فوائد پہنچ سکتے تھے

این جے وی ہائی اسکول میں ہندو طلبہ ۳۵۶ تھے جبکہ مسلمان صرف ۳۸ تھے سینٹ پیٹرک میں ۱۵۶ طلبہ میں مسلمان ۴ تھے.

جیسا کہ ہم بیشتر تحریر کر چکے ہیں کہ سندھ کی تعلیمی حالات پر سیر حاصل بحث کرنے سے ہم قاصر ہیں. صرف خاص خاص واقعات کو ہی اجمالاً ضبط تحریر میں لا رہے ہیں چنانچہ اس سلسلہ میں ہم کو مسٹر جیکیب کے بارے میں تھوڑا بہت لکھنا ضروری ہے. اس سے بیشتر کہ ہم تحریر کریں. پہلے ان کے خیالات ملاحظہ فرمائیے.

"میں نے مساجد کے مکاتب اور مدارس کی جو ہمت افزائی کی ہے اس سے مسلمانوں میں اطمینان اور سکون پیدا ہو گیا ہے. اور مولوی و ملا صاحبان پورے صوبے میں اشتراک و تعاون کر رہے ہیں"۔

ہم کو اندیشہ ہے کہ ناظرین مندرجہ بالا سرکاری بیانوں سے کہیں راہ سے نہ بھٹک جائیں. کیونکہ ان بیانوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مسلمانان سندھ کو تعلیم و تربیت سے کوئی شوق و شفقت نہیں تھا. لیکن حقیقتاً ایسا نہیں تھا جس کا ثبوت مسلمانوں کی داستانِ ماضی ہے. اصل وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو اسی نظام تعلیم سے نفرت تھی جو ان کو اسلام سے منحرف کر کے سرکاری کارندہ بنانا چاہتا تھا. مسلمانوں سے انگریزوں کو کبھی بھی دلچسپی نہیں رہی. البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر کبھی کوئی شریف، نیک اور انصاف پسند انگریز آ جاتا تو وہ مسلمانوں پر توجہ دے لیتا تھا. اور اس کی واپسی کے بعد معاملہ ٹائیں ٹائیں فش. جہاں تک مسٹر جیکیب کا سوال ہے. ہمارے خیال میں وہ نیک. شریف اور انصاف پسند شخص تھا. جیسا کہ اس کے بیانوں سے ظاہر ہوتا ہے. وہ لکھتا ہے.

"جوں جوں میں مسلمانوں کا مطالعہ کرتا ہوں میرے خیالات میں تبدیلی آتی جاتی ہے. یعنی مسلمان تعلیم کا مخالف نہیں ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ ہر گاؤں میں ایک مسجد ضرور ہوتی ہے. اور پھر ہر مسجد میں ایک مدرسہ جس میں لڑکے اور لڑکیاں تعلیم حاصل کرتے ہیں تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ استاد کی عزت اور دیگر اخلاقی خوبیوں پر بھی توجہ دی جاتی ہے جو لوگ ان اداروں کو چلا رہے ہیں. اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تعلیم کی اہمیت و افادیت سے بخوبی واقف ہیں"۔

انگریزوں نے ہند و پاک پر اقتدار حاصل کرنے کے بعد اگرچہ لاتعداد کمیشن. رپورٹیں. اور کمیٹیاں قائم کیں مثلاً ہنٹر کمیشن. سیڈلر کمیشن. ہارٹگ کمیٹی. سارجنٹ

رپورٹ وغیرہ جو اس ملک کی تاریخ تعلیم میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر رپورٹ یا کمیشن کا مقصد صرف مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ ہم نے مندرجہ بالا سطور میں سندھ کی تعلیمی حالت کا مختصراً تذکرہ کر دیا ہے۔ اب ہم سندھ میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ اور سندھ مدرستہ الاسلام کے کارناموں کو نہایت اختصار سے پیش کر رہے ہیں۔

سندھی مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ

اور

سندھ مدرستہ الاسلام کا قیام

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کا قیام سر سید احمد خان مرحوم کی کوششوں سے وجود میں آیا جس کا پہلا اجلاس علی گڑھ میں ہوا۔ کانفرنس کے مقاصد مسلمانانِ ہند کی تعلیمی۔ ثقافتی اور لسانی پہلوؤں میں اصلاح کرنا۔ ساتھ ہی ساتھ سیاسی شعور پیدا کر کے ان کے تمام مسائل کا سدباب کرنا۔ کانفرنس مسلمانانِ ہند کو علوم جدید سے روشناس کر کے آنے والی نسلوں کو بدلتے ہوئے حالات سے مقابلہ کرنے کے قابل بنانا بھی تھا۔

مقاصد میں کامیابی و کامرانی حاصل کرنے کے لیئے کانفرنس نے ہندو پاک کے مختلف مقامات پر جلسے کئے تاکہ لوگوں میں بیداری پیدا ہو۔ تعلیمی اداروں کو بھی قائم کیا گیا تاکہ آئندہ نسل کو ایسی تعلیم دی جائے جو قومی مفادات کے لئے فائدے مند ہو۔ جیسا کہ ہم پیشتر قلم بند کر چکے ہیں کہ انگریزوں نے دیگر علاقوں کی طرح سندھ کے مسلمانوں کو بھی نیست و نابود کرنے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ یہاں پر جو علوم شرقیہ کے ادارے یعنی مکاتب و مدارس تھے جن میں چھوٹے بچے مسجد اور بڑے مکاتب میں دینی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ سندھی جو مادری زبان تھی۔ وہ بھی کسمپرسی کے عالم میں تھی چنانچہ انگریزوں نے سندھی کا سہارا لے کر اس علاقہ سے فارسی و عربی کو ختم کیا اور پھر رفتہ رفتہ سندھی کی جگہ انگریزی نے لے لی۔

انگریزی تعلیم ضروریات زندگی اور اسلامی نظریہ حیات کے خلاف ہے۔ سندھ جس کو یہ امتیاز ہے کہ اسلام کی کرنیں سب سے پیشتر اسی علاقہ میں جلوہ گر ہوئی۔ وہ بھلا کیسے اس

تبدیلی کو گوارا کر لیتا۔ چنانچہ اس خطہ کے عوام نے جان قربان کرنا تو سیکھا لیکن دنیاوی آرام و سکون کی خاطر اپنی ثقافت تہذیب و تمدن کا جنازہ نکالنا گوارہ نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانان سندھ کی حالت دن بدن بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کچھ انگریز ایسے بھی تھے جو انگریزوں کی اس تباہ کن اور دو غلی پالیسوں کے خلاف تھے چنانچہ انہوں نے مسلمانان سندھ کی اصلاحات کی کوششیں کیں۔ اور ان کو تعلیم کی اہمیت و افادیت سے آگاہ کیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے مسلمانوں کو متنبی کیا کہ اگر وہ اپنی و اپنی قوم کی فلاح چاہتے ہیں تو اپنے بچوں کو ضرور بالضرور زیور تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کریں۔ اگر وہ اپنے بچوں کو انگریزوں کے قائم شدہ اداروں میں بھیجنا گوارہ نہیں کرتے تو خود ادارے قائم کریں۔

جیسا کہ تحریر کیا جا چکا ہے کہ مسلمانان سندھ کی حالت نہایت ہی ناگفتہ بہ تھی ہندو جو انگریزوں کے محبوب اور نور نظر تھے وہ مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی فکر میں تھے ہند اور انگریزوں کے گٹھ جوڑ سے ان کی پریشانیوں اور مصیبتوں میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ایسے وقت میں ایک ایسے مصلح مسیحا اور رہبر کی ضرورت تھی۔ جو اپنا سب کچھ نچھاور کر کے ان کو راہ راست پر لگا سکے اللہ تعالیٰ کا نظام بھی خوب ہے وہ وہی کرتا ہے جس کی اس کے بندوں کو ضرورت ہوتی ہے چنانچہ سندھ میں بھی ایسا ہی ہوا۔ خدائے بزرگ و برتر نے اس کام کی تکمیل کے لئے حسن علی کو اس جہان ناپائیدار میں بھیجا۔ جس نے اس علاقہ کے مسلمانوں کو بام عروج پر پہونچانے کے لئے وہی کارنامے انجام دیئے جو پاک و ہند کے لئے سرسید احمد خاں نے کئے ہیں۔ اس لئے اگر ہم اس شخص کو اس علاقے کا سرسید کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

۱۴ اگست تاریخ عالم میں عام طور سے اور تاریخ اسلام میں خاص طور سے اپنی اہمیت و افادیت کی حامل ہے۔ یہی وہ دن ہے جبکہ دنیائے اسلام کی سب سے عظیم مسلم مملکت وجود میں آئی۔ یہی وہ دن ہے جبکہ حسن علی کی حیدر آباد میں پیدائش ہوئی۔ فرق صرف سن کا ہے۔ اول الذکر ۱۹۴۷ء کا واقعہ ہے جبکہ موخر الذکر ۱۸۳۰ء کا۔ حسن علی کے والد کا انتقال بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ چنانچہ ان کی پرورش انکے بڑے بھائی نے کی۔ دستور کے مطابق فارسی، عربی اور قرآن پاک کی تعلیم سے فارغ ہو کر "جھرک" میں بحیثیت ٹول ٹیکس کلرک مبلغ پندرہ روپیہ ماہوار پر ملازمت کر لی۔ کچھ عرصہ بعد وہ نوشیرہ کے ڈپٹی کلکٹر کے دفتر میں مبلغ پچیس روپیہ

ماہوار پر ملازم ہو گئے۔ دوران ملازمت ان کی دوستی ایک عیسائی کلرک سے ہو گئی۔ جس سے ان کو انگریزی پڑھنے کا موقع ملا۔ وقت گزرتا رہا۔ حسن علی ترقی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ "کوٹری" چلے گئے۔ جہاں پر ان کی ملاقات کراچی کے چیف جج مسٹر میڈلٹن سے ہوئی۔ موصوف ان کی صلاحیت، قابلیت اور ذہانت سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان کو کورٹ میں "سررشتہ دار" کے عہدے کی پیشکش کی جس کو انہوں نے فوراً ہی قبول کر لیا۔ محنت، ایمانداری، خدمت اور ذہانت سے حسن علی نے میڈلٹن کے دل میں گھر کر لیا۔ اور اس طرح بغیر امتحان پاس کئے ان کو وکالت کی اجازت دیدی گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ کراچی میں کوئی دوسرا مسلمان وکیل نہیں تھا۔

ہند و پاک کے مایۂ ناز اور مشہور و معروف بیرسٹر اور پریوی کونسل کے ممبر سید امیر علی کے نام نامی سے کون ہے جو واقف نہیں۔ موصوف کسی مقدمہ کے سلسلہ میں کراچی تشریف لائے۔ اور اس طرح ان کی ملاقات حسن علی سے ہوئی۔ دونوں قوم کے درد سے سرشار تھے۔ اور ہندوؤں کی پالیسیوں سے نالاں۔ دوران گفتگو مسلمانان سندھ کی حالت بھی زیر بحث آئی اور یہ طے پایا کہ کراچی میں بھی "محمڈن ایسوسی ایشن" کی شاخ قائم کی جائے۔ حسن علی نے اتفاق کیا اور اس طرح یہ سندھ مدرسہ بورڈ اور سندھ مدرسۃ الاسلام کو قائم کرنے پر غور کرنے لگے۔ حسن علی کا مقصد مسلمانان سندھ کو ان کی قابل رحم حالت سے آگاہ کرکے ان میں ایسی تڑپ پیدا کرنا مقصود تھا کہ وہ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو تبدیل کرکے راہ ترقی پر گامزن ہو سکیں۔

ان کی خدمات سے متاثر ہو کر کراچی میونسپل بورڈ نے ان کو ممبر بنا لیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ صوبہ کی گورنر کاؤنسل کے ممبر بھی رہے۔ چنانچہ ۱۸۹۳ء میں حکومت انگلستان نے ان کو "خان بہادر" کا خطاب عطا کیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ حکومت ترکی نے ان کی خدمات کے صلے میں ان کو "بے آفندی" اور "مجیدی" کے اعزازات بھی دیئے۔ ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ لیکن شمس الدین۔ طیب جی۔ اخوند حبیب اللہ۔ مرزا علی بیگ۔ ہز ہائی نس آغا علی شاہ سیٹھ غلام حسین چھاگلہ۔ مرزا آصف۔ سردار محمد یعقوب اور مولوی اللہ بخش خاص الخاص تھے۔

حسن علی بے آفندی جو صوبہ سندھ کے مفکر تعلیم اور سندھ مدرسہ بورڈ اور سندھ مدرسۃ الاسلام کے بانی مبانی تھے۔ انہوں نے ۶۵ سال کی عمر میں اس دنیا فانی سے کوچ کیا۔ اور وہ ایک ایسی شمع روشن کر گئے جس نے رفتہ رفتہ پورے سندھ کو منور کر دیا۔

جیسا کہ ہم تحریر کر آئے ہیں کہ کراچی میں " انجمن اسلام ۱۸۸۴ء میں قائم کی گئی جس کا مقصد مسلمانان سندھ کی اصلاحات تھیں۔ سر سید احمد خان پورے برصغیر میں مسلمانان ملک کی فلاح و بہبود کے لئے کوشاں تھے۔ چنانچہ ۱۸۸۵ء میں خان بہادر حسن علی نے علی گڑھ کا سفر کیا۔ اور سید احمد خان کو اپنے خیالات و افکار سے آگاہ کیا۔ اتنا ہی نہیں۔ بلکہ وہ علی گڑھ کالج کے پرنسپل مسٹر تھیوڈر بیک اور ان کے نائب مسٹر موریسن سے بھی ملے اور واپس آکر انہوں نے کراچی میں سندھ مدرسۃ الاسلام اور سندھ مدرسہ بورڈ کو قائم کیا۔ اس بورڈ کے ممبر درج ذیل تھے۔

۱۔ کے۔ بی حسن علی آفندی صدر۔ ۲۔ کے۔ بی۔ نجم الدین نائب صدر۔ ۳۔ سیٹھ فتح محمد۔ ۴۔ کے بی خداداد خاں۔ ۵۔ کے۔ بی۔ ولی محمد حسن علی۔ ۶۔ کے۔ بی۔ علی محمد حسن علی۔ ۷۔ سیٹھ علی بھائی کریم جی۔ ۸۔ سیٹھ غلام حسین چھاگلہ۔ ۹۔ سیٹھ نور محمد لائق۔ ۱۰۔ سیٹھ صالح محمد عمر ڈوسل۔ ۱۱۔ سیٹھ غلام حسین خالق دینا۔ ۱۲۔ شہزادہ محمد یعقوب۔ ۱۳۔ سردار محمد یعقوب شیخ محمد اسماعیل۔

سندھ مدرسۃ الاسلام حقیقتاً ایک تحریک تھی جس کے ویسے تو لاتعداد مقاصد تھے۔ چند مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ مسلمانان سندھ میں بیداری پیدا کرنا۔ ۲۔ مسلمانانِ سندھ کی تعلیمی اصلاحات کرنا۔ ۳۔ اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی شعار سے بچوں کو آگاہ کرنا۔ ۴۔ علمی ترقی و ترویج کے ساتھ ہی ساتھ عربی۔ فارسی اور قرآن پاک کی تعلیم کا مناسب انتظام و انصرام کرنا۔ ۵۔ علی گڑھ کی طرح طلبہ کو ارکان اسلام پر راغب کرنا۔ مثلاً روزہ نماز۔ ۶۔ مغرب و مشرق کے علوم کو حاصل کر کے علاقہ کے لوگوں کو اس قابل بنانا کہ وہ اپنی انفرادیت قائم رکھ سکیں۔ وغیرہ

چنانچہ اس تحریک کو عملی شکل دینے کے لئے موصوف نے ایک اقامتی مدرسہ جو سندھ مدرسۃ الاسلام کے نام سے موسوم ہے اور ایک بورڈ قائم کیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ تعلیم نسواں کے لئے بھی ایک گرلز اسکول قائم کیا۔

سب سے اہم مسئلہ مقام کا تھا۔ کراچی میں میونسپل بورڈ نے صنعت و حرفت اور تجارت کی نقل و حمل کے لئے ایک قافلہ سرائے ہموار کی تھی جو شہر کے وسط میں واقع تھی۔ جب قافلے چلا کرتے تھے تو تاجر معہ اونٹ گاڑیوں کے اس میں آکر ٹھہرا کرتے تھے یہ کافی کشادہ جگہ

تھی۔ اس کے دروازے پر خلافت عباسیہ کا ہلال موجود تھا لیکن ریل گاڑی کی ایجاد سے یہ سرائے بیکار ہو گئی تھی چنانچہ ایک دن جب حسن علی اس طرف سے گذر رہے تھے۔ ان کی نظر اس پر پڑی چنانچہ انہوں نے طے کر لیا کہ وہ اس میں ہوسٹل قائم کریں گے۔ بڑی کوششوں کے بعد میونسپلٹی نے مبلغ پچھتر روپیہ ماہوار کرائے پر اس کو دیا ہم اس کی تفصیل کو نظر انداز کر رہے ہیں اب جگہ کے بعد ایسے شخص کی ضرورت تھی جو بحیثیت پرنسپل کام کر سکے اس وقت سندھ میں صرف تین مسلمان ہی۔ بی۔ اے پاس تھے۔ جو سرکاری ملازم تھے۔ چنانچہ پنجاب سے عمر دین۔ ایم۔ اے کو بلایا گیا جو اس کے سبب سے پہلے پرنسپل ہوئے مدرسہ اور بورڈ کے قیام کے بعد مصائب و آلام کا سیلاب امنڈ آیا لیکن حسن علی ایسے شخص نہ تھے جو ان چیزوں سے مرعوب ہوتے۔

پہلا مسئلہ عوام کی مخالفت تھی۔ مولوی ملاؤں کے تحت سندھ میں بہت سے نجی ادارے قائم تھے۔ وہ کسی طرح ان سے دست بردار ہونا نہیں چاہتے تھے مسلمانان سندھ تعلیم کو پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ حسن علی نے اپنی آواز عوام تک پہونچانے کے لئے ایک اخبار "معاون مجموعہ محمدیؐ" کو جاری کیا جس کے ایڈیٹر شمس الدین بلبل تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وقتاً فوقتاً وہ جلسے بھی کرتے جس میں وہ تعلیم کی اہمیت اور افادیت پر مدلل روشنی ڈالتے۔ حقائق بہرحال حقائق ہیں چنانچہ رفتہ رفتہ مخالفین کی تعداد کم اور موافقین کی تعداد بڑھنے لگی۔ اور اس طرح یہ تحریک دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگی۔

دوسرا مسئلہ روپیہ کا تھا۔ اس کے لئے حسن علی نے دورے کئے۔ لوگوں کو اپنے کام اور مشن کی اہمیت سے آگاہ کیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ امرا، روسا اور نوابین کو خطوط بھی لکھے۔ چنانچہ مخیر حضرات نے اس کی بھرپور مدد کی۔ ساتھ ہی ساتھ ایسے ذرائع بھی اپنائے گئے کہ کم روپیہ اور کام زیادہ ہو سکے۔ مثلاً ایسے معلمین کا تقرر کیا گیا جو کم سے کم معاوضہ پر کام کرنے کو تیار ہوں۔ ترسنگ داس جو بمبئی بینک میں اکاؤنٹنٹ تھے۔ ان کو حساب کتاب کی جانچ کے بدلہ مبلغ سو روپیہ سالانہ دیئے جاتے تھے۔ تاکہ وہ روزانہ ایک یا دو گھنٹہ آکر کام کر دیا کریں۔

ویسے تو ایسے لوگوں کی تعداد وافر ہے جنہوں نے اس ادارے کی مالی مدد کی لیکن خیرپور ریاست۔ سردار محمد یعقوب، وڈیرا الٰہی بخش بھٹو۔ حاجی عبداللہ ہارون اور میر غلام علی چھاگلہ کے نام قابل بیان ہیں اتنا ہی نہیں بلکہ حسن علی نے پورے ہند کا دورا کیا۔ جس

میں آپ کو کافی دولت ملی۔ نظام حیدر آباد دکن نے دل کھول کر مدد کی۔ کراچی میونسپل بورڈ نے بھی ہزار روپیہ سالانہ کی گرانٹ دینی شروع کی۔ سنہ ۱۸۸۶ء میں مسٹر ہنٹر نے اس مدرسہ کا معائنہ کیا اور کہا۔

"سندھ میں مسلمانان سندھ کے تعلیمی مسائل کو مدرسۃ الاسلام نے حل کر کے حکومت کو بہت بڑی ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا ہے۔"

ہنٹر کے بعد ڈاکٹر لولین اور مسٹر ڈیوس نے بھی مدرسہ کا معائنہ کر کے اس کو "گرانٹ ان ایڈ" دی۔ اور جب سے ہی یہ اسکول ایڈ پر چلا آرہا ہے لیکن قومی ملکیت قرار دینے کے بعد اس مدرسہ کی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے مرکزی حکومت نے اس کو اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔

سندھ مدرسہ بورڈ اس بات کا متمنی تھا کہ اس کو مسلم کالج بنایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے سربراہ کو ہیڈ ماسٹر نہیں بلکہ پرنسپل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے مسٹر وائن کا دور اس مدرسہ کی تاریخ میں خاص اہمیت اور افادیت کا حامل ہے۔ انہوں نے مسلمانان سندھ کی تعلیم کی ترقی و ترویج میں خدمات انجام دی ہیں۔ مثلاً نادار، غریب مسکین و ذہین طلبہ کو نوازنے کے لئے مختلف طریقوں کو اپنایا۔ جیسے فیس معاف، کپڑوں کا انتظام، وظائف اور کتب وغیرہ دینا۔ مسٹر وائن صرف پانچ سو روپیہ ماہوار تنخواہ لیا کرتے تھے۔ اور ہمیشہ موسم گرما کی چھٹیوں میں سندھ اور ملک کے دیگر علاقوں کے دوروں پر جاتے تاکہ زیادہ سے زیادہ فنڈ اکٹھا کیا جا سکے۔ اگرچہ وہ غیر ملکی تھے لیکن ان کے کارنامے قابلِ تحسین ہیں۔

ان تمام کوششوں کے باوجود بھی مسلمانان سندھ کی حالت میں خاطر خواہ تبدیلیاں نہیں ہوئیں۔ چنانچہ سنہ ۱۹۰۲ء میں سر آغا خان مرحوم کی صدارت میں دہلی میں مسلمانان ہند و پاک کا تاریخی اجتماع ہوا۔ تو اس میں جناب علی محمد خان دہلوی نے کانفرنس کی توجہ مسلمانانِ سندھ کی طرف مبذول کرائی جس میں محسن الملک کی کوششوں سے درج ذیل سفارشات منظور ہوئیں۔

"کانفرنس کو لازم ہے کہ سندھ تک اپنے دائرہ کار کو وسیع کر کے مسلمانان سندھ کے ساتھ تعاون کرے اور جو جماعت وہاں پر تعلیمی اصلاحات کی کوشش کر رہی

ہے اس کی مدد کرے"۔

اسی طرح سنہ ۱۹۰۶ء میں ایجوکیشنل کانفرنس جب ڈھاکہ میں ہوئی تو اس میں سندھ کے نمائندے جناب سردار محمد یعقوب خان نے اس علاقے کی نمائندگی کی اور جس وقت انہوں نے اپنے علاقہ کی رپورٹ پیش کی تو سامعین کے آنسو نکل آئے۔ انہوں نے فرمایا۔

"کسی علاقہ یا حصہ کی تعلیمی حالت اس قدر پراگندہ اور ابتر نہیں ہوگی جتنی سندھ کی ہے۔ حال یہ ہے کہ دو سو گریجوئیٹس کے مقابلے میں پورے سندھ میں صرف دس مسلمان بی۔ اے پاس ہیں۔ ان میں ایک دو کے علاوہ باقی سب غیر سندھی ہیں"۔ سال گذشتہ انٹرنس کے امتحان میں ایک سو بیس طلبہ نے شرکت کی جس میں صرف بارہ مسلمان تھے۔

یہ عالم تھا جبکہ ایک طرف انگریز اور ہندو مسلمانوں کے استحصال کے لئے کوشاں تھے اور دوسری طرف سندھ مدرسۃ الاسلام کی تحریک اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے سردھڑ کی بازی لگا رہی تھی۔ جیسا کہ تحریر کیا جا چکا ہے کہ مدرسہ کی تعمیر میں نظام دکن نے مبلغ چار ہزار، ریاست جوناگڑھ نے دس ہزار اور ہز ہائی نس میر آف خیرپور نے پرنسپل کے بنگلے کے لئے نیز تالپور ہاؤس کے واسطے عطیے ہی نہیں دیئے بلکہ چھ ہزار روپیہ سالانہ کی گرانٹ بھی منظور کی۔ بشرطیکہ پرنسپل انگریز ہو۔ اس طرح مدرسہ کی عمارت پر ۱۸۵۷۰۹ روپیہ ۱۴ آنے ۶ پائی خرچ ہوا۔ جو ۱۹۳۵ء تک قریباً بارہ لاکھ ہوگیا۔ میران سندھ کے بچوں کی تعلیم کے لئے اس میں تالپور ہاؤس کے بعد خیرپور ہاؤس بنایا گیا۔ اس مدرسہ کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہائی اسکول کے نصاب کے علاوہ سندھی۔ اردو گجراتی اور قرآن پاک کی تدریس کا مناسب انتظام ہے جہاں تک اس کی ترقی کا سوال ہے تو سنہ ۱۹۱۶ء میں یہاں پر صرف ۵۰۳ طلبہ تھے جن میں چند یہودی تھے بورڈنگ ہاؤس و بورڈ بڑے خلوص، محنت اور دیانتداری سے کام کر رہے ہیں اس بورڈ کے تحت سندھ مسلم آرٹس، سائنس اور لا کالج قائم ہیں۔ ایک گرلز انٹر کالج اور لیاری میں بھی ایک اسکول چل رہا ہے اس وقت اس میں اٹھارہ سو طلبہ زیر تدریس ہیں جس میں تمام گروپس میں تعلیم و تربیت کا انتظام ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ذریعہ تعلیم گجراتی۔ سندھی اور اردو تینوں زبانوں میں ہے۔

اس تحریک نے مسلمانان سندھ کو خواب غفلت سے بیدار کر کے ان میں تعلیم و تربیت

سے محبت والفت پیدا کی جس کا ثبوت یہ ہے کہ لاڑکانہ میں ایک مدرسہ بمعہ بورڈنگ ہاؤس قائم کیا گیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جناب محمد علی خان کی کوششوں سے لوکل ایجوکیشنل کانفرنس کی سرگرمیوں میں مزید اضافہ ہوا اور پھر حیدر آباد میں ایک اقامتی مدرسہ قائم کیا گیا اسی طرح تھرپارکر۔ ٹھٹارو۔ اور سکھر وغیرہ میں بھی مدارس قائم کئے گئے یہاں یہ بات بھی قابل بیان ہے کہ مولانا حالی مرحوم کی زیر صدارت جو کانفرنس کا اجلاس کراچی میں ہوا تھا۔ جس میں تقریباً تیرہ سو نمائندوں نے شرکت کی تھی۔ اس میں مولانا نے فرمایا تھا۔

"سندھ کے مسلمانوں میں صرف انگریزی کی کمی نہیں ہے۔ بلکہ عربی، فارسی اور سندھی کا بھی یہی حال ہے۔ کہ فی صد ایک یا دو سے زیادہ نوشت وخواند نہیں کر سکتے۔ ہندوؤں میں فارسی اور انگریزی دونوں مروج ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ تمام نوکریوں پر ان کا ہی قبضہ ہے"۔

کانفرنس کے اجلاس میں تعلیمی تجاویز پر بھی غور وخوض کیا گیا۔ اور ایسے طریقوں کو اپنانے کی سفارش کی گئی جن سے اس علاقہ میں تعلیم وتعلم میں فروغ ہو۔ ان میں سب سے اہم تعلیمی ٹیکس کا اجرا تھا۔ چنانچہ اس ضمن میں۔

"سندھ میں مسلمانان سندھ کی ترقی کیلئے روپیہ کی ازحد ضرورت ہے اسلئے کانفرنس گورنمنٹ سے پرزور سفارش کرتی ہے کہ مسلمان زمینداروں پر مال گزاری پر فی روپیہ تین پائی ٹیکس وصول کیا جائے اور اس طرح جو روپیہ وصول ہو وہ سندھ کے مسلمانوں کی تعلیم وترویج پر خرچ ہو"۔

چنانچہ کانفرنس کی جدوجہد سے صوبائی حکومت نے پیسہ ٹیکس کا بل منظور کیا۔

تحریک مدرسۃ الاسلام کا یہ اثر ہوا کہ دیگر افراد وجماعتوں نے بھی حکومت کی پالیسیوں کو نظر انداز کر کے تعلیم کے فروغ اور ترویج کے لئے کوشش شروع کیں۔ ان میں سب سے قابل ذکر خدمات "اوکھائی" اور میمن جماعتوں کی ہیں۔ طیب علی علوی مرحوم نے بھی اس ضمن میں قابل ستائش خدمات کیں۔ انہوں نے دیگر کاموں کے علاوہ مدرسہ والا گرلز ہائی اسکول شیخ جیون جی گرلز اسکول وغیرہ قائم کئے۔

اس تحریک سے گورنمنٹ کی پالیسی میں بھی نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء سے گورنمنٹ نے مقررہ کردہ لازمی کمیٹی کی رپورٹ کو ایکٹ کی شکل دیدی۔ سندھ اور کراچی میں اردو

نوازی کا جذبہ اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ صوبہ بمبئی کے "اردو آمیز" اور خاص اردو اسکولوں کی مشترکہ تعداد ۸۴۰ تھی جس میں ۵۰۵ مدارس نے اردو کو اولیت کا درجہ دیا تھا جبکہ ۲۹ نے اردو کو ثانوی حیثیت دی رکھی تھی۔

رفتہ رفتہ یہ تحریک عوام میں مقبول ہوتی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد پورے سندھ میں مدارس کا جال پھیل گیا چنانچہ اپر سندھ میں ۲، لڑکوں کے پانچ میونسپل پرائمری جن میں دو لڑکوں اور دو لڑکیوں کے۔ ایک ٹیکنیکل اسکول قائم ہوا۔ ضلع سکھر میں مسلمان بچوں کا اوسط ۴۴ فیصد ہو گیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ماتلی، منگھوازی۔ اور میرپور میں بھی مسلمان بچوں کے لئے چھوٹے چھوٹے اقامتی اسکول قائم کئے گئے۔ سکھر میں مسلمانان سکھر نے سندھ بورڈ کراچی کی طرح ایک بورڈ قائم کیا جس کا مقصد مسلمانوں کو بیدار کر کے ان میں تعلیم کے لئے لگن اور شوق پیدا کرنا تھا حیدرآباد میں بھی قابل ذکر اضافہ ہوا جو ترقی کرتے کرتے ۴۳ فیصد ہو گیا۔ یہی حال نواب شاہ کا بھی تھا۔ جہاں پر ۲۷ فیصد کا اضافہ ہوا۔ لاڑکانہ کے شہری بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے اور انہوں نے سندھ مدرسہ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا:

ہم نے محمد بن قاسم سے لیکر قیام پاکستان تک کی تعلیمی تاریخ کا مختصراً خاکہ پیش کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں ہماری ناچیز رائے یہ ہے کہ اس تحریک سے جو قابل ذکر ترقی و توسیع ہوئی تھی۔ اس کا ایک گوشوارہ پیش کر دیں تاکہ ناظرین کو اس تحریک کے اثرات کا مختصراً اندازہ ہو سکے۔

نمبر شمار	اقسام تعلیم	تعداد مدارس		تعداد طلبہ		تعداد اساتذہ	
		لڑکے	لڑکیاں	لڑکے	لڑکیاں	لڑکے	لڑکیاں
۱۔	ابتدائی تعلیم	۱۳۱	۵۸	۱۷۴۲۸	۱۴۲۴۹	۵۱۰	۲۰۲
۲۔	ثانوی تعلیم	۲۴	۱۹	۹۹۹۹	۱۷۸۴	۵۰۵	۳۰۶
۳۔	کالج	۴	۱	۱۷۹۶	۱۷۵	×	نامعلوم
۴۔	ٹریننگ کالج	×	×	×	×	×	×
۵۔	میڈیکل کالج	ایک		۱۳۰	۷		نامعلوم
۶۔	لاء کالج	ایک		۱۷۰			نامعلوم

اس دور میں تعلیم پر ۵۹۱۱۶۷ روپیہ خرچ ہوا۔

کون جانتا تھا کہ محمد بن قاسم نے جس خطہ کو ۷۱۲ء میں اسلامی نظریہ حیات سے

منور کیا تھا وہ مقام ۱۲۳۵ سال کے بعد ایک بار پھر دنیائے اسلام کی سب سے عظیم سلطنت کا دارالخلافہ بن کر پیغام اسلام سے پورے عالم کو دعوت فکر دے گا۔ پاکستان کے قیام کے بعد سارے ہندوستان سے مسلمان گروہ در گروہ اپنا سب کچھ لٹا کر اس خطہ کو رونق افروز بنانے کیلئے آنے شروع ہوئے۔ انہوں نے اس وطن عزیز کے لئے جو قربانیاں دیں۔ ان کا تذکرہ محال ہے۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ یہ انہیں کا ثمر ہے کہ جو بیداری۔ اور تعلیمی ترقی اس خطہ پاک میں موجود ہے وہ کسی دوسرے میں نہیں۔ ناظرین اس حقیقت کا اندازہ درج ذیل گوشوارہ سے باآسانی لگا سکتے ہیں یہ ۶۵-۱۹۶۴ء کا ہے۔

نمبر شمار	قسم تعلیم	تعداد مدارس		تعداد طلبہ		تعداد اساتذہ	
		لڑکے	لڑکیاں	لڑکے	لڑکیاں	مرد	خواتین
۱.	ابتدائی تعلیم	۷۷۵	۱۹۶	۱۶۷۲۷۳	۷۳۱۴۷	۵۷۱۱	۱۷۴۷
۲.	ثانوی تعلیم	۱۵۹	۹۵	۶۲۶۳۵	۲۶۹۹۶	۱۲۵۱۸	۱۳۳۹
۳.	کالج	۲۹	۱۵	۲۵۵۱۳	۷۳۹۷		
۴.	ٹریننگ کالج	ایک		۱۰۰	۱۹۹		
۵.	میڈیکل کالج	ایک		۸۱۶	(دونوں)		
۶.	قانون			۳۸۵			
۷.	انجینرنگ			۹۳۶	(دونوں)		
۸.	کامرس			۷۳۵			
۹.	ہوم اکنامکس				۴۶۰		

اس دور میں ۲۶۲۰۴۰۰۰ روپیہ صرف وظائف ۱۹۶۲ء ۱۸۶۱۴۲ - روپیہ

〃 ۱۹۶۳ء ۳۱۱۹۴۰ - 〃

〃 ۱۹۶۴ء ۸۲۹۰۰۰ - 〃

اب ذرا دوسرے گوشوارے پر بھی نظر ڈالئے جس میں سرکاری۔ غیر سرکاری۔ مدارس تعداد اساتذہ اور طلبہ کا کراچی میں توسیع و ترویج پیش کی گئی ہے۔

قسم تعلیم	سرکاری مدارس			غیر سرکاری مدارس			تعداد سرکاری اساتذہ	غیر سرکاری اساتذہ
	مردانہ	زنانہ	کل تعداد	مردانہ	زنانہ	کل تعداد	مرد اور خواتین	مرد اور خواتین
ابتدائی تعلیم	۲۸۷	۱۳۵	۴۲۲	۴۸۸	۶۱	۵۴۹	۲۱۱۹	۴۳۳۹
ثانوی تعلیم	۵۱	۲۸	۷۹	۱۰۴	۶۷	۱۷۱	۱۴۱۵	۲۴۴۲
کالج	۷	۱	۸	۲۲	۱۴	۳۶	۴۰۴	۱۴۰۴

اب ملاحظہ فرمائیے تعداد طلبہ و طالبات:۔

قسم تعلیم	سرکاری مدارس	غیر سرکاری مدارس	کل تعداد
ابتدائی تعلیم	۱۲۵۶۱۷	۱۱۴۸۰۳	۲۴۰۴۲۰
ثانوی تعلیم	۳۴۱۱۷	۵۵۰۱۴	۸۹۱۳۱
کالج	۸۲۳۶	۲۲۶۷۴	۳۰۹۱۰

اگر مندرجہ بالا اعداد و شمار کا مقابلہ و موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ تحریک جس کو حسن علی نے جنم دیا وہ قیام پاکستان کے بعد حقیقت میں تبدیل ہوگئی۔ اور اگر ہم دور اندیشی عقلمندی۔ صبر و تحمل سے کام لیتے تو وہ دن دور نہیں تھا جبکہ خطہ محمد بن قاسم پاکستان کے لئے ہی نہیں بلکہ تمام عالم اسلام کے لئے مثالی بن جاتا۔ آج جو حالت سندھ اور خاص طور سے کراچی کی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ یہ وہ خطہ پاک ہے جو اپنی انفرادیت اور اہمیت کا مالک ہے لیکن جو کچھ عملاً ہو رہا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

سندھ میں تعلیم کے انتظامی ڈھانچہ کا تاریخی جائزہ

سندھ کا علاقہ انتظامی امور میں صوبہ بمبئی کا حصہ تھا۔ پونا میں ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن کا دفتر تھا۔ سندھ کا ایجوکیشن کا انتظام و انصرام ایک ایجوکیشنل انسپکٹر کے سپرد تھا جس کا قیام کراچی میں رہتا تھا۔ یہاں پر تعلیمی امور کا کنٹرول گورنمنٹ کے احکام محررہ ۶ دسمبر ۱۸۹۴ء کے تحت تھا۔ جس کو بمبئی میونسپل ایکٹ ۱۸۷۳ء کی ترمیم و تنسیخ کے بعد جاری کیا گیا تھا۔ اس کے مطابق:۔

۱۔ ہر میونسپل بورڈ ایک اسکول قائم کرے گا۔ ۲۔ انتظامی امور میں ترمیم و تبدیلی۔ اساتذہ کے اسکیل گریڈ۔ طریقہ کار۔ ڈیپارٹمنٹ کے احکام تعلیمی کوڈ برائے ورناکیولر ٹیچرز

ٹریننگ کالجز اور امدادی گرانٹ کے ضابطوں کے مطابق کرے گی۔ ۳۔ داخلہ میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ سرکاری افسران جس وقت چاہیں معاینہ کرسکیں گے ۴۔ ہر میونسپل بورڈ پابند ہوگا کہ وہ اپنے تعلیمی میزانیہ کی ایک کاپی انسپکٹر کو بھیجے۔ ۵ تعلیمی رقم میونسپل بورڈ کے دیگر اخراجات سے الگ رہے گی۔

۱۹۰۶ء میں ڈویژنل انسپکٹر کا تقرر عمل میں آیا جس کے مطابق اس کی مدد کے لئے ایجوکیشنل انسپکٹران تعینات کیئے گئے۔ اور پھر ہر انسپکٹر کے تحت تین ڈپٹی اسسٹنٹ مقرر کیئے گئے۔ ان میں ایک مسلمان ہوتا تھا جو صرف اردو ذریعہ تعلیم کے اسکولوں کی دیکھ بھال کے لئے مخصوص تھا لیکن اس کو اختیارات بالکل نہیں تھے۔

جہاں تک اساتذہ کے اسکیل اور گریڈ کا سوال ہے تو یہ بھی مختلف تھے۔ ورناکیولر اساتذہ اور استانیوں کے کوڈ مجریہ ۱۹۱۱ء گورنمنٹ آف بمبئی کے تحت مراعات حاصل تھیں جن میں سے کچھ یہ ہیں۔

۱۔ مدرس دوران ملازمت کوئی کام نہیں کرسکتا۔ ۲۔ ٹیوشن کی بھی اجازت نہیں تھی۔

۳۔ اساتذہ ملکی سیاست میں بھی حصہ نہیں لے سکتے۔

۴۔ اساتذہ بچوں کی صحت وصفائی کا خیال رکھیں۔ ۵۔ ہیڈ ماسٹر اسکول کے سامان کا ذمہ دار تھا۔ ۱۹۱۱ء کے کوڈ کے بعد ۱۹۳۱ء کا کوڈ بہت ہی اہم تھا جس کی پابندیاں درج ذیل ہیں۔

۱۔ بغیر اجازت اساتذہ کوئی دوسرا کام نہیں کرسکتے۔ ۲۔ دو گھنٹہ کا ٹیوشن کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ اساتذہ سیاسی پارٹیوں میں شریک نہیں ہوسکتے۔

۴۔ معلمین مقامی جھگڑوں میں حصہ نہیں لے سکتے۔

۵۔ الیکشن میں بھی حصہ نہیں لے سکتے۔

ان کے بعد امدادی رقوم کے سلسلے میں کئی قواعد وضوابط کی تکمیل و تشکیل کی گئی۔ اس کی خاص خاص دفعات درج ذیل ہیں۔

۱۔ سال نو یکم اپریل سے شروع ہوتا ہے۔ گرانٹ کی درخواست چھ ماہ بیشتر دینی چاہیئے

۲۔ منظور شدہ ادارے گرانٹ کے لئے رجسٹرڈ ہونے چاہئیں۔

۳۔ منظوری کا پروانہ دینے سے بیشتر ناظم تعلیم کا فرض ہے کہ وہ:

(الف) اسکول کی ضرورت ہے یا نہیں۔ (ب) تدریسی عملہ حسب ضرورت ہے۔

(ج) اسکول کس حد تک خود کفیل ہے۔ (د) محکمہ کے پاس فنڈ ہے
ناظم تعلیم مندرجہ بالا امور پر تفصیلاً رپورٹ صوبائی حکومت کو پیش کرے اور جو اسکول قائم کیا جا رہا ہے ان کو درج ذیل ہدایت دے۔

(الف) ہر اسکول میں ایک سکریٹری ہو تاکہ اس سے خط و کتابت کی جا سکے۔

(ب) اسکول میں چار سال سے کم اور بیس سال سے زائد عمر والوں کا داخلہ نہیں ہوگا۔

(ج) منظور شدہ نصاب کے علاوہ اسکول میں کوئی دوسرا مضمون نہ بچہ پڑھ سکتا ہے اور پڑھایا جا سکتا ہے۔

(س) صدر ادارے کی مرضی کے بغیر طلبہ کسی دوسرے ادارے کے ممبر نہیں ہو سکتے۔

گرانٹ کے لحاظ سے سرکار نے تعلیمی اداروں کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا تھا جن میں سے خاص خاص یہ ہیں۔

۱۔ یورپین۔ ۲۔ انگلش۔ ۳۔ اینگلو ورناکیولر۔ ۴۔ پرائمری۔ ۵۔ نائٹ۔ ۶۔ انڈسٹریل۔
۷۔ نارمل۔ ۸۔ اسپیشل۔

ان مدارس کی تفصیل سے گریز کر رہے ہیں۔ اسی طرح سے کالجوں کی گرانٹ کے لئے بھی کچھ اصول و قواعد کو منظور کیا گیا۔ مثلاً کسی بھی کالج کو مبلغ دس ہزار روپیہ سے زیادہ گرانٹ نہیں دی جائے گی لیکن بلڈنگ گرانٹ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

اس سلسلے میں "ملا کوڈ" کا بیان کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ انکا کوڈ بالکل مختلف تھا جس کو ۱۹۱۵ء میں تشکیل کیا گیا تھا۔ ہم بیشتر بیان کر چکے ہیں کہ مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت کے یہی اہم مرکز تھے کیونکہ سرکاری اداروں میں مسلمان بچوں کو مشکل سے داخلہ ملتا تھا جس کی اہم وجہ ہندو اور انگریزوں کی ذہنیت تھی جہاں تک ثانوی تعلیم کا سوال تھا تو اس میں کراچی میں سندھ مدرسۃ الاسلام اور اردو اکیڈمی کی وجہ سے مسلمانوں کی نمائندگی ہو جاتی تھی لیکن باقی علاقوں میں ایسا نہیں تھا۔ ملا اسکولوں کی اہمیت سے سرکار اچھی طرح واقف تھی۔ لہٰذا اس نے ۲۳-۱۹۲۲ء میں ایک کمیٹی جناب ولی محمد حسن علی کی سرکردگی میں مقرر کی جس کے سپرد مندرجہ ذیل امور تھے۔

۱۔ ملا اسکولوں نے پرائمری تعلیم کی توسیع کے لئے دیہاتوں میں کیا کام انجام دیئے ہیں؟
۲۔ کیا ملا اسکولوں میں پرائمری نصاب فوری جاری کیا جا سکتا ہے۔؟

۳۔ اگر ایسا ممکن ہے تو وہ کون سے طریقے ہونگے جن سے کامیابی ممکن ہے ؟
۴۔ اگر پرائمری تعلیم خود مختار اداروں کے سپرد کردی جائے تو ان اداروں پر کیا اثر پڑیگا ؟
۵۔ اگر ایسا ممکن ہے تو اس کے لئے کتنے وقت کی ضرورت ہوگی ۔ ؟

اس سلسلہ کی دوسری اہم کڑی آنریبل سر نرائن جی کی سرکردگی میں جو کمیٹی مقرر ہوئی تھی وہ ہے۔ اگرچہ اس کے گیارہ ممبر تھے لیکن مسلمان صرف غلام حسین قاسم ہی تھے اس کمیٹی کے ذمہ :۔

۱۔ بمبئی کے علاوہ میونسپل اور دیہی علاقوں میں مفت تعلیم رائج کرنے کے امکانات پر غور کرنا۔ ۲۔ ان اقدامات کو عملی شکل میں لانے کے لئے ذرائع نکالنا ۳۔ قانونی۔ انتظامی امور اور ان پر منصوبہ بندی کے اقدامات۔ ۴۔ وقت مقررہ پر مفت اور لازمی تعلیم کا اجرا وغیرہ وغیرہ۔

اس کمیٹی نے سوالات کی ایک طویل فہرست تیار کی جس کے جوابات صرف ۲۸۱۔ افراد نے ہی روانہ کئے جن میں سوا اُردو اور باقی انگریزی میں تھے اس کمیٹی نے بعد میں ایک سب کمیٹی مقرر کی جس نے پورے سندھ میں دورہ کرکے معلومات فراہم کیں۔ اس کمیٹی کے صرف چار ہی اجلاس ہوئے۔ سرکار نے اس کمیٹی پر مبلغ اٹھائیس ہزار ایک سو پندرہ روپیہ صرف کئے۔

حکومت بمبئی کی قائم کردہ لازمی کمیٹی نے جو تجاویز پیش کیں ان کی روشنی میں دس سالہ منصوبہ مرتب کیا گیا جس کے مطابق :۔

۱۔ ایک اسکول بورڈ قائم کیا جائے۔ ۲۔ لازمی تعلیم کی تفصیلات پیش کی جائیں۔ ۳۔ اسکیم کی کامیابی کے لئے فراہمی زر کے اصول۔ ۴۔ مقامی خود مختار اداروں کی تعلیمی ذمہ داری کی وضاحت ۵۔ اسکولوں کے معائنہ کے طریقہ ہائے کار۔ ۶۔ تدوین نصاب وغیرہ وغیرہ

جو اسکول بورڈ قائم کیا گیا تھا وہ ۱۹۳۳ء تک میونسپل بورڈ اور بمبئی ایجوکیشن ایکٹ دونوں کے تحت تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء میں گورنمنٹ کمیٹی نے "ایڈمنسٹریٹو آفیسر اسکول" نگراں مقرر کئے۔ بمبئی سرکار کی اسپیشل کمیٹی کی سفارشات پر ملا اسکول بھی بورڈ کے ماتحت کردیئے گئے۔ مسلمانوں کو اور دیگر مراعات سے بھی نوازہ گیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اسکول بورڈ کے تحت جو اساتذہ کام کرتے تھے ان کی تنخواہوں پر بھی نظر ثانی کی گئی۔

۱۹۱۰ء کا تعلیمی کوڈ اس وجہ سے بہت اہم ہے کہ اس میں ٹریننگ کالجز کے قیام پر

بحث کی گئی ہے۔ جیسا کہ ہم تحریر کر چکے ہیں کہ ۱۸۸۰ء میں حیدرآباد کا ٹریننگ کالج ورناکیولر اور اسسٹنٹ ماسٹروں کی تربیت کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ اس کوڈ کے مطابق زیر تربیت اساتذہ کو دس روپیہ ماہوار وظیفہ بھی دیا جاتا تھا۔ ان وظائف کا تعین انسپکٹر کرتا تھا۔ جس کا اعلان گزٹ یا تعلیمی اخبار میں کیا جاتا تھا۔ طلبہ سے ایک بونڈ بھی پُر کرایا جاتا تھا جس کے مطابق ایک معینہ مدت تک وہ سرکاری ملازمت کرنے پر مجبور ہوتے تھے۔

۱۹۳۹ء تک تربیت اساتذہ کا نہایت ہی مہمل اور ناقص انتظام تھا جس کا اندازہ اس رپورٹ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ جو اس سلسلہ میں شائع ہوئی تھی اسکول بورڈ" اپنے ساتذہ کو تربیت کے واسطے پونا۔ حیدرآباد اور احمد آباد بھیجتا تھا۔ سندھی کے اساتذہ کو حیدرآباد گجراتی کے احمد آباد۔ مرہٹی اور اردو کے پونا بھیجے جاتے۔ ۱۹۳۹ء میں صورت حال یہ تھی کہ سات سو اساتذہ میں صرف ۳۱۵ تربیت یافتہ تھے ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۹ء تک صرف ۱۳۳ اساتذہ ہی تربیت حاصل کر سکے تھے۔ ٹریننگ کے واسطے عمر ۳۰ سال کی بجائے ۴۰ کر دی گئی تھی۔ شرح فیس لوکل۔ میونسپل اور امدادی مدارس کے اساتذہ کے لئے تین روپیہ ماہوار اور دیگر ساتذہ کے لئے پانچ روپیہ ماہوار تھی۔

۱۴ اپریل ۱۹۴۷ء تک مسلمان طلبہ کے لئے لیاری اور اس کے ملحقہ علاقوں میں زمی تعلیم کو نافذ کئے ہوئے سترہ سال کا طویل عرصہ گذر چکا تھا۔ البتہ لڑکیوں کے لئے لازمی تیلیم کو صرف تین ہی سال گذرے تھے۔ اس وقت اسکول جانے والے طلبہ و طالبات کی مداد درج ذیل تھی۔

حاضر	۵۸۸۰ طلبہ	۱۹۳۸ طالبات	
غیر حاضر	۱۶۶۴ "	۸۳۷ "	
کل تعداد	۷۵۴۴	۲۷۷۵	

اس ضمن میں ہم اردو اور سندھی ذریعہ تعلیم کا تذکرہ کرنا بھی ضروری خیال کرتے ہیں تاکہ جودہ بحران کے جو لوگ ذمہ دار ہیں۔ وہ حقائق سے آشنا ہو سکیں۔

	تعداد اسکول	تعداد طلبہ	تعداد گرلز اسکول	تعداد طالبات
اردو	۱۴	۱۹۰۸	۶	۵۵۶
سندھی	۱۸	۱۴۳۱	۱۲	۲۱۶۴

مندرجہ بالا اعداد و شمار جو پرائمری تعلیم کے ہیں اگر ان میں سے غیر مسلم بچوں کو الگ کر دی جائے تو مسلمان پچاس فیصد اردو پڑھتے نظر آتے ہیں جبکہ باقی سندھی اور گجراتی میں تعلیم حاصل کرتے تھے ۔

۱۹۳۹ء تک پرائمری ایجوکیشن کی مدت ۵ سال تھی کیونکہ یہ زیادہ تھی ۔ اسلئے یہ مسئلہ بورڈ کے سامنے پیش کیا گیا ۔ بورڈ نے اسکے حل کیلئے ایک سب کمیٹی مقرر کردی جس نے کافی غور خوض کے بعد سفارش کی کہ یہ مدت زیادہ ہے ۔ اس کو ۴ سال ہونا چاہیئے ۔ البتہ اس میں سے کچھ مضامین کو خارج از نصاب کر دینا چاہیئے جس کو گورنمنٹ نے منظور کر لیا ۔

اب ہم آخر میں ۱۹۷۲-۷۳ء میں کراچی کے گورنمنٹ نیشنلائزڈ اور مستثنیٰ مدارس اور ان میں متعلمین اور معلمین کی تعداد درج کر رہے ہیں تاکہ ناظرین اس کی ترقی کا اندازہ کر سکیں

پرائمری	گورنمنٹ	نیشنلائزڈ	مستثنیٰ مدارس	تعداد معلمین ۔ تعداد متعلمین
گرلز	۳۲	۷۶	۱۶	(۱) ۷۹۰ (۲) ۱۰۵۱ (۳) ۳۰۰ (۱) ۲۶۱۵ (۲) ۳۳۱۲۷ (۳) ۵۹۲
لوائز	۴۵	۱۳۴	۲۲	(۱) ۱۰۰۱ (۲) ۱۶۱۲ (۳) ۵۷۴ (۱) ۲۹۱۰۹ (۲) ۷۰۲۱۵ (۳) ۳۳۶
گرلز لوائز سکینڈری	۲۲	۲۹	۲	(۱) ۱۵۲ (۲) ۱۴۴ (۳) ۱۱۷ (۱) ۹۰۴۴ (۲) ۴۰۹۷ (۳) ۸۹۱
لوائز ″	۳۹	۱۲۹	۱۲	(۱) ۲۳۵ (۲) ۶۲۱ (۳) ۶۴ (۱) ۴۵۹۶ (۲) ۷۸۰۱ (۳) ۵۴
گرلز ثانوی	۱۷۵	۵۴	۱۶	(۱) ۵۱۲۲ (۲) ۵۸۸ (۳) ۱۲ (۱) ۱۴۴۴۶ (۲) ۱۳۰۱۸ (۳) ۲۱۴
لوائز ″	۳۸۴	۳۱۳	۲۷	(۱) ۲۴۱۲ (۲) ۱۴۸۸ (۳) ۵۸۵ (۱) ۸۲۶۳۶ (۲) ۹۶۱۹۹ (۳) ۱۸۰

سندھ مدرستہ الاسلام کراچی

SIND MADARSATUL ISLAM KARACHI

پس منظر :

سندھ میں تعلیمی تحریک کا آغاز نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کی شاخ کراچی کی مساعی کا نتیجہ تھا ۔ یہ جماعت جسٹس سید امیر علی نے قیام کانگریس سے پہلے یعنی ۱۸۸۲ میں قائم کی تھی ۔ اس کے خاص خاص مقاصد مندرجہ ذیل ہیں ۔

اصول و مقاصد

(۱) اس ایسوسی ایشن کا قیام مسلمانان ہند کی فلاح و ترقی کے لئے تمام جائز اور آئینی طریقے اختیار کئے جائیں .... اور یہ کہ اپنی ماضی کی شاندار روایات سے فیض حاصل کرتے ہوئے عصر حاضر کے ترقی پذیر رجحانات اور مغربی ثقافت کے پسندیدہ عناصر سے ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ اس کا نصب العین ہندوستانی مسلمانوں کی حیات نو ہے۔

(۲) یہ امر بھی ایسوسی ایشن کے پیش نظر ہے کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا ہندوستان کی دوسری قوموں کی فلاح و بہبود سے گہرا تعلق ہے۔ اس لئے مجموعی طور پر اس ملک کے باشندوں کے عام مفادات کی حمایت بھی اس کے دائرہ عمل میں ہے۔

سندھ میں نیشنل ایسوسی ایشن کی کم از کم چار شاخیں کراچی۔ شہدادپور۔ لاڑکانہ اور سکھر میں قائم تھیں۔ اس سلسلے میں سید امیر علی نے سندھ کا دورہ کیا تھا۔ اور سندھ کے ارباب فکر و بصیرت اور ملت کے بہی خواہوں میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے نہ صرف ایک فکری تحریک شروع کر گئے تھے۔ بلکہ ان کے دورے سے مسلمانوں میں سیاسی شعور اور تعلیم کے فروغ کے لئے ایک عملی جدوجہد بھی شروع ہوگئی تھی۔ ایسوسی ایشن کی شاخ کراچی کے صدر حسن علی آفندی سندھ میں مسلمانوں کے ایک ممتاز رہنما اور بہی خواہ ملت تھے ۱۸۸۲ء میں سید امیر علی ایک مقدمہ کے سلسلے میں کراچی آئے۔ اس موقع پر حسن علی نے ایک جلسہ کا اہتمام کیا۔ جس میں امیر علی نے سندھ میں مسلمانوں کی تعلیم پر ایک تقریر کی۔ اور مسلمانوں کو حالات و وقت کے مطابق ملکی فلاح و بہبود کے کاموں اور تعلیم کے حصول کی طرف متوجہ کیا۔ چونکہ یہاں کے مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی اس لئے امیر علی کی اس تحریک کا عوام پر خاص اثر ہوا اور حسن علی اور دوسرے سربرآوردہ مسلمان فوراً سرگرم عمل ہوگئے۔

اس تحریک کے نتیجے میں جو اسکول قائم ہوا۔ وہ سندھ مدرسۃ الاسلام کے نام سے موسوم ہوا۔ ۱۸۹۰ء میں کانفرنس کا اجلاس جب کراچی میں ہوا تو اس میں تجویز پیش کی گئی کہ سندھ میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک لوکل کمیٹی بنادی جائے۔ تاکہ وہ کانفرنس کو ہر سال مسلمانان سندھ کی تعلیمی ضروریات اور مشکلات سے آگاہ کرتی رہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ سندھ میں تعلیمی تحریک کا آغاز اور سندھ مدرسہ کا قیام سرسید کی تعلیمی تحریک کا نتیجہ نہیں تھا۔

سندھ مدرسہ کے قیام کو نوے سال سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا ہے۔ یہ مدرسہ سندھ میں مسلمانوں کی تعلیمی و ثقافتی تاریخ کا روشن باب ہے اس کے فرزندوں میں بڑے بڑے نامی گرامی گذرے ہیں۔ جنھوں نے پورے ملک میں مسلمانوں کی زندگی کے ہر گوشے میں رہنمائی کی۔ بالخصوص سندھ کے علمی۔ تعلیمی ثقافتی اور سیاسی تاریخ کے صفحات کو اپنے افکار اور خدمات سے دامن کش قلب و نظر بنادیا۔ ان میں سر غلام حسین ہدایت اللہ۔ حاجی سر عبداللہ ہارون حسین جی چھاگلا۔ قاضی خدا بخش۔ شیخ عبدالمجید سندھی۔ سید میران محمد شاہ سر شاہنواز بھٹو ڈاکٹر داؤد پوتہ اور قائداعظم محمد علی جناح وغیرہ وہ اصحاب علم و فضل۔ اہل نظر اور ارباب بصیرت و تدبر ہیں۔ جو کسی تعارف کے محتاج نہیں۔

ابتدا میں یہ مدرسہ بولٹن مارکیٹ کے سلے کرائے کی عمارت میں قائم تھا۔ جو حقیقتاً ایک گودام تھا۔ اور مدرسے کے لئے کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ چنانچہ حسن علی مرحوم نے بھاگ دوڑ کر کے میونسپل بورڈ سے پچھتر روپیہ ماہوار کرائے پر وہ سرائے لے لی جو ریلوے کے نظام کے بعد بے کار ہو گئی تھی۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں سندھ مدرسہ اب قائم ہے۔

مدرسہ کی مالی مدد مختلف ریاستوں کے نوابین نے بھی کی۔ حکومت کے ساتھ ساتھ عوام نے اس میں دل کھول کر چندہ دیا۔ مالی امداد کے لئے حسن علی اور ان کے رفقائے نے پورے ملک کا دورہ کیا۔ دس ہزار روپیہ نواب جوناگڑھ۔ چار ہزار روپیہ نظام حیدرآباد۔ چھ ہزار روپیہ کی امداد میر صاحب خیرپور نے کی اس کے ساتھ ہی

میر صاحب نے پرنسپل کے بنگلے۔ خیرپور ہاؤس اور تال پور ہاؤس کے لیے بھی کافی رقم دی۔

۱۸۸۸ء میں حسن علی نے علی گڑھ کا سفر کیا۔ اور سر سید سے بنفس نفیس ملاقات کی۔ کچھ مدت علی گڑھ میں رہ کر وہاں کے اصول و قواعد کا بغور جائزہ لیا اور پھر واپس آکر سندھ مدرسہ کو فائدہ پہنچایا۔ حسن علی نے اپنے دونوں کو بھی علی گڑھ تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا۔ ان کے بڑے لڑکے ولی محمد جو تقریباً دس سال تک سندھ مدرسے کے پرنسپل رہے۔ اس تحریک کو آگے بڑھایا اور اس طرح ان کے زمانہ میں اس نے بہت ترقی کی۔

حسن علی آفندی اور ان کے ساتھیوں نے ملت کی فلاح و بہبود کے لئے جو تعلیمی اصلاحات شروع کی تھیں اور مدرستہ الاسلام کے نام سے جو چشمۂ فیض جاری ہوا تھا۔ اس نے ملت کی فکر و نظر کو تازگی و پاکیزگی۔ قلب کو عزم اور حوصلہ اور جسم کو قوت و توانائی بخشی۔ مدرستہ الاسلام ایک شجر طیبہ تھا جس کی جڑیں زمین میں مضبوطی سے جمی ہوئی تھیں جس نے ملی اور قومی زندگی کی کھیتی کو ہر دور میں حیات نو بخشی۔

سندھ مدرسہ اپنے قیام سے برابر ترقی کرتا رہا۔ قیام پاکستان کے بعد اس کا نیا دور شروع ہوا۔ اور اس کے چشمۂ فیض سے ادب۔ تہذیب اور علم وفن کے کئی اور چشمے پیدا ہوئے۔ جن میں سے ہر چشمہ اپنی افادیت و فیضان کا خاص دائرہ رکھتا ہے۔ ایس۔ ایم سندھ مدرسہ۔ آرٹس۔ کامرس اور سائنس کالج۔ ایس۔ ایم سندھ لاء کالج۔ سندھ مدرسہ ہائی اسکول۔ فاطمہ جناح گرلز ہائی اسکول و کالج وغیرہ اسی نظام شمسی کے سیارے ہیں اور ان سیاروں نے ہماری زندگی کی علمی۔ تعلیمی۔ تہذیبی اور سیاسی زندگی کا گوشہ گوشہ روشن کر دیا ہے۔

ڈاکٹر اقبال اور تعلیم

۱۸۷۳ء - ۱۹۳۸

Dr. IQBAL & EDUCATION.

اقبال کی تصنیفات کا زیادہ تر حصہ اگرچہ نظم میں ہے لیکن ان کی سب سے پہلی کتاب جو نثر میں شائع ہوئی وہ علم الاقتصاد ہے یہ اردو میں اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے اس کے بعد وہ انگلستان چلے گئے اور وہاں فلسفہ ایران پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی جس پر ان کو پی۔ ایچ۔ ڈی ملی۔ پھر ان کی نظموں کے مختلف مجموعے شائع ہوتے رہے۔ ۱۹۱۵ء میں وہ لندن گئے جہاں پر ان کے خیالات میں زبردست انقلاب اور تغیر ہوا جس نے ان کو ایک پکا اور پر جوش مسلمان بنا دیا۔ چنانچہ واپسی پر یہی خیالات ان کی نظموں میں رونما ہوئے اس لئے ان کی شاعرانہ شہرت میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا لیکن اس کے بعد ان کے کلام کا ایک فارسی مثنوی "اسرار خودی" کے نام سے ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی یوں تو اقبال ابتدا ہی سے پر جوش شاعر سمجھے جاتے تھے۔ اور یورپ کی واپسی کے بعد اس میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ لیکن اس مثنوی کے شائع ہونے کے بعد ان کی حیثیت ایک فلسفی اور مفکر کی ہوگئی اور اس طرح وہ شاعری کے دنیا سے نکل کر ایک دوسرے عالم میں آگئے "اسرار خودی کے علاوہ "رموز بے خودی" پیام مشرق، شکوہ جواب شکوہ" زبور عجم، جاوید نامہ، بال جبریل، ضرب کلیم، ارمغان حجاز قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر موصوف نے تعلیم پر کوئی تصنیف نہیں کی جو کچھ بھی آپ کے افکار و نظریات کا اندازہ ہوتا ہے وہ آپ کی نظموں سے، ہم درج ذیل میں مختصراً اس پر روشنی ڈال رہے ہیں

اقبال نے اپنی شاعری کے پہلے اور دوسرے ادوار میں تعلیم پر کچھ بھی نہیں لکھا۔ اس موضوع پر انہوں نے سب سے پہلے۔ شاعری کے تیسرے دور میں اپنے خیالات ظاہر کئے چنانچہ بانگ درا کے دور سوم کی نظموں میں چند نظمیں تعلیم پر ملتی ہیں۔ اور ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ جدید تعلیم کو مذہب سے بیگانہ رکھنا گوارا نہیں کر سکتے اس لئے موجودہ تعلیم سے جو الحاد پھیل رہا ہے اس سے انہوں نے سخت بیزاری ظاہر کی ہے۔

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر — لب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم   کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما   لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

ایک اور جگہ اسی سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

تعلیم پیر فلسفۂ مغربی ہے یہ   ناداں ہیں جنکو ہستی غائب کی ہے تلاش
محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی   اس دور میں ہے شیشۂ عقائد کا پاش پاش
مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنونِ خام   ہے جس سے آدمی کے تخیل کو ارتعاش
کہتا مگر ہے فلسفۂ زندگی کچھ اور!!   مجھ پر کیا یہ مرشدِ کامل نے راز فاش
با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است   ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش

لیکن الحاد سے یہ بیزاری محض ملایانہ دینداری کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کے تحت میں چند فلسفیانہ اور تاریخی حقائق بھی پوشیدہ ہیں زندگی محض علم کا نام نہیں ہے بلکہ اس کیلئے عمل بھی ایک ضروری چیز ہے اور انسان میں عمل کا جوش اور اس کا ولولہ صرف مذہب سے پیدا ہو سکتا ہے ممکن ہے کہ وہ کچھ لوگوں کے نزدیک ایک جنون خام کے بغیر کام نہیں چل سکتا اس لئے ع ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش

اس کے علاوہ تعلیم ایک اجتماعی چیز ہے اس کا مقصد انتشار پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ اتحاد و اتفاق پیدا کرنا ہے لیکن چونکہ ملت اسلامیہ کی بنیاد دینی اور روحانی اصولوں پر قائم ہے اس لئے جب تک اس کی تعلیم میں دینی اور روحانی عناصر شامل نہ ہوں اس کا اجتماعی وجود قائم نہیں رہ سکتا۔

مذہب سے ہم آہنگی افراد ہے باقی   دین زخمہ ہے جمیتِ ملت ہے اگر ساز

بانگ درا کے بعد اقبال نے بال جبریل کے جستہ جستہ اشعار میں تعلیم کے موجودہ طریق پر جو نکتہ چینی کی ہے اس میں پہلا رونا تو اسی الحاد و بے دلی کا ہے جس کی تعلیم ان مدارس میں دی جاتی ہے۔

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا   کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

لیکن اسی کے ساتھ اور بھی چند نئی باتوں کی طرف اشارے کئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس تعلیم سے جو نئی نسل پیدا ہو رہی ہے اس میں صرف یہی نقص نہیں ہے کہ وہ ملت اسلامیہ کے دینی اور روحانی اصول پر قائم نہیں ہے۔ بلکہ سب سے زیادہ افسوسناک

بات یہ ہے کہ اس میں یوروپین قوموں کی خصوصیات بھی نہیں پائی جاتی ہیں۔

بہ تبانِ عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسوں میں ۔۔۔ نہ ادائے کافرانہ، نہ تراشِ آذرانہ

اس لئے ایک ایسی ملت تیار ہو رہی ہے جس کی نسبت اقبال کا یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا۔

درمیان کافراں ہم بودہ ام ۔۔۔ یک کمر شائستہ زنار نیست

موجودہ طریقہ تعلیم مسلمانوں کی قومی اور تاریخی زندگی سے بالکل مطابقت نہیں پیدا کرتا جس کی مثالیں مسلمانوں کی گذشتہ قومی تاریخ میں ہر جگہ ملتی ہیں۔

شکایت ہے مجھے یارب! خداوندانِ مکتب سے ۔۔۔ سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

ان متفرق اشعار کے علاوہ اقبال نے ضرب کلیم میں تعلیم و تربیت کا مستقل عنوان قائم کیا ہے لیکن بڑی مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ اس عنوان کے تحت میں جو اشعار آتے ہیں ان میں اکثر تعلیم و تربیت سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تاہم غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے نزدیک تعلیم کا اصلی مقصد خودی کی نشو و نما ہے چنانچہ اس عنوان کے پہلے ہی صفحہ میں انہوں نے حکمائے قدیم و جدید کی زبان سے تعلیم کے دو مقاصد بتائے ہیں اسپنوزا کہتا ہے

نظر حیات پہ رکھتا ہے مرد دانشمند ۔۔۔ حیات کیا ہے؟ حضور و سرور و نور و وجود

لیکن افلاطون کے نظریہ کے مطابق ہے

نگاہ موت پہ رکھتا ہے مرد دانشمند ۔۔۔ حیات ہے شب تاریک میں شرر کی نمود

ان دونوں کے ڈاکٹر اقبال کے نزدیک

حیات و موت نہیں التفات کے لائق ۔۔۔ فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

لیکن یہی خودی ہے جس کی تعلیم اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نہیں دی جاتی بلکہ ایسی غلامانہ تعلیم دی جاتی ہے جس سے خودی کے تمام احوال و مقامات پوشیدہ رہ جاتے ہیں۔

اقبال یہاں نام نہ لے علم خودی کا ۔۔۔ موزوں نہیں مکتب کیلئے ایسے مقامات
بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے ۔۔۔ پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات
زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے ۔۔۔ زندگی سوز جگر ہے علم ہے سوز دماغ
علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے ۔۔۔ ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ

کیونکہ خودی کی تربیت صرف مذہبی اور اخلاقی تعلیم پر موقوف ہے جس سے موجودہ نظام

تعلیم بالکل خالی ہے اور صرف خالی ہی نہیں بلکہ مذہب واخلاق کی بیخ کنی کر رہا ہے۔

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم ایک سازش ہے فقط دین ومروت کے خلاف

موجودہ تعلیم صرف معاش کا ایک ذریعہ ہے اور معاش ہی کی فکر نے تمام قوم غلام بنا رکھا ہے۔

عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے قبض کی روح تری دیکے تجھے فکر معاش
دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوق خراش
اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا جو یہ کہتا تھا کہ خرد سے کہ بہانے نہ تراش
فیض فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہ خفاش

لیکن موجودہ تعلیم جس پر مذہب، اخلاق اور عشق وعمل سب کو قربان کیا جا رہا ہے معاش کا بھی انتظام نہیں کرتی۔

نوا ز سینۂ مرغ چمن برد ز خون لالہ آں سوز کہن برد
بایں مکتب بایں دانش چہ نازی کہ ناں در کف نداد و جاں زتن برد

اسی لئے مذہبی اور صنعتی تعلیم کو بھی نظام تعلیم کا ضروری جزو بنانا چاہیئے۔

بہ پور خویش دین و دانش آموز کہ تابد چوں مہ و انجم نگینش
بدست او اگر دادی ہنر را ید بیضا است اندر آستینش

اقبال کے نظام تعلیم کا ایک اصول یہ ہے کہ زمین کسی شخص، کسی خاندان اور کسی قوم کی ملکیت نہیں ہے بلکہ اس دنیا میں جو کچھ ہے وہ خدا کا ہے۔

سرگذشت آدم اندر شرق و غرب بہر خاکے فتنہ ہائے حرب و ضرب
یک عروس و شوہر او ما ہمہ آں فسوں گر بے ہمہ ہم با ہمہ
عشوہ ہائے او ہمہ مکر و فن است نے از آن تو نہ از آن من است
حق زمیں را جز متاع ما نگفت ایں متاع بے بہا مفت است و مفت
دہ خدایا! نکتۂ از من پذیر رزق و گور از وے بگیر او را مگیر
تو عقابی طائف افلاک شو بال و پر بکشا و پاک از خاک شو!

لیکن آج تک دنیائے ملوکیت کے ذریعہ سے خدا کی زمین پر قبضہ غاصبانہ کر کے اس کو اپنی موروثی جائداد بنا لیا ہے اس لئے اقبال نے اپنی تعلیمات میں ملوکیت

کی جا بجا سخت مخالفت کی ہے۔

ملوکیت سراپا تیشہ بازی است　　　　از و ایمن نہ رومی نے حجازی است

ایک اور جگہ اسی سلسلہ میں یوں فرماتے ہیں ؎

عرب خود را بہ نورِ مصطفےٰ سوخت　　　　چراغِ مژدۂ مشرق برافروخت
ولیکن آں خلافت راہ گم کرد　　　　کہ اول مومناں را شاہی آموخت

ملوکیت کا یہ سیاسی نظام ابلیس کا قائم کیا ہوا ہے جس پر اس کو نہایت فخر ہے۔

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب　　　　میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں

اور اس ابلیسی نظامِ سیاست نے ایک طرف تو مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں توڑ کر سلطنت کو مذہب اور اخلاق سے بالکل بیگانہ کر دیا اور اس بیگانگی کی تعلیم سب سے پہلے میکیاولی نے دی۔ اس لئے اقبال اسے ابلیس کا بھیجا ہوا پیغمبر سمجھتے ہیں۔

دہریت چوں جامۂ مذہب درید　　　　مرسلے از حضرتِ شیطاں رسید
آں فلارنسادی باطل پرست　　　　سرمۂ او دیدۂ مردم شکست

یہاں فلارنسادی سے مراد میکیاولی کتاب الملوک کا مشہور مصنف جو فلارنس میں پیدا ہوا۔ اسی سلسلہ میں آگے چلکر اقبال فرماتے ہیں۔

نسخہ بہر شہنشاہاں نوشت　　　　در گلِ ما دانۂ پیکار کشت
مملکت را دین او معبود ساخت　　　　فکر او مذموم را محمود ساخت
بوسہ تا بر پائے ایں محبود زد　　　　نقدِ حق را بر عیارِ سود زد
باطل از تعلیم او بالیدہ است　　　　حیلہ اندازی فنے گردیدہ است

دوسری طرف غلامی کے خمیر کو اور بھی زیادہ پختہ کر دیا۔

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام　　　　پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام
یہ ہماری سعی پیہم کی کرامت ہے کہ آج　　　　صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام!

اس لئے اس ابلیسی نظام کو توڑنے کے لئے سب سے پہلے آزادی کی ضرورت ہے اور اقبال اصولاً آزادی کے سب سے بڑے حامی ہیں۔

خود گیری و خودداری و گلبانگِ انا الحق　　　　آزاد ہو سالک تو ہیں یہ اس کے مقامات
محکوم ہو سالک تو یہی اس کا ہمہ اوست　　　　خود مردہ و خود مرقد و خود مرگِ مفاجات

آزاد کی رگ سخت ہے مانندِ رگِ سنگ — محکوم کی رگ نرم ہے مانندِ رگِ تاک
محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید — آزاد کا دل زندہ و پرسوز و طرب ناک
آزاد کی دولت دل روشن نفسِ گرم — محکوم کا سرمایہ فقط دیدہ نمناک
محکوم ہے بیگانہ اخلاق و مروت — ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک
ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش — وہ بندۂ افلاک ہے یہ بندۂ افلاک

لیکن با ایں ہمہ وہ موجودہ دور کی آزادی کو بھی خطرہ سے خالی نہیں سمجھتے۔

بطے میگفت بحر آزاد گردید — چنیں فرماں ز دیوانِ خضر رفت
نہنگے گفت رو ہر جا کہ خواہی — و لے از ما نباید بے خبر رفت

اقبال کی شاعری محبت وطن اور محبت قوم سے شروع ہوئی۔ اور محبت الٰہی و محبت رسول پر اس کا خاتمہ ہوا ان کی شاعری اور ان کے کلام پر ایک صوفیانہ اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس کو پڑھ کر خدا کے ساتھ انسان کا تعلق عبودیت و معبودیت اور عشق و محبت کا باقی نہیں رہتا بلکہ حریفانہ وساویانہ ہو جاتا ہے خلیفہ عبدالحکیم نے لکھا ہے کہ اقبال نے شکوہ میں خدا کے ساتھ جو شوخیاں کی ہیں وہ نٹشے کے الحادی فلسفہ کا نتیجہ ہیں لیکن حقیقت یہ نہیں ہے دراصل یہ نٹشے کے فلسفہ کا نتیجہ نہیں بلکہ وہ انسان کی قوت و تخلیق اور قدرت و اختیار کو اس زور و مبالغہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ جوش بیان میں اس قسم کے مصرعے " نگر با ایزدانیاز است آدم "

خود بخود ان کے قلم سے ٹپک پڑتے ہیں کیوں کہ جب تک وہ تمام لوگوں کو نہایت پر جوش اور مبالغہ آمیز طریقہ پر انسان کی قوت عمل کا تعین نہ دلاتے اس وقت تک ان کے فلسفہ خودی کے اثبات میں شاعرانہ زور نہ پیدا ہوتا۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ان کا زور بیان حسن ادب کے خلاف ہے متغزلہ بھی انسان کی قوت تخلیق اور قدرت و اختیار کے قائل ہیں لیکن بہر حال وہ انسان کو خدا کے پاس ادب سے خالق نہیں کہتے لیکن آخر عمر میں جب زور بیان کے بجائے اقبال کے کلام میں سوز و گداز پیدا ہوا تو انہوں نے اس سوئے ادب کی تلافی کر دی اور نہایت عجز و الحاح کے ساتھ خدا کے سامنے گنہگار بندوں کی طرح سر جھکایا اور اس حیثیت سے ارمغانِ حجاز میں " حضورِ حق " کے عنوان سے جو قطعات لکھے وہ نہایت پُر درد پُر سوز اور موثر ہیں۔ مثلاً

عطا کن سوز رومی سوز خسرو | عطا کن صدق و اخلاصِ سنائی
چناں با بندگی در ساختم من | نہ گیرم گر مرا بخشی خدائی

اس سلسلہ میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

بپایاں چوں رسد ایں عالم پیر | شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضورِ خواجہ مارا | حساب من ز چشم او نہاں گیر

لیکن اقبال کے دل میں محبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم محبت الٰہی پر بھی غالب آگئی تھی ان کی آخری آرزو فریضہ حج کی ادائیگی تھی لیکن اس آرزو کی اصل محرک دیار حبیب کی زیارت تھی لیکن بد قسمتی سے ان کو یہ دونوں سعادتیں نصیب نہ ہو سکیں اسی بنا پر ان کے نعتیہ کلام میں جو جوش و خروش، جو صدق و اخلاق اور جو سوز و گداز پایا جاتا ہے اس کی نظیر فارسی اور اردو شاعری میں شاید ہی مل سکے لیکن ان کی شاعری کے تیسرے دور میں سوز و گداز کم اور جوش و خروش زیادہ ہے اس میں انہوں نے جواب شکوہ کے آخر میں جو چند نعتیہ اشعار لکھے ہیں وہ جوش بیان کا بے مثل نمونہ ہیں۔ تمام نعت گو شعراء کا انداز بالکل عاشقانہ شاعری کا ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا محبوب فرض کر لیتے ہیں اور آپ کے سامنے زیادہ تر اپنا ذاتی دکھڑا روتے ہیں لیکن اقبال نے نعتیہ شاعری کو بالکل قومی شاعری بنا دیا ہے اور موجودہ دور میں مسلمان جن مصائب میں مبتلا ہیں ان کو ایک ایک کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا ہے مثال کے طور پر :-

ملوکیت سراپا شیشہ بازی است | از و ایمن نہ رومی نے حجازی است
حضور تو غم یاراں بگویم | بامیدے کہ وقتِ دلنوازی است

ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

ہنوز ایں چرخ نیلی کج خرام است | ہنوز ایں کارواں دور از مقام است
ز کارِ بے نظام او چہ گویم! | تو مے دانی کہ ملت بے امام است

غرض اقبال کی شاعری کے عنوانات میں سب سے زیادہ پر جوش، پر سوز اور پر درد عنوان اسی نعتیہ شاعری کا ہے لیکن اس پر ہمیں بہت کم تحریر ملتی ہے۔

کتاب کی تدوین میں مندرجہ ذیل کتب سے خاص طور سے استفادہ کیا گیا

۱۔ تاریخ دیوبند : سید محبوب رضوی اشوک پریس، دہلی

۲۔ تعلیم و تربیت حصہ اول و دوم : مولانا مناظر احسن گیلانی، ندوۃ المصنفین دہلی

۳۔ دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ زندگی : قاری محمد طیب : طبع دیوبند

۴۔ ہندوستان کی قدیم درس گاہیں : مولانا ابوالحسنات ندوی، وکیل بکڈپو امرتسر ۱۹۴۱ء

۵۔ امام غزالیؒ کے تعلیمی نظریات : انوار الحسن، لکھنؤ

۶۔ مسلمانانِ ہند و پاکستان کی تاریخ تعلیم : پروفیسر سیّد نوشہ علی۔

۷۔ ہندوستان میں تعلیم۔ مدارس کے مسائل : سعید احمد انصاری جامعی

۸۔ مشاہیر کے تعلیمی نظریات : محمد حسین خان زبیری

۹۔ عہدِ نبوی کا نظام حکمرانی : ڈاکٹر محمد حمید اللہ : مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔

۱۰۔ تعلیمات : مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی : اسلامک پبلیکیشنز لاہور

۱۱۔ تعلیم کی کہانی : پروفیسر بشیر احمد : کفایت اکیڈمی کراچی ۷۴ ۱۹ء

۱۲۔ تہذیب الاخلاق : سرسید احمد خان : ۵ اذی الحجہ ۱۲۸۷ھ علی گڑھ

۱۳۔ حیاتِ جاوید : مولانا الطاف حسین حالی : ۱۹۰۱ء

۱۴۔ میکالے کا نظریہ تعلیم : پروفیسر عبدالحمید صدیقی، روہیل کھنڈ سٹریری سوسائٹی کراچی

۱۵۔ انگریزی عہد میں ہندوستانی تمدن کی تاریخ : علامہ عبداللہ یوسف علی : نفیس اکیڈمی کراچی

۱۶۔ نصاب تعلیم جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ معہ مقدمہ : مولانا محمد علی بی۔ اے آکسن مطبع فیض عام علی گڑھ

۱۷۔ سید مودودی کے تعلیمی نظریات : محمد حسین : ادارہ تحقیق و اشاعت لاہور ۱۹۷۶ء

۱۸۔ اسلام کا نظریہ تعلیم : ڈاکٹر محمد رفیع الدین : ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۷۵ء
۱۹۔ تاریخ تعلیم و تربیت اسلام : ڈاکٹر احمد شبلی، مترجم محمد حسین خاں زبیری :
ثقافتِ اسلامیہ لاہور ۱۹۶۳ء
۲۰۔ کراچی کا نظام تعلیم : محمد احمد صدیقی علیگ : اکیڈمک پبلیکیشنز ناظم آباد کراچی ۶۴ء
۲۱۔ مسلمان خواتین کی تعلیم : محمد امین زبیری :
۲۲۔ افکار ابنِ خلدون : مولانا محمد حنیف ندوی : ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور
۲۳۔ مسلمانوں کا نظام حکمرانی : ڈاکٹر حسن ابراہیم ترجمہ محب اللہ ندوی :
مکتبہ ایوانِ اشاعت لمیٹڈ۔ کراچی
۲۴۔ تمدن عرب : ڈاکٹر گستاولی بان ترجمہ سید علی بلگرامی : مقبول اکیڈمی۔ لاہور
۲۵۔ مقدمہ ابنِ خلدون : سعد حسن خاں یوسفی : نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی
۲۶۔ الکلام و علم الکلام : علامہ شبلی : نفیس اکیڈمی کراچی
۲۷۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت : مولانا مناظر احسن گیلانی :
۲۸۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیم : غلام حسین جلبانی
۲۹۔ ہندوستان میں قدیم درسگاہیں : مولانا ابوالحسنات : ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور
۳۰۔ سرگذشت غزالی : محمد حنیف ندوی : ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور
۳۱۔ الغزالی : علامہ شبلی : ایم ثناء اللہ خاں لاہور
۳۲۔ اسلام میں حیثیت نسواں : محمد مظہر الدین صدیقی : ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور
۳۳۔ تزک بابری : رشید اختر ندوی : فیروز سنز کراچی
۳۴۔ تزک جہانگیری : جمیل الدین احمد : فیروز سنز کراچی
۳۵۔ یونانی علوم اور عرب : ترجمہ محمد معین خان : فیروز سنز کراچی
۳۶۔ تاریخ تعلیم : خالد یار خاں : اردو مرکز لاہور
۳۷۔ مسلمانانِ ہند کی تاریخ تعلیم : سید نوشہ علی : سلمان اکیڈمی کراچی
۳۸۔ اسلامی و عربی تمدن : معین الدین ندوی : اعظم گڑھ
۳۹۔ تاریخ فرشتہ : ترجمہ عبدالحیٔ خواجہ : سنگِ میل لاہور

۴۰۔ معاشرتی و علمی تاریخ ؛ ڈاکٹر سید معین الحق ؛ سلمان اکیڈمی کراچی
۴۱۔ تہذیب و تمدن اسلامی ؛ رشید اختر ندوی ؛ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور
۴۲۔ سرسید احمد خاں اور انکے رفقار کی نثر ؛ ڈاکٹر عبداللہ ؛
مکتبہ کارواں لاہور
۴۳۔ فلسفہ تعلیم ؛ ظفر حسین خاں ؛ علمی کتاب گھر ۔ کراچی
۴۴۔ چند عظیم مفکرین تعلیم ؛ ظفر حسین خاں ؛ مکتبہ ایمپوزیم ۔ کراچی
۴۵۔ پاکستان کا تعلیمی تناظر جلد اول ۔ دوم ۔ سوم ؛ ظفر حسین خاں
مکتبہ فریدی ۔ کراچی
۴۶۔ علم التعلیم ؛ ظفر حسین خاں ؛ طاہر سنز ۔ اردو بازار ۔ کراچی
۴۷۔ عناصر تعلیم ؛ ظفر حسین خاں ؛ طاہر سنز ۔ اردو بازار ۔ کراچی
۴۸۔ اساس تعلیم ؛ " " " " " "
۴۹۔ اصول تعلیم ؛ " " " " " "
۵۰۔ اسلامی نظریہ حیات ؛ خورشید احمد ؛ شعبہ تصنیف و تالیف کراچی یونیورسٹی

❊

66. SYEDEEN. K.G. Education, Culture & Social Order. Bombay.

67. ZAFAR H.KHAN Psychology of Education. Karachi.

68. ZAFAR. H.KHAN. Plato's Educational Ideas & Their Influence of the System of Education of Egland & Pakiatan. Karachi.

---

42. MONROE A short History of Western Education.

43. MONROE P. A Text Book in the History of Education London.

44. MOORE R.S. Wood's Despatch 1854.

45. MULHERNJ. A History of Education.

46. NUNN.P Education, Its data & First Principles.

47. N.N. LAW. Promotion of Learning in India By Mohammadans.

48. NETTLESHIP. L.R. Theory of Education in Platos Republic.

49. NOORULLAH NAIK. A History of Education in India.

50. PETERS R.S. Ehics & Education. O.U.P. London.

51. RUSK.R. The Doctrines of Great Educators. New York.

52. SPENCER H. Education, Intellectual, Moral & physical London.

53. TOYNBEE. A Study of History. O U P London.

54. UNESCO. Humanism & Education.

55. UNESCO. Problems in Asian Teacher's Training Course.

56. UNESCO. Women & Education.

57. WHITE HEAD. The Aims of Education. New York.

58. W. HUNTER. The Indian Musalmans.

60. REPORTS. Govt; of Pakistan on Education. 1959, 1970, 1972 & 1978.

61. WAHEED.A. Evaluation of Muslim Education. Lahore.

62. AHMAD M. Muslim Education. Zurich

63. NILAM. Education, The Brith Right of Every Girl. Lahore.

64. QUERESHI I.H. Education in Pakistan.

65. BRAUMER C.J. Problems in Education & Philosophy. Prentice Hall

18. CAPES.W.W. Life in Ancient Athens New York.

19. CURTIS S.J. Ahort History of Educational Ideas. London.

20. CASTLE E.B. Ancient Education & Today London.

21. CUBBERLY E.P Readings in the History of Education. London.

22. COLLINGWOOD, R.G. Idea of Nature Oxford New York.

23. CROSSMAN, R.H.S. Plato Today Oxford New York.

24. DEWEY JOHN. DEMOCRACY & EDUCATION. NewYork.

25. DEWEY JOHN. School & Society. New York.

26. DEWEY JOHN. The Child & The Curriculum. New York.

27. DEWEY JOHN. How We Think. New York.

28. DEWEY JOHN. Freedom & Culture. New York.

29. DURAHT WILL, The Story of Philosophy New York.

30. DURANT WILL, The Renaisance New York.

31. EBY F. The Development of Modern Education. New York.

32. E NAN. IBNE Khuldun Life & Work.

33. REHMAN F. New Education in the Making of Pakistan. London.

34. GRAVES. F.P. A History of Western Education. New York.

35. GREEN J.W. Life & Work of Pestalozzi London.

36. GRAVES F.P. History of Education in Modern Times. New York.

37. IKRAM S.M. Cultural Heritage of Pakistan. O U. P.

38. JOSEPH H.W.B. Knowledge & The Good in Plato's Republic O U P London.

39. JAMILA KHAN. Heritage of Islam. Karachi.

40. JAFAR S.M. Educastion in Muslim India.

41. LODGE R.C. Plato's Theory of Education. London.

SELECT BIBLIOGARPHY

1. ADAMSON J.E. The Theory of Education in Plato's Republic London.

2. ARCHAMBAULT R.D. Phlosophical Analysis & Education London.

3. ADAMS JOHN. The Harbartian Psychology applied to Education Boston.

4. AMIR ALI SYED The Spirit of Islam. London.

5. ABDULLAH ENAN Life & Work of Ibne Khuldun Lahore.

6. ARISTOTILE Basic work of Anstotle New York.

7. ATKINSON The Story of Education.

8. A.G.GOOD A History of Western Education.

9. ARNOLD.T. The Legacy of Islam.

10. BURNET, JOHN, Aristotle on Education. Harbard Press, Cambridge.

11. BOYD WILLIAM The Educational Theory of J.J. Rousseau. Longman & Co.

12. BOYD WILLIAM The History of Western Education. Macmilla New York.

13. BOYD WILLIAM PLATO'S Republic for Today Hanman London.

14. BOYD WILLIAM Emile for Today Hanman London.

15. BUTTS R.F. Cultural History of Western Education. London.

16. BURRETS J. Aristotle on Education. Harvard.

17. BARNES. H.E. An Intellectual & Cultural History of The Western World. New York.

اسکولوں میں رہ نمائی و مشاورت
مؤلف: پروفیسر علی اوسط صدیقی

بی ایڈ کے نصاب میں تشخیص قدر اور رہ نمائی کا لازمی پرچہ شامل کیا گیا ہے اور یہ کتاب نصاب کے عین مطابق تحریر کی گئی ہے۔ غیر ملکی زبان میں اس عنوان پر اچھی کتابیں موجود ہیں۔ لیکن زبان کے فرق کی وجہ سے طلبہ ان سے بہتر طور پر استفادہ نہیں کر سکتے۔ زیرِ نظر کتاب میں طلبہ کی دشواریوں کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ طلبہ کے علاوہ عام قارئین بھی اس کتاب سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

اسلامیات اور اس کے تدریسی خاکے
مؤلف: علی اوسط صدیقی

یہ کتاب گزشتہ کئی سالوں سے بی ایڈ کے طلبہ و طالبات کے لئے ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے داخلِ نصاب ہے تاکہ طلبا اسلامیات کے تدریسی طریقوں سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ اس قدر بنیادی معلومات ضرور حاصل کر لیں کہ وہ ثانوی مدارس میں تدریسی دنیا میں قدم رکھیں تو نئی نسل کی درسی ضروریات کی تکمیل کے ساتھ ساتھ ان کی عام دینی معلومات میں اضافہ کر سکیں۔

اسلامی نظامِ تعلیم
مؤلف: علی اوسط صدیقی

اس کتاب کو بی ایڈ کے نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں تعلیم سے متعلق اسلام کے ہمہ گیر اور ہمہ جہتی تصورات و نظریات نیز عہدِ رسالتؐ و زمانہ مابعد اس میں شامل کیا گیا ہے۔ اس قدر متنوع موضوعات پر سیر حاصل معلومات کا کسی ایک کتاب میں یکجا ملنا ممکن نہیں۔

علم التعلیم
مؤلف: پروفیسر ظفر حسین خاں

علم التعلیم اپنی نوعیت کی قومی زبان میں منفرد تصنیف ہے جس میں ایم۔ اے (ایجوکیشن)، بی۔ ایڈ اور ایم۔ ایڈ کے مشترک اور مشکل ترین عنوانات کو نہایت خوبی اختصار اور ناقدانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کتاب ہٰذا تعلیم، فلسفہ تعلیم، نصابِ تعلیم، تاریخ تعلیم، مسائل تعلیم اور تناظر تعلیم کے موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ جس سے کتاب کی افادیت اور اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس سے کتاب سے طلبہ و طالبات کے علاوہ عام تشنگانِ علوم بھی استفادہ کر سکیں گے۔

تنظیم مدرسہ
مؤلف: فدا حسین کھوکھر

فاضل مؤلف کو متعلقہ موضوعات پر اتنا عبور حاصل ہے کہ وہ دقیق ترین مسئلہ کو اپنے الفاظ سے قابلِ ہضم کر دیتے ہیں۔ اس کتاب کو زیرِ تربیت اساتذہ کی ضروریات کے مطابق ترتیب کیا گیا ہے اور یہ ملک کے جملہ تعلیمی اداروں کے عین مطابق ہے۔

تعلیمی رہ نمائی و جائزہ
مؤلف: فدا حسین کھوکھر

اس میں تعلیمی رہ نمائی و جائزے کے بارے میں بنیادی قسم کی معلومات فراہم کی گئی ہیں اور اس کتاب کو زیرِ تربیت اساتذہ کی ضروریات کے عین مطابق بنایا گیا ہے۔ یہ کتاب بی ایڈ اور ایم ایڈ کے سلیبس کے عین مطابق تیار کی گئی ہے اور جملہ موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ اور اسے عام قارئین کے لئے بھی دل چسپ بنایا گیا ہے

تعلیمی پیمائش و تشخیص قدر
مؤلف: پروفیسر علی اوسط صدیقی

بی ایڈ کے نصاب میں تشخیص قدر اور رہ نمائی کا لازمی پرچہ شامل کیا گیا ہے اور یہ کتاب نصاب کے عین مطابق تحریر کی گئی ہے۔ غیر ملکی زبان میں اس عنوان پر اچھی کتابیں موجود ہیں، لیکن زبان کے فرق کی وجہ سے طلبہ ان سے بہتر طور پر استفادہ نہیں کر سکتے۔ زیرِ نظر کتاب میں طلبہ کی دشواریوں کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ طلبہ کے علاوہ عام قارئین بھی اس کتاب سے مستفید ہو سکتے ہیں۔